

علوم القرآن

اور اصول تفسیر

تالیف

شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی - ۱۴

باہتمام : محمد قاسم گلگتی
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق مئی ۲۰۰۸ء
مطبع : زم زم پرنٹنگ پریس
ناشر : مکتبہ دارالعلوم کراچی
فون : 5042280 - 5049455
ای میل : mdukhi@cyber.net.pk

ملنے کے پتے

- ✽ = مکتبہ دارالعلوم کراچی
- ✽ = ادارۃ المعارف احاطہ دارالعلوم کراچی۔
- ✽ = ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
- ✽ = دارالاشاعت اردو بازار کراچی
- ✽ = بیت الکتاب گلش اقبال نزد اشرف المدارس کراچی

انتساب

اپنے والد ماجد
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

کی خدمت میں

جن کی ذات میں احقر کے لئے ایک مثالی، بلکہ بے مثال باپ، ایک
ہمہ جہت استاذ اور ایک باریک بین مربی و شیخ کی شفقتیں جمع ہیں،

اور

رُوسے زمین پر احقر کی محبت ہی نہیں، عقیدت کا بھی ان سے بڑا
مرکز کوئی نہیں، حفظہ اللہ تعالیٰ،

یہ حقیر کا دشمن کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے نام نامی سے منسوب کر کے
عوض گزار ہوں کہ

اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار توام

محمد تقی عثمانی

فہرست مضامین علوم القرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲	حضور پر نزول وحی کے طریقے	۱۱	تقریظ: حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ
۳۳	(۱) صلصلة الجرس	۱۳	پیش لفظ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ
۳۶	(۲) تمثیل ملک	۱۴	حرف آغاز: مولف
۳۸	(۳) فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا	۲۱	حصہ اول القرآن الکریم
۳۸	(۴) رؤیائے صادقہ	۲۳	باب اول، تعارف،
۳۸	(۵) کلام الہی	۳۹	قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ
۳۹	(۶) نفث فی الردع	۳۵	وحی اور اس کی حقیقت
۳۹	وحی اور کشف والہام	۳۸	وحی کی ضرورت
۴۰	وحی مستلوا اور غیر مستلوا	۳۰	وحی کا مفہوم
۴۳	وحی پر عقلی شبہات	۳۱	وحی کی تعلیمات
۴۸	کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟	۳۱	وحی کی اقسام
۵۳	باب دوم، تاریخ نزول قرآن	۳۱	(۱) وحی قلبی
۵۳	پہلا نزول	۳۲	(۲) کلام الہی
۵۵	دوسرا نزول	۳۲	(۳) وحی منلی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۶	”سبعۃ احرف“ کی رائج ترین تشریح	۵۶	سب سے پہلی نازل ہونیوالی آیت
۱۱۰	اس قول کی وجوہ ترجیح	۵۹	مکئی اور مدنی آیات
	اس قول پر وارد ہونیوالے اعتراضات	۶۲	مکئی اور مدنی آیتوں کی خصوصیات
۱۱۲	اور ان کا جواب،	۶۳	نزول کا وقت اور مقام
۱۱۳	سات حروف کے ذریعہ کیا آسانی پیدا ہوئی؟	۶۵	(۱) ہناری
	حروف سبعہ اب بھی محفوظ ہیں یا	”	(۲) لیلیٰ
۱۱۸	متروک ہو گئے؟	”	(۳) صیفی
	حافظ ابن جریر کا نظریہ اور اس کی	”	(۴) ہشتائی
۱۱۹	قباحتیں،	”	(۵) فراشی
	امام طحاوی کا قول	۶۶	(۶) نومی
۱۲۳	سب سے بہتر قول	”	(۷) سادی
۱۲۴	اس قول کے قائلین	”	(۸) فضائی
۱۲۵	اس قول کے دلائل	۶۷	قرآن کریم کا تدریجی نزول
۱۳۶	اس قول پر وارد ہونیوالے سوالات	۶۹	ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب
۱۴۰	اور ان کے جواب	۷۲	اسباب نزول
	لخت قریش پر لکھنے کا مطلب	۷۳	شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد
۱۴۲	مراد الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ	۷۹	اسباب نزول اور شاہ ولی اللہؒ
۱۴۶	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کا مصحف	۸۲	سبب نزول اور احکام کا عموم و خصوص
۱۴۹	نتائج بحث	۸۶	سبب نزول اور اختلاف روایات
۱۵۵	سات حروف کے بار میں اختلاف آراء کی	۹۳	تکرار نزول اور اس کی حقیقت
۱۵۶	حقیقت، ایک غلط فہمی کا ازالہ	۹۷	باب سوم، قرآن کے سات حروف
		۹۸	حروف سبعہ کا مفہوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹۵	حرکات	۱۵۹	باب چہارم، نسخ و منسوخ
۱۹۶	احزاب یا منزلیں	"	نسخ کی حقیقت
"	اجزاء یا پارے	"	نسخ کا عقلی و نقلی ثبوت
۱۹۷	اُخماس اور اُعشار	"	نسخ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین
"	رکوع	۱۶۱	کی اصطلاحات کا فرق،
۱۹۸	رموز و اوقات	۱۶۳	قرآن کریم میں نسخ کی بحث
۲۰۱	قرآن کریم کی طباعت، پانچواں مرحلہ	۱۶۷	منسوخ آیات قرآنی کی تعداد
۲۰۲	قراآت اور ان کی تدوین	۱۷۲	نتیجہ بحث
۲۱۱	باب ششم	۱۷۳	باب پنجم، تاریخ حفاظت قرآن
"	حفاظت قرآن متعلق شبہات	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
"	اور ان کا جواب	"	میں حفاظت قرآن،
۲۱۰	ابتدائی زمانہ کی آیات محفوظ نہیں رہیں؛ پہلا اعتراض	۱۷۷	عہد رسالت میں کتابت قرآن،
۲۱۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ایک آیت یاد نہیں تھی؛ دوسرا اعتراض	۱۸۱	پہلا مرحلہ
۲۱۶	سورۃ نسا میں سورۃ الفہم کا حوالہ؛ تیسرا اعتراض	۱۸۷	حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جمع قرآن،
۲۱۹	امام بخاریؒ پر مار گولیوتھ کا ایک بہتان؛ چوتھا اعتراض	۱۹۳	دوسرا مرحلہ
۲۲۰	حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہو گئیں تھیں، پانچواں اعتراض	"	حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن،
			تیسرا مرحلہ
			تہبیل تلاوت کے افرامات،
			چوتھا مرحلہ
			نقطہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۸	قرآن کریم کی پیشگی خبریں؛	۲۲۱	عہد رسالت میں حفاظ کی تعداد
"	ردیوں کی فتح		چھٹا اعتراض
۲۷۰	فتح مکہ کی خبر	۲۲۳	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوذتین
۲۷۱	یہودیوں کی تمنائے موت		ساتواں اعتراض
۲۷۲	قرآن کریم کی حفاظت	۲۲۷	خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت
۲۷۵	قرآن کریم کے انکشافات		مستشرقین کا آٹھواں اعتراض
۲۷۷	حقانیت قرآن اور معرب کے	۲۳۱	خلافت صدیقی تک پورا قرآن لکھا نہیں
	غیر مسلم مصنفین،		گیا تھا؛ نواں اعتراض
۲۸۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل کتاب	۲۳۳	مختلف قراءتیں کس طرح وجود میں آئیں
۲۸۷	قرآن کریم پر چند اعتراضات		دسواں شبہ
"	حضرت مریمؑ کے والد کا نام	۲۳۶	رآن کریم کی شاذ قراءتیں اور ان کی
۲۸۹	فرعون کا وزیر ہامان		حقیقت؛ گیارہواں شبہ
۲۹۳	باب ہفتم، مضامین قرآن	۲۴۱	باب ہفتم، حقانیت قرآن
"	عقائد (ایجابی پہلو)	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت
۲۹۵	نقلی دلائل	۲۴۲	کتب مقدسہ میں آپ کی بشارتیں،
۲۹۶	منطقی دلائل	۲۴۸	اعجاز و قرآن
۲۹۷	قیاس استثنائی	۲۵۳	قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات،
۲۹۸	السبر و التسمیم	"	الفاظ کا اعجاز
۲۹۹	تسلیم	۲۵۹	ترکیب کا اعجاز
"	انتقال	"	اسلوب کا اعجاز
۳۰۲	مشاہداتی دلائل	۲۶۵	نظم کا اعجاز

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۴	دوسرا مآخذ؛ احادیث نبویؐ	۳۰۳	تجرباتی دلائل
۳۳۸	تیسرا مآخذ؛ اقوال صحابہؓ	۳۰۴	عقائد (سبلی پہلو)
۳۴۰	چوتھا مآخذ؛ تابعین کے اقوال	۳۰۵	بہت پرست مشرکین
۳۴۱	پانچواں مآخذ؛ لغت عرب	۳۰۸	یہودی
۳۴۳	چھٹا مآخذ؛ عقل سلیم	۳۱۰	نصارئی
۳۴۵	باب دوم	۳۱۱	منافقین
۳۴۵	تفسیر کے ناقابل اعتبار مآخذ	۳۱۳	احکام
۳۴۵	۱۔ اسرائیلی روایات	۳۱۵	شان نزول
۳۴۸	کعب الاحبار کون تھے؟	۳۱۶	قصص
۳۵۰	وہب بن منبہ	۳۱۸	ماضی کے واقعات
۳۵۱	حضرت عابد بن عمروؓ	۳۱۸	واقعات میں تکراریوں پر؟
۳۵۳	۲۔ صوفیائے کرام کی تفسیریں	۳۲۱	مستقبل کے واقعات
۳۵۶	۳۔ تفسیر بالراتے	۳۲۳	امثال
۳۵۹	تفسیر میں گمراہی کے اسباب	۳۲۳	حصہ دوم علم تفسیر
۳۶۳	۱۔ پہلا سبب؛ نااہلیت	۳۲۳	باب اول
۳۶۴	چند غلط فہمیاں	۳۲۳	علم تفسیر اور اس کے مآخذ
۳۶۴	علماء اور اجارہ داری	۳۲۴	تعارف
۳۶۵	علماء اور پاپائیت	۳۲۵	تفسیر اور تاویل
۳۷۱	۲۔ قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانا،	۳۲۶	تفسیر کے مآخذ
۳۷۲	۳۔ زمانہ کے افکار سے مرعوبیت	۳۳۸	پہلا مآخذ؛ خود قرآن کریم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴۳	۶۔ زمانہ کی تبدیلی اور احکام شرعیہ	۳۷۶	معجزات کا مسئلہ
۳۴۶	۷۔ زمانہ کی تبدیلی کا مطلب	۳۸۴	خلاف عقل اور ادراک عقل
۳۴۷	۸۔ عقل کا صحیح دائرہ کار	۳۸۶	۳۔ قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا
۳۵۳	باب چہارم	۳۹۷	باب سوم
۳۵۳	قرونِ اولیٰ کے بعض مفسرین	۳۹۷	تفسیر کے چند ضروری مہول
۳۵۶	حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳۹۷	۱۔ قرآن کریم اور مجاز
۳۵۸	گولڈزیہر کا ایک مغالطہ	۳۹۷	۲۔ قرآن کریم اور عقلی دلائل
۳۵۸	مروجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حقیقت	۳۹۷	۱۔ قطعی عقلی دلائل
۳۵۹	حضرت علیؓ	۳۹۷	۲۔ ظنی عقلی دلائل
۳۶۰	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	۳۹۷	۳۔ وہی عقلی دلائل
۳۶۱	حضرت ابی بن کعبؓ	۳۹۷	۱۔ قطعی نقلی دلائل
۳۶۱	صحاحِ شریف کے بعد	۳۹۷	۲۔ ظنی نقلی دلائل
۳۶۲	۱۔ حضرت مجاہدؓ	۳۹۷	۳۔ وہی نقلی دلائل
۳۶۳	۲۔ حضرت سعید بن جبیرؓ	۳۹۷	۳۔ احکام شرعیہ اور عقل
۳۶۳	۳۔ حضرت عکرمہؓ	۳۹۷	۱۔ آزاد عقل اور ہدایت و گمراہی
۳۶۴	عکرمہؓ پر اعتراضات کی حقیقت	۳۹۷	۲۔ اسلامی احکام کی حکمتیں
۳۶۷	گولڈزیہر کا ایک مغالطہ	۳۹۷	اور دین میں اُن کا قیام
۳۶۹	۴۔ حضرت طاؤسؓ	۳۹۷	۳۔ حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا
۳۷۰	۵۔ حضرت عطاء بن ابی رباحؓ	۳۹۷	۴۔ احکام شریعت کا اصل مقصد
۳۷۱	۶۔ حضرت سعید بن المسیبؓ	۳۹۷	اتباع کا امتحان ہے،
۳۷۲	۷۔ محمد بن سیرینؓ	۳۹۷	۵۔ قرآن و سنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸۵	قرون اولیٰ کے ضعف یا باختلاف فیہ	۴۷۴	۸ - حضرت زید بن اسلمؓ
"	سُدی کبیر	۴۷۵	۹ - حضرت ابو العالیہؓ
۴۸۸	سُدی صغیر	۴۷۶	۱۰ - حضرت عروہ بن الزبیرؓ
۴۸۹	مقاتل	"	۱۱ - حضرت حسن بصریؓ
۴۹۳	ربیع بن انسؓ	۴۷۷	۱۲ - حضرت قتادہؓ
۴۹۴	عطیہ العوفی	۴۷۸	۱۳ - محمد بن کعب لہثریؓ
۴۹۶	عبد الرحمن بن زید بن اسلم	۴۷۹	۱۴ - حضرت علقمہؓ
۴۹۷	کلبی	"	۱۵ - حضرت اسودؓ
۵۰۰	متاخرین کی چند تفسیروں	۴۸۰	۱۶ - مرۃ الہمدانیؓ
۵۰۱	۱ - تفسیر ابن کثیر	۴۸۱	۱۷ - حضرت نافعؓ
۵۰۲	۲ - تفسیر کبیر	۴۸۲	۱۸ - حضرت شعبیؓ
۵۰۵	۳ - تفسیر ابی السعود	"	۱۹ - حضرت ابن ابی ملیکہؓ
"	۴ - تفسیر لہثریؓ	۴۸۳	۲۰ - حضرت ابن جریرؓ
"	۵ - روح المعانی	۴۸۴	۲۱ - حضرت ضحاکؓ
۵۰۷	بیان القرآن ، معارف القرآن		

تقریظ

از شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد

خاتم النبیین وآلہ وصحبہ اجمعین،

امّا بعد، قرآن کریم کے علوم پر عربی زبان میں عمدہ سے عمدہ قدما و متاخرین کی کتابیں آرہی ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں، اور زیادہ تر وہ کتابیں قدیم طرز، قدیم حاجات اور قدیم ذوق کے پیش نظر تصنیف کی گئی ہیں اور بلاشبہ ان کتابوں نے اس وقت کے قاضیوں کو بہت خوبی سے پیش کیا، اور امت کو نفع پہنچایا، دہلی میں جب سر سید احمد خاں کی تفسیر وجود میں آئی، اور ان کی تصانیف شائع ہوئی ہیں، اس تفسیر سے جو امت کے عقائد پر زبرد پڑی، اور جدید نسل کے شیخ و غیر واقعی نظریات پیش کئے گئے، نبوت کو کسی کہا گیا، معجزات سے جنت و دوزخ، ملائکہ و شیاطین کے وجود سے انکار کیا گیا، اور قرآنی صداقت کے لئے جدید اصول تجویز کئے گئے، حق تعالیٰ نے مولانا عبدالحق حقانی دہلوی دیوبندی کو کھڑا کیا، فتح المنان کے نام سے عمدہ تفسیر لکھی، اور "البيان في علوم القرآن" کے نام سے بینظیر مقدمہ لکھا، اور تفسیر کی پہلی جلد میں اس مقدمہ کی تلخیص کی گئی، ہدایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کیا، لیکن عرصہ سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کہ جدید نسل کی رہنمائی کے لئے جدید انداز پر ایسی کتاب اور قرآنی حقائق کو دانشگاہ کرنے کے لئے ایک مبسوط مفصل مقدمہ لکھا جائے، جس میں وحی اور نزول قرآن، ترتیب نزول، قراءات سبعہ، اعجاز قرآن وغیرہ وغیرہ، حقائق قرآنی کے اباحت اس طرح

بصیرت افروز انداز سے آجائیں، جس میں مستشرقین کے ادہام و دسوس اور خرافات یا معاندانہ تسکوک و شبہات کا تشفی کن مواد آجائے، اور مستشرقین کی قیادت میں مستغربین (مغرب زدہ طبقہ) کے درخواست کا بھی جواب آجائے، الحمد للہ کہ اس عظیم اور اہم ترین مقصد کو پہلے برادر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی خلیفہ الرشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت حیات المبارکہ نے بہت خوبی کے ساتھ معارف القرآن کا مبسوط مقدمہ تالیف کر کے اس دینی و علمی ضرورت کو پورا کر دیا، اور امت پر احسان کیا، حق تعالیٰ اُن کے علم، ان کے قلم میں برکتیں عطا فرمائیں، اور مزید توفیقات اہمیکے سرفراز فرمائیں،

مقدمہ کا کچھ حصہ تو مسلسل دیکھا، کچھ جستہ جستم مقامات سے دیکھا، الحمد للہ کہ بہت خوش ہوا، اور دل سے دعا، نکلی، وفقنا اللہ وایاہ لخدمۃ دینہ ابتغاء لوجه الکَرِیم، وصلى الله على سيدنا محمد سيد العالمين وخاتم النبیین وعلى الہ واصحابہ وعلیٰ امتہ اجمعین،

محمد یوسف بنوری عفی عنہ
مدتہ سے عین اسلام کو پٹی؛

جمعیات
۱۲ جمادی الاول ۱۳۹۶ھ

پیش لفظ

ان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم
 اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ”معارف القرآن“ کی صورت میں احقر کو
 قرآن کریم کی ایک خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اور یہ اطلاعات باعثِ شکر و مسرت
 ہوتی رہتی ہیں کہ بفضلہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے، جب اس تفسیر
 کی جلد اول نظر ثانی اور ترمیم کے بعد دوبارہ شائع ہونے لگی تو احقر کی خواہش
 ہوئی کہ اس کے شروع میں ”علوم قرآن“ کی معلومات پر مشتمل ایک مقدمہ شامل
 کر دیا جائے، مجھے اپنے امراض اور ضعف کی بنا پر خود اس کام کا تحمل نہ رہا تھا، اس
 لئے برخوردار عزیز محمد تقی سلمہ کو اس مقدمہ کی تالیف سپرد کی، انھوں نے ایک مختصر
 مقدمہ لکھ کر تو معارف القرآن جلد اول کے ساتھ لگا دیا، لیکن اسی دوران انھوں
 نے اسی موضوع پر ایک مفصل اور نہایت مفید کتاب کی بنیاد بھی ڈال دی، جو
 بفضلہ تعالیٰ اب پایہ تکمیل تک پہنچ کر ”علوم القرآن“ کے نام سے شائع ہو رہی ہے،
 ”علوم القرآن“ ایک وسیع علم ہے جس پر عربی میں ضخیم کتابیں موجود ہیں اور
 اردو میں بھی کئی کتابیں آچکی ہیں، لیکن اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت
 تھی جس میں متعلقہ مباحث کو پوری تحقیق کے ساتھ حل بھی کیا گیا ہو، اور عہدِ حاضر
 میں مستشرقین اور متجددین نے جو شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں ان کا علمی جواب
 بھی دیا گیا ہو، اس کے علاوہ ہمارے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے تفسیر کی اہلیت
 کے بغیر قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھ دی ہیں ان میں تفسیر قرآن کے مسلم اصولوں کو

جس طرح یا مال کیا ہے اُس کے پیش نظریہ بھی ضروری تھا کہ تفسیر کے اصولوں کی وضاحت کی جائے، اور اُن کو نظر انداز کرنے سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کی طرف توجہ دلائی جائے،

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کتاب میں وقت کی اس اہم ضرورت کو میرے دہم و گمان سے بھی زیادہ اچھی طرح پورا کیا گیا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اگر اس کتاب کو حق طلبی اور انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو انشاء اللہ اس سے علم تفسیر میں بصیرت بھی حاصل ہوگی، اور اس راہ میں جو غلط فہمیاں، شکوک و شبہات اور گمراہیاں، مستشرقین کی تبلیغات اور عام لوگوں کی ناواقفیت سے عموماً ذہنوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بھی تشفی بخش حل مل جائے گا،

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کو برخور دار عزیز کے سپرد کرنے کی پہلی وجہ تو میرے مسلسل امراض اور روز افزوں ضعف تھا، اور یہ سمجھ کر یہ اقدام کیا تھا، کہ اگر پُر تنواند پر تمام کتب کا مصداق ہو تو ہو ہی جائے گا، لیکن کتاب کی تصنیف سامنے آئی، میں اگرچہ ضعف بصارت کے سبب اس کو خود نہیں دیکھ سکا، مگر اس کے بہت سے مباحث کو پڑھ کر سنا تو میری مسرت کی حد نہ رہی، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کیونکہ یہ مکمل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا، جس کی دو وجہ ظاہر ہیں، اول تو یہ کہ عزیز موصوف نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق و تنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضامین لئے گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے بقید ابواب و صفحات حاشیہ میں درج ہیں، انہی پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہو سکتا ہے،

اور دوسری بات اس سے بھی زیادہ ظاہر یہ ہے کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر مستشرقین یورپ کی اُن کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا جن میں انھوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تبلیغات سے کام

والله المستعان وعليه التكلان

دارالعلوم کراچی ۱۴
یکم جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرفِ آغاز

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

قرآن کریم پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دولت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، یہ وہ نسخہ شفا ہے جس کی تلاوت جس کا دیکھنا، جس کا سننا سنانا، جس کا سیکھنا سکھانا، جس پر عمل کرنا، اور جس کی کسی بھی حیثیت سے نشر و اشاعت کی خدمت کرنا دنیا اور آخرت دونوں کی عظیم سعادت ہے، صبحِ مسلم وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم صفہ میں بیٹھے تھے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا، تم میں سے کس کو یہ بات پسند ہے کہ وہ روزانہ صبح کو ٹھکان یا عقیق (کے بازار) میں جایا کرے، اور ہر روز دو بہترین قسم کی اونٹنیاں کسی گناہ یا قطع رحمی کا اونکاب کتے بغیر کھڑا لایا کرے؟ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کو تو ہم میں ہر ایک پسند کرے گا، آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص روزانہ مسجد میں جا کر دو آیتیں سیکھ لیا کرے یا پڑھ لیا کرے تو یہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، اور تین آیتیں سیکھے تو تین اونٹنیوں سے اور چار

سیکھ تو وہ چار سے بہتر ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کا علم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کے جو فضائل بیان فرماتے، اور اُمت کو جس طرح اس کی ترغیب دی، مذکورہ بالا حدیث اُس کی صرف ایک مثال ہی، اور حدیث کے مجموعے اس قسم کی احادیث سے بھرے پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُمتِ محمدیہؐ رعلی صاجہا السلام نے قرآن کریم اور اُس کے علوم کی ایسے ایسے پہلوؤں سے خدمت کی ہے، اور اس کے الفاظ و معانی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسی بے مثال کادشیں کی ہیں کہ اُن کی تفصیلات کو دیکھ کر عقل مبہوت رہ جاتی ہے،

قرآن کریم کے معانی مطالب کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس اُمت نے کتابِ الہی کے الفاظ، اس کی حرکات و سکنات اور اس کے حروف کو ٹھیک ٹھیک زبان سے ادا کرنے کی غرض سے ایسے ایسے علوم و فنون کی بنیاد ڈالی ہے جن کی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی زبان میں نہیں ملتی، ایک تجوید و قرأت ہی کے علم کو لے لیجئے، تو اس فن کی تفصیلات اور اس کی بارکیوں کی تشریح کے لئے اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اُن سے ایک مستقل کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے،

غرض جن مختلف جہتوں اور گوناگوں پہلوؤں سے قرآن کریم کی خدمت کی گئی ہے اُنہی میں سے ایک خاص رُخ کی خدمت وہ کتابیں ہیں جو ”علوم القرآن“ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں،

”علوم القرآن“ ایک وسیع و عریض علم ہے، اور اس میں علمِ تفسیر کے مبادی اور اصول واضح کئے جاتے ہیں، قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوا تھا؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب کس ترتیب سے نازل ہوئی؟ کتنے عرصہ میں اس کا نزول مکمل ہوا؟ مکی اور مدنی سورتوں کا کیا مطلب ہے؟ شانِ نزول کسے کہتے ہیں؟ تفسیرِ قرآن میں اس کا کیا مقام ہے؟ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ ہو یا نہیں؟ قرآن کے مختلف حروف اور قراءتوں کا کیا مطلب ہے؟ قرآن کریم کس قسم کے

کے مضامین پر مشتمل ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو کس طرح محفوظ رکھا ہے؟ اور اس کی کتابت و طباعت کتنے مراحل سے گزری ہے؟ قرآن کریم کی تفسیر کے کیا اصول اور آداب ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور اس راہ میں کونسی غلطیاں انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالات کا مفصل جواب ”علوم القرآن“ میں دیا جاتا ہے،

عربی زبان میں اس موضوع پر علامہ زرکشیؒ کی ”البرہان فی علوم القرآن“ (چار جلدوں میں)، علامہ سیوطیؒ کی ”الاتقان“ (دو جلدوں میں) شیخ زرقانیؒ کی ”منہل البحر فان“ (دو جلدوں میں) آج بھی اس علم کی معروف و متداول کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں آئی ہیں، جن میں علامہ عبدالحی حقانیؒ کی ”البیان فی علوم القرآن“ سب سے زیادہ جامع اور ممتاز ہے،

لیکن زمانہ کے لحاظ سے ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے یہ ضرورت تو عہد سے محسوس ہوتی تھی کہ عہد حاضر میں معاصر بی افکار کے زیر اثر ان موضوعات پر جو نئی سوالات پیدا ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر کوئی نئی کتاب لکھی جائے، تاہم یہ تصور دُور دور نہ تھا کہ اس ضرورت کی تکمیل میں مجھ ناچیز کا بھی کوئی حصہ لگ سکے گا،

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت مقدر میں تھی، اور اس کے حصول کی تقریب یہ ہوئی کہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے اردو زبان میں تفسیر ”معارف القرآن“ تالیف فرمائی، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اور کسی جھجک کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلف صالحین کے طرز کے مطابق عہد حاضر کی بے نظیر اردو تفسیر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مقبولیت بھی بجد عطا فرمائی، اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو حضرت والد صاحب مدظلہم نے احقر کو حکم دیا کہ اس کے شروع میں ”علوم القرآن“ کی ضروری معلومات پر مشتمل

ایک مختصر مقدمہ تحریر کروں،

میں نے تعمیل حکم کے لئے یہ مقدمہ لکھنا شروع کیا، تو وہ بُرائی عواہش اُبھر آئی، اور اختصار کی کوشش کے باوجود یہ مقدمہ طویل ہوتا گیا، جب مسودے کے تقریباً دو سو صفحات لکھ چکا تھا، اور بہت سے ضروری موضوعات ابھی باقی تھے تو خیال آیا کہ اتنا طویل مقدمہ تفسیر کے شروع میں موزوں نہیں ہوگا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایما پر میں نے تفسیر کے مقدمہ کے لئے تو اختصار کے ساتھ کچھ ضروری معلومات الگ جمع کر دیں جو تفسیر کے شروع میں بطور مقدمہ شائع ہو گئیں، اور اس مفصل مقدمہ کو مستقل تصنیف کی صورت دیدی، اپنے مشاغل اور عوارض کی وجہ سے اس کتاب کی تکمیل میں خاصی دیر لگ گئی، تاہم یہ اللہ تعالیٰ کا انعام و کرم ہے کہ جتنے ضروری مباحث میں اس کتاب میں لانا چاہتا تھا وہ اس میں کم و بیش جمع ہو گئے ہیں،

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ”علوم القرآن“ کے موضوع پر عہدِ حاضر کو جس نئی تصنیف کی ضرورت تھی وہ اس کتاب نے ٹھیک ٹھیک پوری کر دی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس میں موضوع سے متعلق عہدِ حاضر کی ضروریات کا کافی سامان مل جائیگا، احقر نے اس میں ”علوم القرآن“ کے اُن مشہور مسائل کی تحقیق بھی یکجا کرنیکی کوشش کی ہے جن کی پوری تفصیل کیلئے بہت سی کتابوں کی مراجعت کرنی پڑتی تھی، اور بعض نئے مباحث بھی درج کر دیئے ہیں، اگر وہ اہل نظر کے نزدیک کافی اور اطمینان بخش ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، ورنہ کم از کم ان کی داغ بیل تو ڈال دی گئی ہے، اور آئندہ دوسرا اہل علم و فکر حضرات اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں، یہ کتاب اگر فہم قرآن کے سلسلہ میں کسی صاحب کے کچھ کام آسکے تو احقر کو اپنی ناچیز محنت کا پورا صلہ مل جائیگا، قارئین سے اس دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، اور یہ احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو، آمین، وما توفیقی الا باللہ العلیٰ العظیم،

احقر محمد تقی عثمانی

خادم طلبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

القرآن الکریم

دجی
نزولِ قرآن
ناسخ و منسوخ
حفاظتِ قرآن
حقیقتِ قرآن
مضامینِ قرآن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

أَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا
وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَاصْغَابِهِ أَجْمَعِينَ وَعَلَى كُلِّ
مَنِ اتَّبَعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ،
اللَّهُمَّ أَرِنِي الْحَقَّ حَقًّا وَأَرِنِي قُبْنِي إِتْبَاعَهُ وَأَرِنِي الْبَاطِلَ
بَاطِلًا وَأَرِنِي رُفْقِي إِجْتِنَابَهُ -
رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَبِّعْ بِالْخَيْرِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ،

احقر محمد تقي عثمانى عفى عنه
يحيى رمضان المبارك ١٤٩٢ هـ

تعارف

قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ | علامہ ابوالمعالیؒ نے قرآن کریم کے پچپن نام شمار کئے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کی تعداد نوٹنے سے بھی متجاوز بنائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی صفات مثلاً ”مجید“، ”کریم“، ”حکیم“ وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہنچا دی ہے، ورنہ صحیح معنی میں قرآن کریم کے نام کل پانچ ہیں: الفرقان، الفرقان، الذکر، الکتاب، اور التّنزیل، خود قرآن کریم نے اپنے لئے یہ پانچوں الفاظ اسم علم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نام ”قرآن“ ہے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اَلْقُرْآن

۱۔ ابوالمعالی، کنیت، عزیز بن عبد الملک نام اور شیعہ لقب ہی پانچویں صدی ہجری کے شافعی عالم ہیں ان کی کتاب ”البرہان فی مشکلات القرآن“ کے علامہ زرکشی اور علامہ سیوطیؒ نے بکثرت حوالے دیئے ہیں، ۲۹۴ھ میں وفات پائی، (ابن خلکانؒ وفيات الاعیان، ص ۳۱۸ ج ۱)

۳۔ دیکھئے السیوطیؒ: ”الاتقان فی علوم القرآن“ ص ۵۱ ج ۱ مطبعة حجازی بالقاہرہ ۳۶۸ھ، ۴۔ الزرقانیؒ: مناهل العرفان ص ۸ جلد اول، مطبعة عینی البابی الحلبی ۳۷۸ھ،

۵۔ الفرقان کے لئے دیکھئے سورۃ آل عمران آیت ۷۵ اور الذکر کیلئے آل عمران: ۵۸ والحجر: ۶ و ص وغیرہ اور الکتاب کیلئے بقرہ: ۱۲۳ و ۸۹ و کہف: وغیرہ اور التّنزیل کیلئے یس: ۵ و اقصہ: ۸۰ والحاقہ: ۶۹

مقامات پر اپنے کلام کو اسی نام سے یاد کیا جئے،

”قُرْآن“ دراصل قَرَأَ یَقْرَأُ سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ”جمع کرنا، پھر یہ لفظ ”پڑھنے“ کے معنی میں اس لئے استعمال ہونے لگا کہ اس میں حروف اور کلمات کو جمع کیا جاتا ہے، قَرَأَ یَقْرَأُ کا مصدر ”قَرَأَءَ“ کے علاوہ ”قُرْآن“ بھی آتا ہے، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۔ بلاشبہ اس کتاب کا جمع کرنا اور

پڑھنا ہمارے ہی ذمہ ہے۔“

(القیامہ: ۱۷)

پھر عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول (Past participle) کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے، کلام اللہ کو ”قرآن“ اسی معنی میں کہا جاتا ہے، یعنی ”پڑھی ہوئی کتاب“۔

قرآن کی بہت سی وجوہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں، زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کا یہ نام کفارِ عرب کی تردید میں رکھا گیا ہے، وہ کہا کرتے تھے:-

لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ الْغَوَا

”تم اس قرآن کو نہ سناؤ، اور اس کی تلاوت

فیہ، (حتم السجۃ: ۲۶) کے دوران لغو باتیں کیا کرو۔“

ان کفار کے علی الرغم ”قرآن“ نام رکھ کر اشارہ فرما دیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت کو ان اوجھ ہتھکنڈوں سے دبایا نہیں جاسکتا، یہ کتاب پڑھنے کے لئے نازل ہوئی ہے، اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی، چنانچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری

لہ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو علی زادہ الحسنی: فتح الرحمن لطالب آیات القرآن، صفحہ ۳۵۸ و ۳۵۹،

المطبعة الاهلیة بیروت ۱۳۳۳ھ

۱۔ الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۱۱، اصح المطالعیہ کراچی ۱۳۸۸ھ

۲۔ اس لفظ کے اشتقاق میں اور بھی کئی اقوال ہیں، لیکن وہ مختلف سے خالی نہیں، تفصیل کیلئے

ملاحظہ ہو الاتقان، ص ۵۲ ج ۱ و مناهل العرفان، ص ۱ ج ۱،

دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے
 بہر کیف! قرآن کریم کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:-
 ”المنزل علی الرسول المکتوب فی المصاحف المنقول الینا نفعلاً
 متواتراً بلا شبهة“

”اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں
 لکھا گیا، اور آپ سے بغیر کسی شبہ کے تواتر منقول ہے۔“
 یہ تعریف تمام اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں،

وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل
 کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے ”وحی“ کے بارے میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں:
 ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش
 کی ضرورت کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری
 کائنات کو اس کی خدمت میں لگادیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام
 ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک
 ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو
 مد نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو،
 ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو ”علم“ کی ضرورت ہے، اس لئے جب تک اُسے
 یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟
 ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے
 کے لئے استعمال نہیں کر سکتا نیز جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے

کاموں کو پسند اور کُن کو ناپسند فرماتا ہے، اس وقت تک اس کے لئے اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، مُنہ اور ہاتھ پیر، دوسرے عقل، اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعے، اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے،

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم بری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک انسان بیٹھا ہے، مجھے اپنی آنکھ کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان ہے، آنکھ ہی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا رنگ گورا ہے، اس کی پیشانی چوڑی، بال سیاہ، ہونٹ پتلے اور چہرہ کتابی ہے، لیکن اگر یہی باتیں میں اپنے حواس کو معطل کر کے محض عقل سے معلوم کرنا چاہوں، مثلاً آنکھیں بند کر کے یہ چاہوں کہ اس انسان کی رنگت اس کے اعضاء کی صحیح بناوٹ اور اس کے سر یا پا کی ٹھیک تصویر مجھے صرف اپنی عقل کے ذریعے معلوم ہو جائے تو یہ ناممکن ہے،

اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً اسی شخص کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی ماں ضرور ہو، نیز یہ بھی علم ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے، اگرچہ نہ اسکی ماں اُسٹومیر کے سامنے ہے، نہ میں اس کے پیدا کرنے والے کو دیکھ سکتا ہوں، لیکن میری عقل بتا رہی ہو کہ یہ شخص خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا، اب اگر میں یہ علم اپنی عقل کے بجائے اپنی آنکھ سے حاصل کرنا چاہوں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ اس کی تخلیق اور پیدائش کا منظر اب میری آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا،

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کا تعلق ہے وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی شخص کے بارے میں عقل نے یہ تو بتا دیا کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس شخص کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے ذمہ خدا کی طرف سے کیا فرائض ہیں؟ اس کا کونسا کام اللہ کو پسند ہو اور کونسا ناپسند؟ یہ سوالات ایسے ہیں کہ عقل اور حواس مل کر بھی ان کا جواب نہیں دے سکتے، ان سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ نے معترف فرمایا ہے اسی کا نام ”وحی“ ہے،

اس سے واضح ہو گیا کہ ”وحی“ انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوتے، لیکن اُن کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور مذکورہ تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے دینی معتقدات کا علم دینا عقل کے بجائے وحی کا منصب ہو، اور ان کے ادراک کے لئے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں!

لہٰذا یہاں وحی کی ضرورت کی طرف بہت محمل اشارے کئے گئے ہیں، اس موضوع پر مفصل بحث کیلئے تمہیدانی مکتورہ سالمی، ص ۶۸ تا ۷۲ اور رازِ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم کی کتاب علوم القرآن ص ۱۸۳ تا ۱۸۷ مطبوعہ دارالمدرسہ فاروقیہ بہاول پور ۱۳۸۹ھ ملاحظہ فرمائیے،

وحی کا مفہوم

اس تہمید کو ذہن میں رکھ کر ”وحی“ کے مفہوم اور اس کی حقیقت پر غور فرمائیے۔ ”وحی“ اور ”ایحاء“ عربی زبان کے الفاظ ہیں، اور لغت میں اُن کے معنی ہیں ”جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا“ خواہ یہ اشارہ رمز و کنایہ استعمال کر کے کیا جائے، خواہ کوئی بے معنی آواز نکال کر، خواہ کسی عضو کو حرکت دے کر، یا تحریر و نقوش استعمال کر کے، ہر صورت میں لغتاً اس پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں، چنانچہ اسی معنی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بِحَمْدِ اللَّهِ
وَعِشْيَا ه (مریم: ۱۱)

”پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے، اور انھیں اشارہ کیا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو“

پھر ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشارے سے مقصد یہ ہی ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے، اس لئے لفظ ”وحی“ اور ”ایحاء“ دل میں کوئی بات ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ فترآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں مثلاً:-
وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا (النحل: ۶)
”اور آپ کے رب نے شہر کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنائے“
یہاں تک کہ شیاطین دلوں میں جو دوسو سے ڈالتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، ارشاد ہے:-

وَكُنْ لَكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَفْسٍ عَدُوًّا وَشَیَاطِیْنَ اِلَّا نِسَ وَالْجِنِّ يُجِی
بَعْضُهُمْ اِلَىٰ بَعْضٍ ط (الانعام: ۱۱۲)

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کیلئے ایک نہ ایک دشمن ضرور پیدا کیا ہی، جن و انس کے شیاطین (میں سے جو) ایک دوسرے کے دل میں دوسو سے ڈالتے ہیں“

لہ الزبیری، تاج العروس ۳۸۴ ج ۱ دار لبیبہ بتغازی ۱۳۸۵ھ، والراغب: المفردات،

نیز ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ الشَّيَاطِينُ لَبَّوْهُمْ حَتَّىٰ تُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۚ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (الانعام: ۱۲۱)
 اور بلاشبہ شیطان اپنے دوستوں کے دل میں دوسو سے ڈالتے ہیں، تاکہ تمہارے ساتھ
 جھگڑا کریں۔“

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے جو خطاب فرماتے ہیں اس کو بھی ”ایحار“ کہا گیا ہے:-
 اِذْ يُوحِي رَبُّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ اَنۡيۡ مَعَكُمْ (الانفال: ۱۲)
 ”جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
 کسی غیروہی کے دل میں جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس کو بھی اسی لفظ
 سے تعبیر فرمایا گیا ہے:-

وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ اٰمِّمُ مُوسٰى اَنۡ اَرۡضِعۡنِیۡہٗ (القصص: ۷)
 اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو ابھام کیا کہ اس کو دودھ پلاؤ۔“
 لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں، شرعی اصطلاح میں ”وحی“ کی تعریف یہ ہے:-
 کَلَامُ اللّٰہِ الْمُنۡزَلُ عَلٰی نَبِیٍّ مِّنۡ اَنْبِیَآءِہٖ
 ”اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔“

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ ”وحی“ اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا
 ہے کہ اب اس کا استعمال پیغمبر کے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں، حضرت عکرمہ
 انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”وحی“ اور ”انجاء“ دونوں الگ الگ
 لفظ ہیں، اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، ”ایحار“ کا مفہوم عام ہے، اور انبیاء پر وحی
 نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیروہی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اس کے
 مفہوم میں داخل ہے، لہذا یہ لفظ نبی اور غیروہی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے
 برخلاف ”وحی“ صرف اُس ابھام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم

نے لفظ ”نبیاء“ کا استعمال تو انبیاء اور غیر انبیاء دونوں کے لئے کیا ہے، لیکن لفظ ”وحی“ سوائے انبیاء کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔

بہر کیف! ”وحی“ وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچاتا ہے، اور اس رسول کے ذریعہ تمام انسانوں تک! اور چونکہ ”وحی“ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس تعلیمی رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کا مشاہدہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کو ہوتا ہے، اس لئے ہمارے لئے اس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا ادراک بھی ممکن نہیں، البتہ اس کی اقسام اور کیفیات کے بارے میں کچھ معلوم خود قرآن و حدیث نے فراہم کی ہیں، یہاں صرف انہی کو بیان کیا جاسکتا ہے:-

وحی کی تعلیمات | وحی کے ذریعہ بندوں کو اُن باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جو وہ محض اپنی عقل اور حواس سے معلوم نہ کر سکیں، یہ باتیں خالص مذہبی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں، اور دنیا کی عام ضروریات بھی، انبیاء علیہم السلام کی وحی عموماً پہلی قسم کی ہوتی ہے، لیکن بوقت ضرورت دنیوی ضروریات بھی بذریعہ وحی بتائی گئی ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَاصْنَعِ الْفُلَکَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِّیْنَا (ہود: ۲۷)
”کشتی ہمارے سامنے ہماری وحی کے ذریعہ بناؤ۔“

اس سے معلوم ہوا کہ انھیں کشتی کی صنعت بذریعہ وحی سکھائی گئی، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی، نیز حضرت آدم علیہ السلام کو خواص اشیاء کا علم بذریعہ وحی دیا گیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ علم طب بنیادی طور پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔

۱۷ حضرت مولانا نور شاہ صاحب کشمیری: فیض الباری ص ۱۹ ج ۱ مطبعہ حجازی قاہرہ ۱۳۵۸ھ
۱۸ عبدالعزیز فرہاری: النبراس علی شرح العقائد، ص ۲۲۷ و ۲۲۸ مطبوعہ امیر تسر ۱۳۸۵ھ

وحی کی اقسام | حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ وحی کی ابتدا تین قسمیں ہوتی ہیں:-

(۱) وحی قلبی؛ اس قسم میں باری تعالیٰ براہ راست نبی کے قلب کو مستحق فرما کر اس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے، اس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہوتا ہے، اور نہ نبی کی قوت سامعہ اور حواس کا، لہذا اس میں کوئی آواز نبی کو سنائی نہیں دیتی، بلکہ کوئی بات قلب میں جاگزین ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، یہ کیفیت بیداری میں بھی ہو سکتی ہے اور خواب میں بھی، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا،

(۲) کلام الہی؛ اس دوسری قسم میں باری تعالیٰ براہ راست رسول کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے، اس میں بھی کسی فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا، لیکن نبی کو آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز مخلوقات کی آواز سے بالکل جدا ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہوتی ہے، جس کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں، جو انبیاء اُسے سنتے ہیں وہی اس کی کیفیت اور اس کے سرور کو پہچان سکتے ہیں،

وحی کی اس قسم میں چونکہ باری تعالیٰ سے براہ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ قسم وحی کی تمام قسموں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا، (النساء: ۱۶۳)

”اور اللہ نے موسیٰ سے خوب باتیں کیں“

۱۔ یہ تین قسمیں بنیادی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کی فیض الباری ص ۴ تا ۸ سے ماخوذ ہیں تشریح و تفصیل اور تینوں قسموں کے نام ہمارے اپنے ہیں،
۲۔ ابن قیمؒ: مدارج السالکین، ص ۳۷ ج ۱، مطبعة التتہ المحمدیہ، مکہ مکرمہ ۱۳۷۵ھ

(۳) وحی ملکی؛ اس تیسری قسم میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتہ کے ذریعے نبی تک بھیجتا ہے، اور وہ فرشتہ پیغام پہنچاتا ہے، پھر بعض اوقات یہ فرشتہ نظر نہیں آتا، صرف اس کی آواز سنانی دیتی ہے، اور بعض مرتبہ وہ کسی انسان کی شکل میں سامنے آکر پیغام پہنچا دیتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نبی کو اپنی اصلی صورت میں نظر آجائے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے،

قرآن کریم نے وحی کی انہی تین قسموں کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا ہے:-
 مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، أَوْ
 يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ، (الشوری: ۵۱)
 ”کسی نبی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس سے (روبرو ہو کر) بات کرے، مگر
 دل میں بات ڈال کر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیج کر جو اللہ کی
 اجازت سے جو اللہ چاہے وحی نازل کرے“

اس آیت میں وَحْيًا (دل میں بات ڈالنے) سے مراد پہلی قسم یعنی وحی قلبی ہے، اور پردے کے پیچھے سے مراد دوسری قسم یعنی کلام الہی، اور پیغامبر بھیجنے سے مراد تیسری قسم یعنی وحی ملکی ہے،

حضور پر وحی کے طریقے | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

”حضرت حارث بن ہشامؓ فضلاء صحابہ میں سے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے، اور ۵ھ میں شام کو فتح کرتے ہوئے شہید ہوئے (القسطانیؒ: ارشاد الساری، ص ۵۷ ج ۱ بولاق مصر ۱۳۲۳ھ،

أَحْيَانًا يَأْتِيَنِي مِثْلُ صَلَٰةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَلَيَّ فَيَفْهَمُ
عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ مَا قَالَ وَأَحْيَانًا يَمَثُلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا ۖ

”کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے

زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے،

مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا؟“

اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے دو طریقے معلوم ہوتے ہیں،

(۱) صلصلة الجرس؛ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپ کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی کہ

جیسی گھنٹیاں بجنے سے پیدا ہوتی ہے، حدیث میں تو صرف اتنا ہی مذکور ہے، اس لئے

یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی وحی کو کس اعتبار سے گھنٹیوں کی آواز

سے تشبیہ دی گئی ہے، البتہ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ فرشتے کی آواز ہوتی

تھی، بعض کا خیال ہے کہ فرشتہ وحی لاتے وقت اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا تھا، اس سے

یہ آواز پیدا ہوتی تھی، اور علامہ خطابیؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہاں تشبیہ آواز کے ترمیم

میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور

کسی جگہ ٹوٹتی نہیں، اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہوا کرتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ

محض قیاسات ہیں، اور ان کی بناء پر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ حضرت

علامہ نور شاہ صاحب کشمیریؒ نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے نقل کر کے

اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے،

ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے، ایک تو آواز کے تسلسل کے

اعتبار سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اور دوسرا اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل

بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

۱۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۱، الصحیح المطالع کراچی،

۲۔ دیکھئے حافظ ابن حجر: فتح الباری ص ۱۶ ج ۱، المطبعة البہیة ۱۳۲۸ھ

اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزہ ہے، اس لئے کلام الہی کی یہ خصوصیت ہو کہ اس کی آواز کسی ایک سمت سے نہیں آتی، بلکہ ہر جہت سے آتی ہے، اس کی حقیقت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں کے قریب لانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دیدی ہے،

ہر کیفیت! اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، یا اُس کے رسول

کو، حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی کے اس خاص طریقے میں گھنٹیوں کی سی آواز آیا کرتی تھی، ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وحی کا یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے زیادہ دشوار ہوتا تھا،

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ دَهْوًا مَشْدًا عَلَيَّ (یہ طریقہ میرے لئے سب سے زیادہ سخت

ہوتا ہے) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو وحی کا ہر ایک طریقہ سخت ہوتا تھا، لیکن اس گھنٹیوں کی آواز والے طریقے میں سب سے زیادہ بارہوا کرتا تھا، وجہ یہ ہو کہ کہنے والے اور سننے والے میں کسی نہ کسی طرح مناسبت پیدا ہونی تو ضروری ہے، اب اگر فرشتہ انسانی شکل میں آجائے تو حضورؐ پر کوئی غیر معمولی بار نہیں پڑتا تھا، صرف کلام الہی کے جلال وغیرہ کا بار ہوتا تھا، اس کے برخلاف جب فرشتہ انسانی شکل میں نہ آئے، بلکہ اس کی آواز یا براہ راست باری تعالیٰ کا کلام سُنانا دے، تو یہ ایک غیر معمولی کیفیت ہوتی تھی، اور اس سے مانوس ہونے اور استفادہ کرنے میں آپؐ پر زیادہ بوجھ پڑتا تھا، چنانچہ حضرت عائشہؓ مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں :-

وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ

۱۵ فیض الباری ص ۱۹ د ۲۰ ج ۱ قاہرہ ۱۳۵۷ھ

۱۶ فتح الباری ص ۱۶ ج ۱، قاہرہ ۱۳۵۸ھ

فَيَقْصُرُ عَنْهُ وَارًا جَبِينَهُ لِيَتَفَصَّلَ عَوَاقِلُهُ

”میں نے سخت جارحوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، ایسی ہر وحی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ کی پیشانی مبارک پسینہ سے سشاراوری ہو چکی ہوتی تھی“

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سانس رکنے لگتا، چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سانس کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی تھی کہ آپ ﷺ جس جانور پر اس وقت سوار ہوتے وہ آپ ﷺ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایٹانہ انورے مبارک سہارے زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہوئی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ بڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی، اور مسند احمد کی ایک روایت میں آپؐ خود فرماتے ہیں کہ جب یہ وحی نازل ہوتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح کچھ رہی ہے۔

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی سنائی دیتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی جھنجھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔

۱۔ صحیح بخاری ص ۲ ج ۱ حدیث ۵۱، ۲۔ التیوطی، الاتفاقان ص ۳۶ ج ۱ قاہرہ ۱۳۶۵ھ بحوالہ ابن سعید

۳۔ صحیح بخاری ص ۲۶۱ ج ۲، ابن القیم زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱ المطبعة المیمنیہ مصر،

۴۔ الفجہ الربانی (بتویب مسند احمد) بحوالہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، ص ۲۱۱ ج ۲۰ کتاب السیر النبویہ

حدیث ۵۱ ج ۱ قاہرہ ۱۳۴۵ھ،

۵۔ ایضاً، ص ۲۱۲ ج ۲۰،

(۲) تمثل ملک؛ وحی کی دوسری صورت جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آکر اللہ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبریل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہ بکلیؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ میں سے حضرت وحیہ بکلیؓ کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ وہ اپنے وقت کے حسین ترین انسان تھے، اتنے حسین کہ اپنے چہرے کو لپیٹ کر چلا کرتے تھے؛ البتہ بعض مواقع پر دوسری صورتوں میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام کا آنا ثابت ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کی مشہور روایت میں وہ بالکل ایک اجنبی کی صورت میں تشریف لائے تھے؛ کیونکہ وہاں مقصد یہی یہ تھا کہ حاضرین ایک اجنبی کو حضورؐ کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنا دیکھ کر اچنبھ میں پڑ جائیں،

ہر حال اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ جو فرشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لاتا تھا وہ جبریل علیہ السلام تھے، قرآن کریم کی آیت ہے:-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ،

(البقرہ: ۹۷)

”کہہ دو کہ جو شخص جبریلؑ کا دشمن ہو تو (ہوا کرے) اسی نے یہ (قرآن)

آپ کے دل پر اتارا ہے“

اس سے یہ بات واضح ہے کہ عموماً حضرت جبریل علیہ السلام ہی وحی لایا کرتے تھے، البتہ امام احمدؒ نے اپنی تاریخ میں امام شعبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ابتداءً نبوت میں تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام وحی لاتے رہے ہیں؛ لیکن اُن کے ذریعہ قرآن کریم نازل نہیں کیا گیا، قرآن تمام تر حضرت جبریل علیہ السلام ہی کے لکھنے“

۱۔ العینیؒ: عمدة القاری، ص ۴۷ ج ۱، استنبول ۱۲۸۵ھ

۲۔ دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۱ ج ۱، اصح المطابع کراچی

۳۔ الاتقان، ص ۴۶ ج ۱ والقسطلانیؒ: ارشاد الساری، ص ۵۹، ج ۱،

مگر علامہ اقدسیؒ وغیرہ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپؐ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا کوئی فرشتہ وحی نہیں لایا، علامہ بدر الدین علیؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، اور کسی مرفوع حدیث یا کسی صحابی کے قول میں اس روایت کی بنیاد بھی نہیں ملتی، لیکن حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں، اور اسے زمانہ فترت کا واقعہ قرار دیتے ہیںؒ

بہر کیف وحی کی اس صورت میں فرشتہ انسان کی شکل میں آیا کرتا تھا، اور وحی کے اس طریقے میں آپؐ کو کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی تھی، چنانچہ صحیح ابوعوانہؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کر کے فرمایا:

وَهُوَ أَهْوَىٰ مِنِّي عَلَيَّؑ

”اور یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ آسان ہوتی ہے“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ بالا حدیث میں تو وحی کے صرف یہ دو طریقے بیان کئے گئے ہیں، لیکن دوسری احادیث سے اس کے علاوہ بھی کئی طریقے معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ علامہ حلیمیؒ نے تو لکھا ہے کہ آپؐ پر وحی چھیا الیس طریقوں سے نازل ہوتی تھی، لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حامل وحی (یعنی جبریل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیس تک پہنچا دی ہے، ورنہ تعداد اتنی نہیں ہےؒ

تاہم دوسری احادیث سے نزول وحی کے جو دوسرے اہم طریقے ثابت ہیں، وہ

مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ عمدة القاری، ص ۴۸ و ۴۹ ج ۱ ۲۔ فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۱، ۳۔ الاتقان ج ۴

۴۔ یہ ابو عبد اللہ حسین بن الحسن الحلیمی الجرجانی (متوفی ۳۷۴ھ) ہیں، جن کی کتاب ”المنہاج“

اصول دین پر ایک جامع کتاب ہے، (کشف الظنون نمبر ۱۸۷)

۵۔ حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱

۶۔ حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱

(۳) فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا؛ دجی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپؐ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اُس وقت جب آپؐ نے خود حضرت جبریلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد پر پہلے دو واقعات تو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہوگا۔

(۴) روایاتِ صادقہ؛ دجی کی چوتھی صورت یہ تھی کہ آپؐ کو نزولِ قرآن سے قبل سچے خواب نظر آیا کرتے تھے، جو کچھ خواب میں دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہو جاتا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ
الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ تَكَانُ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْهُ مِثْلَ
فَلَقِ الصُّبْحُ بِهِ

”آپؐ پر دجی کی ابتداء نبی کی حالت میں سچے خوابوں سے ہوئی، اُس وقت آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچا نکلتا“

اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں ایک مرتبہ ایک منافق نے آپؐ پر سحر کر دیا تھا، اس سحر کی اطلاع اور اسے دفع کرنے کا طریقہ بھی آپؐ کو خواب ہی میں بتایا گیا۔

(۵) کلامِ الہی؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ کو بھی اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، بیداری کی حالت میں یہ واقعہ صرف معراج کے موقع پر پیش آیا ہے، اس کے علاوہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپؐ

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری، ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱،

۲۔ صحیح بخاری ص ۲ ج ۱ حدیث ۲،

۳۔ صحیح بخاری باب السحر ابواب الطب ص ۸۵ و ۸۶ ج ۲، مطبوعہ اصح المطابع کراچی،

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں بلکہ

(۶) لَفْثٌ فِي الرُّوحِ ؛ وحی کا چھٹا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی شکل میں سامنے آئے، بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات (نقارہ) فرمادیتے تھے، چنانچہ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

إِنَّ رُوحَ الْقُدُّسِ لَفَثٌ فِي رُوحِي ۝

”روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بتا ڈالی“

اور مستدرک حاکم کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

ان جبرئیل علیہ السلام التقی فی روحی ان احداً منکم

لن یمخرج من الدنیا حتی یتکمل رضاقہ،

”جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے

نہیں جائے گا، تا وقتیکہ اپنا رزق پورا نہ کر لے“

وحی اور کشف الہام | اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، اور کسی بھی غیر نبی کو خواہ وہ تقدس

اور ولایت کے کتنے بلند مقام پر ہو، وحی نہیں آسکتی۔ البتہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو کچھ باتیں بتا دیتا ہے، اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے کشف اور الہام میں حضرت محمد و الف ثانیؐ نے یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ کشف کا تعلق حسیات سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے، اور الہام کا تعلق و جبرانیات سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی، صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے، اسی لئے عموماً الہام کشف کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہوتا ہے،

۱۱۱۱۱۱

۱۱۱۱۱۱، ص ۴۶ ج ۱،

۱۱۱۱۱۱، المستدرک، کتاب البیوع ص ۴ ج ۲، دائرة المعارف، دکن، ۱۳۴۲ھ

۱۱۱۱۱۱ فیض الباری ص ۱۹ ج ۱

وحی کی آخری صورت یعنی ”نفث فی الروح“ بظاہر الہام سے بہت قریب ہے کیونکہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا انوار کیا جاتا ہے، لیکن دونوں کی حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وحی میں — جو صرف نبی کو ہوتی ہے — ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے؟ چنانچہ حاکمؒ کی مذکورہ روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً بتلادیا کہ ”روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے“ لیکن الہام میں ڈالنے والے کی تعیین نہیں ہوتی، بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی ایسی بات آگئی ہے جو پہلے نہیں تھی بلکہ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی وحی سونی صدیقینی ہوتی ہے، اور اس کی پیروی فرض ہے، لیکن اولیاء اللہ کا الہام یقینی نہیں ہوتا، چنانچہ وہ دین میں حجت ہے، اور نہ اس کا اتباع فرض ہے، بلکہ اگر کشف الہام یا خواب کے ذریعہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن و سنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو قرآن کریم کی آیات، جن کے الفاظ اور

وحی متلو اور غیر متلو

معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے، اور جو قرآن کریم میں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے، اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں ”وحی متلو“ کہا جاتا ہے، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، دوسری قسم اُس وحی کی ہے جو قرآن کریم کا جز نہ نہیں بنی، لیکن اس کے ذریعہ آپؐ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے ہیں، اس وحی کو ”وحی غیر متلو“ کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وحی متلو یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کیا گیا ہے ان تعلیمات کی تفصیل

اور جزوی مسائل زیادہ تر ”وحی غیر متلو“ کے ذریعہ عطا فرمائے گئے ہیں، یہ ”وحی غیر متلو“ صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے، اور اس میں عموماً صرف مضامین وحی کے ذریعہ آپ پر نازل کئے گئے ہیں، ان مضامین کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آپ نے خود فرمایا ہے، ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

أَوْثَيْتَ الْقُرْآنَ وَوَسَّلْتَهُ مَعَهُ

”مجھ قرآن بھی دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ اسی جیسی دوسری تعلیمات بھی“

اس میں قرآن کریم کے ساتھ جن ”دوسری تعلیمات“ کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے،

اسلامی احکام کی جزوی تفصیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعہ بتائی گئی ہیں، اس لئے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں انھوں نے کچھ عرصہ سے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ ”وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن کریم میں محفوظ ہے، قرآن کریم کے علاوہ جو احکام آپ نے دیئے وہ ایک سربراہ مملکت کی حیثیت سے دیئے جو صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کے لئے واجب العمل تھے، آج اُن پر عمل کرنا ضروری نہیں،

لیکن یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، خود قرآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی الہی صرف قرآن کریم میں منحصر نہیں بلکہ آیات قرآنی کے علاوہ بھی آپ کو بہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں، اس بات کی تائید میں چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیے :-

(۱) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ (البقرہ: ۱۴۴)

”اور جس قبلہ کی طرف آپ پہلے رُخ کرتے تھے، اسے ہم نے صرف اس کو
مستتر کیا تھا تاکہ یہ جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی
ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے“

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک
بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، میں، اس کے بعد جب دوبارہ بیت اللہ
کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے
بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم صرف اس لئے دیا تھا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے
کہ کون اس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون انکار، یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس آیت
میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب
فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم بھی ہم نے ہی دیا تھا، اب قرآن کریم کو الحمد سے
لے کر دانتاس تک پڑھ جائیے، اس میں کہیں یہ حکم نہیں ملے گا کہ ”بیت المقدس
کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی
وحی کے ذریعہ دیا تھا جو قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں، اور اسی کا نام ”وحی غیر متروکہ“
(۲) فَلَمَّا نَبَاَتْ بِهٖ وَاٰظَمَرَا۟ اللّٰهُ عَلَیْہِ عَوۡفَ بَعۡضِنَہٗ وَاَعۡرَضَ

عَنْ بَعۡضِ الْاٰمِیۡۃِ ” (التحریم: ۳)

”پس جب اُس (عورت) نے آپ کو اس کی خبر دی اور اللہ نے اس کو آپ پر

ظاہر کر دیا،

اس آیت کی تشریح مختصر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وجہ مطہرہ
نے ایک بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپائی جا ہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ
وحی آپ کو وہ بات بتلا دی، اس پر انھوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے
بتائی؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات مجھے علیم وخبیر یعنی اللہ تعالیٰ نے بتلا دی تھی، اس آیت
میں تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بتلائی تھی، حالانکہ
پورے قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اطلاع

آپ کو وحی غیر متلو کے ذریعہ دی گئی تھی،

اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلو کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف اپنی دو آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر تحقیق حق مقصود ہو تو یہ دو آیتیں بھی اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہوتا کہ وحی غیر متلو بھی وحی کی ایک قسم ہے، اور وہ بھی وحی متلو کی طرح یقینی اور واجب الاتباع ہے،

وحی پر عقلی شبہات | یہ وحی اور اس کی حقیقت سے متعلق وہ ضروری معلومات تھیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں، ہم شروع

میں کچھ چکے ہیں کہ وحی اُن معاملات میں اللہ کی طرف سے رہنمائی کی ایک شکل ہے، جن کا ادراک بری عقل سے نہیں ہو سکتا، اور چونکہ وحی کا مشاہدہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا، اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیات کا اندازہ بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج کی وہ دنیا جو مغربی افکار کے ہمہ گیر سیلابِ مرعوب ہے، اسے یہ باتیں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں، اور وہ انھیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر بعض لوگ تو کھل کر وحی و الہام کا انکار کر کے اسے معاذ اللہ قصہ کہانی سے تعبیر کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو اس کا کھل کر انکار تو نہیں کرتے، لیکن ”سائنٹفک ترقیات“ کے اس دور میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتے ضرور ہیں، اس لئے یہاں مختصر آئیہ بھی سمجھ لیجئے کہ خالص عقلی اعتبار سے وحی کی کیا حیثیت ہے؟

ہم ایسے نزدیک وحی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے طے کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک ہو یا یہ خود بخود بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے وجود میں آگئی ہے؟ جہاں تک اُن مادہ پرست لوگوں تعلق ہے جو سکر سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، جو شخص خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی حقیقت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اُسے دل و جان سے تسلیم کر لے، اس لئے اس سے تو سب سے

پہلے خدا کے وجود پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں سو ان کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں،

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہو وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے اُسے اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو بروئے کار لا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جسک ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے ہوئے اس کے سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے، اور سفر کے دوران اُس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی قسم کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اُس خداوندِ قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا عجیب و غریب العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغامِ رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے، جس کے ذریعہ انسانوں کو انکے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہو، بلکہ اُن کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقی نظام کا نام وحی و رسالت ہے،

اس سے صاف واضح ہے کہ ”وحی“ محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا انکار درحقیقت اللہ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے، رہی یہ بات

کہ وحی کے جو طریقے اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، سو یہ وحی کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے، جس چیز کی عقلی ضرورت اور اس کا وقوع ناقابل انکار و لاتل سے ثابت ہوا اُسے محض اس بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، آج سے چند سو سال پہلے اگر کسی شخص کے سامنے یہ ذکر کیا جاتا کہ غفریب انسان ہوائی جہاز میں پرواز کر کے ہزاروں میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیا کریں گے تو وہ یقیناً اسے پروں کا افسانہ قرار دیتا، لیکن کیا اس کے مشاہدہ نہ کرنے سے ہوائی جہاز کی حقیقت ختم ہو گئی ہے؟ آج بھی پسماندہ علاقوں کے ہزار ہا افراد ایسے ہیں جو اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہو، لیکن کیا ان کے انکار کرنے سے یہ واقعہ غلط ثابت ہو گیا ہے؟ دیہات میں جا کر کسی آدمی سے کمپیوٹر سسٹم کی تفصیلاً بیان کیجئے اور اسے بتائیے کہ کس طرح ایک مشین انسانی دماغ کا کام کر رہی ہے، وہ آپ کے بیانات پر آخر تک شک و شبہ کا اظہار ہی کرتا رہے گا، لیکن کیا ان شکوک و شبہات سے کمپیوٹر کے وجود کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو وہ وحی جس کی عقلی ضرورت مسلم اور ناقابل انکار ہے، اور جس کا مشاہدہ دنیا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق ترین انسانوں نے کیا ہے (علیہم السلام) اسے محض ان شکوک و شبہات کی بنا پر کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے؟

اور آخر وحی کے ان طریقوں میں عقلی بُعد کیا ہے؟ کیا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو وحی کے ان طریقوں پر قدرت نہیں؟ اگر دنیا کے سائنس دان محض اپنی محدود عقل کے بل پر پیغام رسانی کے لئے ٹیلیفون، تار، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حیرت انگیز آلات ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کو ان عوذ باللہ! اتنی بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا سلسلہ قائم فرما دے جو ان تمام ذرائع مواصلات سے زیادہ مستحکم اور یقینی ہو؟

وحی کی حقیقت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی واسطے کے ذریعہ یا بلا واسطہ اپنے کسی پیغمبر پر القاء فرما دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس بات کو درست تسلیم کر لیتے ہیں

عقلی قباحت کیا ہے؟ وحی کے ثبوت میں کسی انسانی ایجاد یا عمل کی مثال پیش کرتے ہوئے ہمیں تامل ہوتا ہے، لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم ایک ایسے انسانی عمل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کے قالب و دماغ کو مسخر کر کے اس میں جو خیال چاہتا ہے ڈال دیتا ہے،

اس عمل کو صوفیاء کی اصطلاح میں ”تصرف خیالی“ کہا جاتا ہے، صوفیائے کرام کے تذکروں میں اس عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی خیل قوت کے زور سے دوسرے کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس سے جو چاہتا ہو کہلاتا ہے، اور جو چاہے کر داتا ہے، مادہ پرست لوگ ایک مدت تک اس ”تصرف“ کی قوت کا بھی انکار کرتے رہے، اور انہی کی تقلید میں بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قصہ کہانی سے تعبیر کیا، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سوئٹزرلینڈ کا مشہور ماہر طبیعیات میسر (Mesmer) پیدا ہوا، اس نے انسانی دماغ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور مشہور ہوئے اپنے ایک مقالے کے ذریعے یہ انکشاف کیا کہ ایک مقناطیسی عمل کے ذریعے انسان کے دماغ کو مسخر کیا جاسکتا ہے، اس عمل کو وہ مقناطیسی عمل تنویم (Anima Masnetism) کہتا تھا، اور فرانس میں مقیم رہ کر اس نے کامیاب عملی تجربے بھی کئے، لیکن وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو پوری طرح مطمئن نہ کر سکا، پھر ۱۷۸۴ء میں انگلینڈ میں ایک اور شخص جیمس بریڈ.....

لے اس کا پورا نام فریڈرک انیٹون میسر (Fredrich Anton Mesmer)

ہے، یہ سوئٹزرلینڈ کی ایک جھیل کانسٹنس کے قریب مئی ۱۷۳۴ء میں پیدا ہوا اور میرسبرگ کے مقام پر مارچ ۱۷۸۱ء میں وفات پائی، ابتداء میں اس نے طب کو اپنا موضوع بنایا تھا، بعد میں مقناطیسی عمل تنویم کا ماہر بلکہ اس کا بانی کہلایا، اور (درلڈ فیل) انسائیکلو پیڈیا ص ۲۵ ج ۳ ص ۱۲ مطبوعہ مشیگان امریکہ ۱۷۹۵ء) میسر نیرم کا علم اسی کی طرف منسوب ہے،

(James Braid) پیدا ہوا، جس نے اس عملِ تسخیر کو سائنٹفک

بنیادوں پر از سر نو ثابت کر کے اس کا نام عملِ تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا،

جیسے بریڈ کے تجویز کردہ ہپناٹزم میں مختلف مدارج ہوتے ہیں، اس کا انتہائی درجہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس شخص پر یہ عمل کیا جائے یعنی معمول (Hypnotised) اس کے جسم کے تمام عضلات و اعصاب بالکل جامد اور بے حس ہو جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ حواس ظاہر و باطنہ معطل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا ایک درمیانی درجہ بھی ہے، جس میں جسم بے حس و حرکت نہیں ہوتا، اس کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے ورلڈ فیسل انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے :-

”اگر تنویم کا عمل ذرا ہلکا ہو تو معمول اس لائق رہتا ہے کہ وہ مختلف اشیاء کا تصور کر سکے، مثلاً اس حالت میں یہ ممکن ہو کہ وہ (عامل کی ہدایت کے مطابق) اپنی آپ کو کوئی اور شخصیت یقین کر لے، اُسے کچھ خاص چیزیں (جو وہاں فی الواقعہ موجود نہیں ہیں) نظر آنے لگیں، یا وہ غیر معمولی حس اپنے اندر محسوس کرنے لگے، اسی طرح وہ اُس وقت عامل کی ہدایات کا تالچ ہو جاتا ہے“

جیسے بریڈ کی تحقیقات اور تجربات کے بعد ہپناٹزم کو اُن مادہ پرست لوگوں نے بھی مان لیا جو پہلے اس کے قائل نہ تھے، اور آجکل تو یہ مغربی عوام کی دلچسپی کا بہت بڑا موضوع بنا ہوا ہے، سینکڑوں عامل اس کے ذریعہ روپیہ کماتا رہے ہیں، مریضوں کے علاج میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے، اور وہ ”تصرف خیالی“ جس کا ذکر مسلمان صوفیاء کرام کے یہاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور جس کو لوگ محض توہم پرستی کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے، اب ہپناٹزم کے نام سے ایک حقیقت بن گیا ہے، اور اب ہمارے زمانے کے وہ نام نہاد ”عقلیت پسند“ بھی اُسے تسلیم کرنے لگے ہیں جنہیں مسلمانوں کی ہر غیر معمولی بات توہم پرستی

اور مغرب کی ہر دریافت "سائنٹفک جنقت" نظر آتی ہے،

بہر کیف؛ عرض کرنا یہ تھا کہ مسمریزم ہو یا ہیناٹزم، اس کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہو کہ ایک انسان دوسرے کو مسخر کر کے اپنے خیالات اور اپنی باتیں اس کے دل و دماغ میں ڈالتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کے تصرف خیالی یا عقلی تنزیم میں اتنی قوت دی ہے کہ وہ معمولی معمولی مقاصد کے لئے بلکہ بعض اوقات بالکل بیکار دوسرے کے دماغ و دل کو مسخر کر لیتا ہے، کیا وہ خود اس بات پر قادر نہیں ہے کہ انسانیت کی ہدایت کی خاطر ایک پیغمبر کے قلب کو مسخر کر کے اپنا کلام اس میں ڈال دے؟ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ،

کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟ | اور پر ذکر آچکا ہو کہ وحی کی دو قسمیں ہیں؛ ایک وحی متلو یعنی تراکیم کریم، اور دوسری وحی غیر متلو، اس دوسری قسم میں تو عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور انھیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیل علیہ السلام یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ نہیں، وہ لفظاً اور معنی پورا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی من وعن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور ان کے انتخاب یا ترکیب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا،

جو لوگ وحی کے بارے میں مادہ پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہیں ہمارے زمانے میں ان میں سے بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، اور (معاذ اللہ) اس کے الفاظ اور ترکیبیں وغیرہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل باطل، جمل اور قرآن و سنت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے،

قرآن کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معنی

دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:-
 (۱) قرآن کریم نے جا بجا اپنی ایک صفت ”عربی“ بیان فرمائی ہے، یعنی یہ کراے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا ہوتا تو انشاءً اللہ قرآنِ اعربی کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں،

۲۔ قرآن کریم میں کئی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض منصبی بیان فرمائے گئے ہیں؛

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ رَاقِبَهُ
 اُن کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کریں اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور انھیں پاک صائب بنائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ دو فرائض الگ الگ تھے، ایک آیات اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے اُن کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معنی کی نہیں لہذا آپ کے سب سے پہلے فربضہ منصبی کا تعلق صرف الفاظ قرآن سے ہے معانی سے نہیں۔
 ۳۔ قرآن کریم نے جا بجا اپنے لئے ”الکتاب“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور لفظ ”کتاب“ کا اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب اُن مضامین کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے تب اُسے کتاب کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے لفظ اور معنی دونوں منزل من اللہ ہیں،

۴۔ سورہ قیامتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی الفاظ دہراتے تھے اس پر باری تعالیٰ نے حکم دیا کہ:-

۱۔ ملاحظہ فرمائیے سورہ نحل: ۱۰۳، شعراء: ۱۹۵، یوسف: ۲، ظہر: ۱۱۳، الرعد: ۳۹، الزمر: ۲۸
 ۲۔ حم السجده: ۳، الشوری: ۷، الزخرف: ۳ وغیرہ،

لَا تُخَوِّلُ بِهِ لِسَانَكَ لِتُعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝
فَإِذَا قَرَأْتَ قُرْآنَهُ فَقَامِعُ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتِهِ ۝ (البقرہ: ۱۷۱ تا ۱۷۴)
نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہو گا
جمع کر دینا تیرے سینہ میں اور پڑھنا (تیری زبان) پھر جسیم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی) اس
یہ آیت صراحتہ دلالت کر رہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے
وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا، اسی لئے اس کے الفاظ یاد کرانے، اس کی تلاوت کا طریقہ
سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لئے ہیں
ان واضح دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظِ قرآن وحی کے
ذریعے نازل نہیں کئے گئے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی نے
بڑی اچھی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :-

”اس مقام پر بحث کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں
بالتفاق بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں، اور احادیثِ قدسیہ کے بارے میں بھی مشہور
قول یہی ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیثِ نبویہ
کے صرف معنی وحی ہیں، الفاظ حضور کے اپنے ہیں، اور جو احادیث آپ نے اپنے
اجتہاد سے ارشاد فرمائیں اُن کے معنی اور الفاظ دونوں حضور کے ہیں“

در اصل جن لوگوں نے الفاظِ قرآن کے وحی ہونے سے انکار کیا ہے اُن کے
اس مغالطے کا منشاء یہی ہے کہ وحی کے ذریعے الفاظ کا نزول ان کی سمجھ میں نہ آ سکا لیکن
وحی کی حقیقت اس کی عقلی ضرورت اور اس پر عقلی مشبہات کے جواب میں جو باتیں آپ
لکھی گئی ہیں اُن کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے، اگر وحی واقعہً
ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس پر قادر ہے، تو آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ معنی
تو نبی کے قلب پر اتار سکے اور الفاظ اُتارنے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ علامہ بذرا الدین زکشتیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اُن کے نزدیک صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، الفاظ حضرت جبریلؑ کے یا حضورؐ کے ہیں، لیکن آپؐ نے دیکھا کہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں، مذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ قال بعضهم (بعض لوگوں نے کہا ہے) کہہ کر یہ اقوال نقل کر دیئے ہیں، اور علامہ سیوطیؒ نے تو اس کی صراحتہ تردید بھی کی ہے، اس لئے ان اقوال کو اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تایخ نزول قرآن

قرآن کریم در اصل کلام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے،
قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

بَلِّغْهُمُ الْقُرْآنَ يُخَيِّرُكَ فِي كَوْنِهِ مَحْفُوظًا (البوحر: ۲۳)

”بلکہ یہ قرآن مجید ہی، لوح محفوظ میں“

پھر قرآن مجید کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورا کاپورا آسمان
دنیا کے بیتِ عزت میں نازل کر دیا گیا، اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر
تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی
تکمیل ہوئی، قرآن کریم میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ایک ”انزال“، اور دوسرے
”تنزیل“، ”انزال“ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک ہی دفعہ میں مکمل نازل کر دینا، اور ”تنزیل“
کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا، چنانچہ قرآن کریم نے اپنے لئے پہلا لفظ
جہاں کہیں استعمال کیا ہے، اس سے مراد عموماً وہ نزول ہے جو لوح محفوظ آسمانِ نیا
کی طرف ہوا، ارشاد ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مَبْرُورَةٍ، (الدخان: ۲)

”بلاشبہ ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا“
 اور ”تزل“ سے مراد وہ نزول ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج ہوا، چنانچہ
 ارشاد ہے:-

وَقُرْآنًا فَرَسْتُمْ لُفْقًا أَهْلًا عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْنٍ وَخَرَّ لَنَا هَ تَنْزِيلًا

(سنی اسرائیل: ۱۲)

”اور قرآن کو ہم نے متفرق طور سے اس لئے اتارا تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے

ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں؛ اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا،“

نزول قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں،
 اس کے علاوہ نسائی، حاکم، بیہقی، ابن ابی شیبہ، طبرانی، اور ابن مرددہ نے حضرت
 عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کا
 پہلا نزول یکبارگی آسمان دنیا پر ہوا، اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم پر۔

پہلا نزول؛

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا نزول
 لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام ”بیت عزت“ پر ہوا،
 ”بیت عزت“ میں قرآن کا نزول کس طرح ہوا؟ اور اس نزول کی حکمت کیا تھی؟
 اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ بعض علما مثلاً علامہ ابو شامہؒ
 نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو واضح کرنا مقصود
 تھا، اور اس مقام کے علاوہ کو یہ بات بتائی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہو جو اہل زمین
 کی ہدایت کے لئے اتاری جانے والی ہے، ”ذرقانی“ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس

لہ دیکھئے الاتقان، ص ۱۴۱ ج ۱، النوع السادس عشر،

لہ مناہل العرفان ص ۳۹،

طرح دوم تہ اتارنے سے یہ بھی جتنا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہر شک و شبہ بالاتر ہے ؛ حضور کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور دوسرے بیت عزت میں، واللہ اعلم،

بہر کیف: اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کون کرے؟ اسی کو صحیح علم ہے کہ اس کی اور کیا کیا حکمتیں ہوں گی، اور ہمیں اُن کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، البتہ ہمیں اتنا وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ پہلا نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا،

دوسرا نزول؛

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا نزول بھی نزول اُس وقت شروع ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کا آغاز بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر ہی سے ہوا ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں گیارہ سال بعد غزوہ بدر پیش آیا، چنانچہ ارشاد ہے :-

وَمَا أَنْزَلْنَاهُ إِلَّا عَلَىٰ عَبْدٍ نَّائِيًا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّلَاقِ الْجَمْعَانِ
(انفال: ۴۱)

اس طرح نزول قرآن کے آغاز کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں تو خود قرآن کریم سے ثابت ہیں :-

- ۱۔ اس کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی،
 - ۲۔ جس رات نزول قرآن کا آغاز ہوا وہ شب قدر تھی،
 - ۳۔ یہ وہی تاریخ تھی جس میں بعد کو غزوہ بدر پیش آیا،
- لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس کے بارے میں کوئی یقینی بات

۱۔ مشہور یہ ہے کہ آپ کو نبوت ربیع الاول میں عطا ہوئی تھی، علامہ سیوطیؒ نے اس کا محل یہ بتایا ہے کہ آپ کو ربیع الاول میں سچے خواب آنے شروع ہوئے تھے، یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، پھر رمضان میں قرآن نازل ہوا، (الاتقان، ص ۴۲ ج ۱)

ہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترہویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے؛
سب سے پہلے نازل ہونی والی آیت؛

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اتریں وہ سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اُس دوران آپ غارِ حرا میں کئی کئی راتیں گزارتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اُسی غار میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اُس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضور نے فرمایا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔“ اس کے بعد خود حضور نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا، اور مجھے اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“ فرشتہ نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھیج کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
 اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، (علق: ۱)

”پڑھو، اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجھ

خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو لے کر واپس گھر کی طرف چلے، تو آپ کا مبارک

دل دھڑک رہا تھا، آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے، اور فرمایا: **ذَمُّوا نَبِيَّ**، **ذَمُّوا نَبِيَّ** (مجھے کبیل اڑھاؤ، مجھے کبیل اڑھاؤ) گھر والوں نے آپ کو کبیل اڑھایا، یہاں تک کہ آپ سے خوف جاتا رہا،

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، اس زمانے کو ”فترت وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غار حرا میں آیا تھا، آپ کو آسمان وزمین کے درمیان دکھائی دیا اور اس سورۃ مدثر کی آیات آپ کو سنائیں،

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ تقریباً تمام کتب حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک صحیح ہی ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیات جو آپ پر نازل ہوئیں سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں، ان کے بعد سورۃ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، لیکن اس سلسلے میں تین اقوال اور بھی ہیں، جن پر یہاں ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا:-

۱۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر سب سے پہلے سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اس بناء پر بعض علماء نے یہ کہہ دیا کہ نزول کے اعتبار سے سورۃ مدثر سورۃ علق سے مقدم ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے اس مغالطہ کی حقیقت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درحقیقت بخاری کی کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت مختصر ہے، اور اس میں دو جملے نقل نہیں کئے گئے، یہی روایت امام زہری رضی اللہ عنہ کی سند سے بخاری ہی نے باب بدر الوحی میں نقل کی ہے، اس میں حضرت جابر نے سورۃ مدثر کے نزول کا واقعہ بتاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ صراحتہ نقل فرمائے ہیں کہ:-

صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

فَإِذَا أَمْلَأْتُكَ الْغِنَى جَاءَنِي بِصِرَافٍ جَالِسٍ عَلَى الْكُرْسِيِّ
 ”پس اچانک (میں نے دیکھا کہ) جو فرشتہ میرے پاس غارِ حرار میں آیا تھا
 وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے“

اس سے صاف واضح ہے کہ غارِ حرار میں سورۃ افترا کی آیتیں پہلے نازل ہو چکی
 تھیں، سورۃ مدثر بعد میں نازل ہوئی، لہٰذا البتہ یہ کہنا درست ہے کہ ”فترت وحی“ کے بعد
 سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ مدثر کی ہیں، لہٰذا جن روایات میں حضرت
 جابر رضی عنہ سے یہ منقول ہے کہ پہلی نازل ہونے والی وحی ”يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ“ ہے، اس سے
 مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”فترت“ کے زمانہ کے بعد پہلی وحی یہ تھی، اور یہ بھی ہو سکتا
 ہے کہ پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ سورۃ مدثر تھی، کیونکہ سورۃ اقرآ پوری ایک
 مرتبہ نازل نہیں ہوئی،

۲۔ امام بیہقیؒ نے دلائل النبوة میں حضرت عمرو بن حبیل رضی اللہ عنہ سے ایک
 مرسل روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی سے پہلے حضرت
 خدیجہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی خلوت میں جاتا ہوں تو کوئی مجھے ”يَا مُحَمَّدُ
 يَا مُحَمَّدُ“ کہہ کر بکارتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن جب میں خلوت میں پہنچا تو اس نے
 کہا ”يَا مُحَمَّدُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“
 یہاں تک کہ پوری سورۃ فاتحہ پڑھ دی،

اس روایت کی بناء پر علامہ زرخشریؒ نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی
 سورت سورۃ فاتحہ ہے، بلکہ اسی کو انھوں نے اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے، لیکن
 حافظ ابن حجرؒ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زرخشریؒ کا یہ کہنا درست نہیں،

لہٰذا فتح الباری، ص ۲۳ ج ۱، اس واقعہ کی مزید تحقیق کے لئے دیکھئے فیض الباری ص ۲۵ ج ۱،

والاقتان، ص ۲۴ و ۲۵ ج ۱، لکھ الاقتان، ص ۲۵ ج ۱،

لکھ الزرخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ص ۷۷ ج ۲، مطبع الاستقامۃ، قاہرہ ۱۳۶۵ھ

سورۃ فاتحہ کو پہلی وحی قرار دینے والے بہت کم ہیں، اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ سورۃ اٰقرا سب سے پہلے نازل ہوئی،^۱

جہاں تک بیہقیؒ کی مذکورہ روایت کا تعلق ہے اُس کے بارے میں خود امام بیہقیؒ نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ روایت درست ہو تو یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ سورۃ افتراء اور سورۃ مدثر کے نزول کے بعد کا ہو،^۲ اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خیال بھی فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے سورۃ فاتحہ بعض دوسری آیات کی طرح دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، ایک مرتبہ سورۃ افتراء کے نزول سے پہلے، اور دوسری بار اس کے بعد، اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ سورۃ فاتحہ کا نزول پہلی بار قرآنیت کی صفت کے ساتھ نہیں ہوا تھا، بلکہ ایک فرشتہ نے آپ کو یہ سورت سنا دی تھی، بعد میں اپنے وقت پر باقاعدہ قرآن کے جزء کی حیثیت میں نازل ہوئی،^۳

بہر کیف! ان تین روایتوں کو چھوڑ کر باقی اکثر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ سورۃ اقرآ کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطیؒ نے اس کی تائید میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں^۴

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورت کے ساتھ ”مکی“ اور کسی کے ساتھ ”مدنی“ لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق ”مکی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ سے پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی، بعض لوگ ”مکی“ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور ”مدنی“ کا یہ کہ وہ شہر مدینہ

^۱ فتح الباری ص ۵۸۰ ج ۸ کتاب تفسیر سورۃ اقرآ، ^۲ الاتقان ص ۲۵ ج ۱،

^۳ الاتقان ص ۲۴ ج ۱،

^۴ فیض الباری، ص ۲۵ ج ۱،

میں اُترتی، لیکن اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق یہ مطلب سمجھا درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں، لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ منی، عرفات وغیرہ اور سفر معراج کے دوران نازل ہونے والی آیات ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ سفر، ہجرت کے دوران جو آیات راستے میں نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئے، مگر انھیں مدنی کہا جاتا ہے، چنانچہ ہجرت کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ سے سینکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیات مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں چنانچہ آیت قرآنی اِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي مَكَّهٗ اَنْ تَوَدُّواْ اَلَا مَأْتَاۤتٍ اِلَیْ اَہْلِہٖہَا، مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، لہٰذا خلاصہ یہ ہے کہ مکی اور مدنی کی تقسیم اگرچہ بظاہر مقامات نزول کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے ہے، ہجرت کی تکمیل سے قبل کی آیات مکی ہیں اور بعد کی مدنی،

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں آپ نے کسی آیت یا سورت کو مکی یا مدنی قرار دیا ہو، لیکن جن حضرات صحابہؓ و تابعینؓ نے فسران کریم کے الفاظ و معانی کی حفاظت میں اپنی عمریں کھپائی ہیں انھوں نے ہی سورتوں اور آیات کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے کونسی مکی ہے اور کونسی مدنی؟ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں: ”قسم اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کی کتاب کی ہر آیت

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے البرہان فی علوم القرآن، ص ۸۸ ج ۱، النوع التاسع،

لہ مناہل العرفان ص ۸۸ ج ۱،

کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟
اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”خدا کی قسم! میں ہر ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ
رات میں نازل ہوئی یا دن کو، میدانی علاقہ میں اترتی یا پہاڑ پر؟“

اکثر و بیشتر تو انہی حضرات صحابہؓ نے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ مکی ہیں یا مدنی، اس کے علاوہ بعض آیات یا سورتوں کے بارے میں
دوسرے شواہد کے ذریعہ بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے، مثلاً جن آیات میں غزوہ بدر کا ذکر ہے
ظاہر ہے کہ وہ مدنی ہی ہو سکتی ہیں، یا جن آیتوں میں خاص طور پر مشرکین مکہ سے خطاب
کرنے کو کہا گیا ہے ان میں سے بیشتر کو مکی ہی سمجھا جاسکتا ہے، لہذا بعض مرتبہ اس قسم
کے قیاسات اور شواہد کی بنیاد پر بھی کسی آیت کو مکی یا مدنی قرار دیا جاتا ہے، پھر چونکہ
قیاسات مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے بعض آیات کے بارے میں مفسرین کے درمیان
اختلاف بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ مکی اور بعض کے نزدیک مدنی ہیں،
پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی یا پوری کی پوری مدنی ہیں
مثلاً سورہ مدثر پوری مکی ہے اور سورہ آل عمران پوری مدنی، اور بعض مرتبہ ایسا
بھی ہوا ہے کہ پوری سورت تو مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی آگئی ہیں
مثلاً سورہ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں *وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً*
الْبَحْرِ، سَ لَ كَرُوا إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ الذَّمَّ تک کی آیات مدنی ہیں، اسی طرح
بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، مثلاً سورہ حج مدنی ہے لیکن اس کی چار آیتیں
یعنی *وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى سَ لَ كَرَعَدًا*
يَوْمَ عَقِيقٍ تک مکی ہیں،

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکی یا مدنی ہونا عموماً اس کی
آیات کی اکثریت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی

ابتدائی آیات ہجرت سے قبل نازل ہو گئیں، اُسے مکی سترار دیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں۔
مکی و مدنی آیتوں کی خصوصیات؛

- علماء تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے باوی النظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، اس سلسلے میں بعض قواعد کلی ہیں اور بعض اکثری، قواعد کلیتہً یہ ہیں:-
- ۱۔ ہر وہ سورت جس میں لفظ "کَلَّا" (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں، چنانچہ علامہ دیرینیؒ کا شعر ہے ۵
 وَمَا نَزَّلَتْ كَلًّا، بَيِّنَاتٌ فَاَعْلَمَنَّ وَلَمْ تَأْتِ فِي الْقُرْآنِ فِي نِصْفِهِ إِلَّا ۝
 - ۲۔ ہر وہ سورت جس میں کوئی سجدے کی آیت آئی ہے مکی ہے۔



- ۳۔ سورۃ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ آیا ہو وہ مکی ہے،
 - ۴۔ ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے،
 - ۵۔ ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے، بعض علماء نے اس قاعدے سے سورۃ عنکبوت کو مستثنیٰ کیا ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ سورۃ عنکبوت بحیثیت مجموعی تو مکی ہے، مگر جن آیات میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں؛
- اور سورتوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے،
- ۱۔ مکی سورتوں میں عموماً یَا أَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے،
- ۱۔ مناہل العرفان، ص ۱۹۲ ج ۱ ۲۔ ایضاً، ص ۱۹۱ ج ۱،
- عمدہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے مأخوذ ہے۔ اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورہ حج مکی ہے۔ لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہ و تابعین سے مروی ہے تو سو و حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ تقی

اور مدنی سورتوں میں یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے الفاظ سے،

۲۔ مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات و سورتیں طویل اور مفصل ہیں،

۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پھیلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں،

۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے، اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے،

۵۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پُر شکوہ ہے، اس میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرۃ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے،

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالاتِ ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح بُت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق درجوق اسلام کے سائے تلے آ رہے تھے، علی سطح پر بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا، اور تہا متر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا،

ہر منصف مزاج انسان حالات کی تدریج کی روشنی میں شرآنی مضامین اسلوب کے اس اختلاف کو باسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن جن مستشرقین کے دل میں اسلام دشمنی کی آگ سلگتی ہی رہتی ہے، انھوں نے مکی اور مدنی اسلوب کے اس فرق سے بھی من گھڑت نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ بعض مستشرقین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، اسی لئے وہ حالات اور ماحول کے اختلاف سے مختلف اسلوب اختیار کرتا رہا، اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کا اسلوب گرد و پیش سے متاثر نہ ہوتا،

لیکن جس شخص کے دل میں بھی انصاف اور معقولیت کی ادنیٰ رفق موجود ہو وہ اس معاندانہ اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، علم بلاغت کی اصل روح یہ ہے کہ کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو، ہر قسم کے مخاطب کے سامنے اور ہر قسم کے ماحول میں ایک ہی انداز و اسلوب پر جمے رہنا پرلے درجے کی بد مزاجی اور بلاغت کے بنیادی آداب تک سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس بد مزاجی کی توقع وہی شخص کر سکتا ہے، جس نے اعتراض برائے اعتراض کی قسم ہی کھا رکھی ہو،

نزول کا وقت اور مقام،

آیات قرآنی میں مکی اور مدنی کی تقسیم کے علاوہ نزول کے مقام اور وقت کے لحاظ سے مفسرین نے کچھ اور قسمیں بھی بیان فرمائی ہیں، مثلاً حضری آیات اُن آیتوں کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں نازل ہوئیں، اور اکثر شرآنی آیات ایسی ہی ہیں، اور سفری آیات وہ ہیں جو سفر کی حالت میں نازل ہوئیں

لہٰذا اس لغو اعتراض کی باقاعدہ علمی تردید کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے، تاہم جو متاثرین اس نوعیت کے اعتراضات اور ان کے مفصل جواب کے لئے شیخ زرقانی رح کی منہاہل العرفان میں صفحہ ۱۹ تا ۲۳ ج ۱ کا مطالعہ فرمائیں،

مَثَلًا إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا فَإِذَا فَرَغْتُمْ مِنْ سَفَرٍ مِنْ أَتَرَىٰ
علامہ سیوطی نے اس قسم کی تقریباً چالیس آیتیں شمار کی ہیں اس کے علاوہ مندرجہ ذیل قسمیں بھی
انہوں نے ہی بیان فرمائی ہیں :-

(۱) نہاری : یہ وہ آیات ہیں جو دن کے وقت نازل ہوتی ہیں، بقول علامہ ابن حنیبلہ
اکثر آیات اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں،

(۲) لیلیٰ : یہ وہ آیات ہیں جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں، مثلاً سورۃ آل عمران کی
آخری آیات إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ
لِّأُولِي الْأَلْبَابِ رات کے وقت نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطی نے اس کی مزید
ایک درجن مثالیں اتقان میں ذکر کی ہیں،

(۳) صیفی : یہ وہ آیات ہیں جو گرمی کے موسم میں نازل ہوتی ہیں، مثلاً سورۃ نسا
کی آخری آیت يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ، صبحِ مسلم میں حضرت
عمرؓ کی روایت کے مطابق گرمی میں نازل ہوئی تھی، اور دوسری روایات سے یہ بھی ثابت
ہے کہ یہ آیتیں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع
کے موقع پر جنبی آیات نازل ہوتی ہیں وہ سب صیفی ہیں، مثلاً اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ
دِينَكُمْ وغیرہ،

(۴) ہشتائی : یہ وہ آیات ہیں جو سردی کے موسم میں اترتی ہیں، مثلاً سورۃ نور
کی آیات إِنَّ الْكَافِرِينَ جَاءُؤْا بِآلٍ فَكٍ، جن میں حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے
والوں کی تردید کی گئی ہے، سردی کے موسم میں نازل ہوتی تھیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں
خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اسی طرح غزوہ خندق کے بارے میں سورۃ احزاب
کی آیات بھی اسی قسم میں داخل ہیں، کیونکہ یہ غزوہ بھی سردی کے موسم میں ہوا تھا،
(۵) فراشی : یہ وہ آیات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت نازل

ہوئیں، جب آپ اپنے بستر پر تھے، چنانچہ آیت **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** (مائدہ: ۷۰) اسی حالت میں نازل ہوئی، علامہ سیوطیؒ نے اس کی دو مثالیں اور ذکر کی ہیں،

(۶) **نوحی** : بعض حضرات نے آیات کی ایک قسم ”نوحی“ بھی ذکر کی ہے، یعنی وہ آیات جو نیند کی حالت میں اُتریں، اور اس کی مثال میں صحیح مسلمؒ کی وہ روایت پیش کی ہے، جس میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ کو نیند کا ایک جھونکا آیا، پھر آپ نے بتسم فرماتے ہوئے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے سورۃ **اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكِتٰبَ تِلَاوٰتَ فَرَمٰی**،

لیکن محقق بات یہ ہے کہ نیند کی حالت میں آپ پر کوئی قرآنی آیت نازل نہیں ہوئی، ادھر کی روایت میں جس کیفیت کو ”نیند کے جھونکے“ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے اصل حدیث میں ”اغفارة“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور امام رافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد نیند نہیں، بلکہ وہ مخصوص حالت ہے جو آپ پر نزول وحی کے وقت طاری ہو جایا کرتی تھی، اس لئے اس حدیث سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ نزول قرآن نیند میں بھی ہوا ہے، علامہ سیوطیؒ نے بھی امام رافعیؒ کی تائید کی ہے،

(۷) **سماوی** : یعنی وہ آیات جو معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئیں، ان کے بارے میں صرف ایک صحیح مسلمؒ کی روایت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ بقرہ کی آخری آیات شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے قریب نازل ہوئیں۔

(۸) **فضائی** : علامہ ابن عربیؒ نے ایک قسم ایسی بھی ذکر کی ہے جو نہ زمین پر نازل ہوئی نہ آسمان پر، ان کا کہنا ہے کہ سورۃ صفات کی تین آیتیں **وَمَا مَثٰ اِلٰهَ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ اِلَّا اَنْزَلْنٰهُ** اور سورۃ زمر کی ایک آیت **وَاَنْزَلْنٰهُ مِنْ رَّبِّكَ** **مِنْ رُّسُلِنَا**، اسی قسم میں داخل ہیں، لیکن علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ اس کی

کوئی مسند نہیں مل سکی،

قرآن کریم کا تدریجی نزول؛

مجھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعہً اور کیا رگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تینیس سال میں اُتارا گیا۔ ہے بعض اوقات جبریل امین علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جز لے کر بھی تشریف لے آئے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ غُلُوْدِی الصَّمَدِ (نساء: ۹۴) ہے، جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورہ النعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے،

بعض حضرات کو ابن عساکرؒ کی ایک روایت سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام ایک مرتبہ میں پانچ سے زائد آیتیں نہیں لائے، لیکن علامہ سیوطیؒ نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نازل تو اس سے زائد آیتیں بھی ہوئی ہیں، مثلاً واقعہ افک میں بیک وقت دس آیتوں کا نزول صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جبریل امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ پانچ آیتیں یاد کرایا کرتے تھے، جب پانچ آیتیں یاد ہو جاتیں تو مزید آیتیں سُنا کر یاد کرا دیتے تھے، چنانچہ امام بیہقیؒ نے حضرت ابوالعابیہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی پانچ پانچ آیتیں سیکھا کرو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریل سے پانچ پانچ آیتیں ہی یاد کیا کرتے تھے، قرآن کریم کو یہ بارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آپ سے کیا تھا، کیونکہ وہ ایک قصیدہ پورا کا پورا ایک وقت میں سننے کے عادی تھے، اور یہ تدریجی نزول اُن کے لئے ایک

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ص ۱۲۲ ج ۲

۲۔ اس پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہوا الاتقان ص ۴۴ ج ۱، النوع السادس عشر، المسئلة الاولی

اچھی سی بات تھی، اس کے علاوہ تفسیر قرآن سے پہلے تورات، زبور، اور انجیل تینوں ایک ہی مرتبہ نازل ہو گئی تھیں، ان میں یہ تدریج کا طریقہ نہیں تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً
كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا وَلَا يَأْتِيَنَّكَ
يَسْتَشِيرُ إِلَٰهَهُ يَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ خُذْ بِكَ ثَمَرَاتِكَ وَالْخَنَازِيرُ
(الفقان ۳۲ و ۳۳)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر تفسیر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم اس کو رفتہ رفتہ پڑھلے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کا) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔“

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جرحمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس تدریجی نزول میں کئی حکمتیں تھیں:-

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی،

۲۔ اگر پورا تفسیر قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً شروع ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت میں ملحوظ رہی ہے،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلہ کو سہل بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا،

۴۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات

سے متعلق ہے، اس لئے ان آیات کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کے غیبی خبریں بیان کرنے سے اُس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی۔

ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب

یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا، بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی، ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کا تبیین وحی کو ساتھ ہی یہ بتا دیتے تھے، کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جائے، چنانچہ وہ آپؐ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی، ترتیب نزول کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ صحابہؓ نے، اس لئے جب قرآن مکمل ہو گیا، تو لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب سے نازل ہوئی تھی؟ لہذا اب جزوی طور پر بعض سورتوں یا آیتوں کے بارے میں تو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ان کی ترتیب کیا تھی؟ لیکن پورے قرآن کی ترتیب نزول یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی، علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں بعض روایات کی مدد سے سورتوں کی ترتیب نزول بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن درحقیقت ان

۱۔ التفسیر الکبیر للامام الرازیؒ، ص ۳۳۶ ج ۶، المطبعة العامہ ۱۳۲۴ھ

۲۔ الاتقان، نوع ۱ ص ۱۰ تا ۱۲ ج ۱، اندس کے ایک نامعلوم عالم کی ہیکٹا سکتا بالمبانی فی نظم المعانی کا ایک مخطوط نسخہ آرثر مہیض نے ”مقدمان فی علوم القرآن“ کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بھی ترتیب نزول کی مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں (مقدمان فی علوم القرآن، مرتبہ آرثر مہیض، مکتبہ النجفی مسر ۱۹۵۷ء ص ۱۶ تا ۱۷) مگر یہ روایات قابل اعتماد نہیں ہیں،

روایتوں سے یقینی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کونسی سورت کئی اور کونسی مدنی ہو؟ ترتیبِ نزول کی تفصیلات ان سے معلوم نہیں ہوتیں، ماضی قریب میں بعض مستشرقین نے بھی ترتیبِ نزول معین کرنے کی کوشش کی ہے، سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق فولڈریک نے اس کام کا آغاز کیا، اور اس کے بعد یہ بہت سے مغربی مصنفین کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا، ولیم میور نے بھی اس سلسلے میں ایک جداگانہ کوشش کی ہے، بلکہ جے ایم راڈویل نے قرآن کریم کا جوائنگریزی ترجمہ شائع کیا، اس میں سورتوں کو معروف ترتیب سے ذکر کرنے کے بجائے فولڈریک کی مزعومہ تاریخی ترتیب سے ذکر کیا، بیسویں صدی کے آغاز میں ہارٹ وگ ہرشفیلڈ نے نہ صرف سورتوں بلکہ آیتوں تک کی تاریخی ترتیب معین کرنے کی کوشش کی، اس کے علاوہ رجس بلاشیر نے اپنے فرانسیسی ترجمہ میں اس کام کا بیڑا اٹھایا، رجس ڈویل نے بھی اس سلسلے میں مغربی دنیا میں کافی نام پیدا کیا، مستشرقین کی یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں، اور شاید انہی سے متاثر ہو کر بعض مسلمانوں نے بھی ترتیبِ نزول کی تحقیق کرنی شروع کی ہے۔

لیکن ہماری نظر میں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف

Noldeke, Theodor, Geschichte des Qorans, Göttingen (1860) ۱۴

Muir, William, The Life of Mohammed ۱۴

Rodwell, J. M., The Koran (translated) London, 1935 ۱۴

Hirschfeld, Hartwig, New Researches into the composition and exegesis of the Qoran. (1902) ۱۴

Blachere, Regis, Coran traduction selon un essai de reclassement des sourates, Paris, 1947-51 ۱۴

Bell, Richard, Translation of The Quran (1937-39) ۱۴

۱۴ یعقوب حسن: کشف الہدی، ص ۷۵ تا ۸۲ اور نشر اشاعت مدراس اسلامیہ

کرنے کے مرادف ہیں جس میں کبھی یقینی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، مذکورہ بالا مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں وہ زیادہ تر متن کے بارے میں اُن کے ذاتی قیاسات پر مبنی ہیں اور چونکہ ہر شخص کے قیاسات دوسرے مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کی بیان کردہ ترتیبوں میں بھی فرق ہے، لہذا ہزار کوشش کے باوجود ان قیاسات سے کوئی خاص عملی فائدہ حاصل کرنا مشکل ہے،

دراصل مستشرقین کی ان کوششوں کے پیچھے ایک مخصوص ذہنیت کا رفاہ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم ابھی تک غیر مرتب ہو، اُس کی اصلی ترتیب وہ ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا، لیکن چونکہ نازل ہونے کے ساتھ اُسے کتابی شکل میں لکھنے کے بجائے متفرق چیزوں پر لکھا گیا اس لئے وہ ترتیب محفوظ نہ رہ سکی، راڈ ویل نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب متفرق تحریریں جمع کیں تو وہ انھیں جس ترتیب سے ساتھ ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے چلے گئے، لہذا اس میں کسی تاریخی یا معنوی ترتیب کا لحاظ نہیں رہ سکا، اب قرآن کریم کی موجودہ ترتیب اُن کے خیال میں (معاذ اللہ) ایک نقص ہے جسے وہ بزعیم خود اپنی ”تحقیق“ سے دور کرنا چاہتے ہیں، !!

حالانکہ واقعات کی یہ تصویر نہ صرف خیالی بلکہ واضح دلائل کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ آیات قرآنی کی ترتیب باتفاق وحی سے ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کا تبین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی، اور صحابہؓ نے قرآن کریم کو اسی ترتیب سے یاد کیا تھا، جو حضورؐ نے بتائی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت زیدؓ کو جس ترتیب سے آیتیں

ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے گئے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ قرآن میں سب سے آخری آیت **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَلَّىٰ عَلَىٰ نَبِيِّهِمْ** ہوتی چاہئے تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ کو یہ آیت سب سے آخر میں ملی، حالانکہ یہ آیت سورۃ احزاب میں درج ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت زیدؓ اور ان کے رفقاء کے سامنے جب کوئی آیت لائی جاتی تھی تو وہ اس کو اسی مقام پر لکھتے تھے جس مقام پر حضورؐ نے بتایا تھا، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اہل علم کی دو رائیں ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ بھی بذریعہ وحی بتائی گئی ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے معین کیا ہے، زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب تو بذریعہ وحی ہی بتادی گئی تھی، البتہ بعض سورتوں مثلاً سورۃ توبہ کے بارے میں کوئی صریح ہدایت موجود نہ تھی، اس لئے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے سورۃ انفال کے بعد رکھا ہے،

اسباب نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں ”سبب نزول“ یا ”مشان نزول“ کہلاتا ہے،

مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ہے:

لَا تَجْعَلُوا لِلْمُشْرِكِ شَيْئًا يُوَفِّيَنَّكُمْ وَكَأَمَّةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
مُّشْرِكٍ كَذِبٍ وَكَلَّا عَجَبْتُكُمْ، (بقرہ: ۲۲۱)

”مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں“ اور بلاشبہ ایک
”مومن کنیز ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو“

لے تفصیل کیلئے دیکھئے فتح الباری، ص ۳۲ تا ۳۵ ج ۹، باب تألیف القرآن،

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرشد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ کسی کام سے حضرت مرثدہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدہ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرثدہ نے حضورؐ سے نکاح کی اجازت طلب کی، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی،

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا سبب نزول "یا شان نزول" ہے،

شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد؛

بعض ایسے لوگوں نے جنھیں علم میں پختگی اور رسوخ حاصل نہیں ہے، اسباب نزول کی اہمیت سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم بذات خود اتنا واضح ہے کہ اس کی تشریح کے لئے اسباب نزول کو جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ خیال بالکل باطل اور غلط ہے، اسباب نزول کا علم تفسیر قرآن کے لئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کے فوائد بے شمار ہیں، جن میں سے چند یہاں بیان کئے جاتے ہیں؛

۱۔ علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اسباب نزول جاننے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں اور کیوں نازل فرمایا؟ مثلاً سورہ نساء میں ارشاد ہے :-

۱۔ الواحدیؒ؛ اسباب النزول، ص ۳۸، مصطفیٰ البابی، مصر ۱۳۹۰ھ

۲۔ زرکشیؒ؛ البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۲ ج ۱ عیسیٰ البابی ۱۳۷۶ھ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ،

”اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشیں ہو“

اگر شانِ نزول کی روایات سامنے نہ ہوں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب شراب از روئے قرآن بالکل حرام ہے تو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، اس سوال کا جواب صرف شانِ نزول ہی سے مل سکتا ہے، چنانچہ اس کے سببِ نزول میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کچھ صحابہؓ کو کھانے پر مدعو کیا، وہاں کھانے کے بعد شراب پی گئی، اسی حالت میں نماز کا وقت آگیا، تو ایک صحابی نے امامت کی، اور اُس میں نشے کی وجہ سے قرآنی آیات کی تلاوت میں غلطی کر گئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے

۲۔ بسا اوقات سببِ نزول کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، اور اگر سببِ نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہوگی :-

سورۃ بقرہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَبَيْنَهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ

”اور مشرق و مغرب اللہ ہی کی ہیں، پس جہرہ بھی تم رخ کر لو اُدھر

ہی اللہ کا رخ ہے“

اگر اس آیت کا شانِ نزول پیش نظر نہ ہو تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں کسی خاص جہت کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، مشرق و مغرب سب اللہ کی

۱۔ النساء : ۲۳ ،

۲۔ تفسیر ابن کثیرؒ، ص ۵۰۰، ج ۱، مطبعۃ مصطفیٰ محمد ۱۳۵۶ھ

۳۔ البقرہ : ۱۱۵ ،

ملکیت میں ہیں اور وہ ہر سمت میں موجود ہے، اس لئے جس طرف بھی رخ کر لیا جائے نماز ہو جائے گی، حالانکہ یہ مفہوم بدیہی طور پر غلط ہے، خود قرآن کریم ہی نے دوسرے مقام پر کعبہ کی طرف رخ کرنے کو ضروری قرار دیا ہے،

یہ عقیدہ صرف شانِ نزول کو دیکھ کر ہی حل ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہوا تو یہودیوں نے اعتراض کیا کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سمت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور اللہ ہر طرف موجود ہے، لہذا وہ جس طرف بھی رخ کرنے کا حکم دیدے، اُدھر رخ کرنا واجب ہے، اس میں قیاسات کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں،

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے :-

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا
طَعَنُوا إِذَا أَمَّا اتَّقَوْا أَوْ أَمَنُوا،

جو لوگ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اُن پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جسکو وہ کھاتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں؟

اگر اس آیت کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی بھی چیز کا کھانا پینا حرام نہیں، اگر دل میں ایمان اور خدا کا خوف ہو اور عمل نیک ہوں تو انسان جو چاہے کھاپی سکتا ہے، اور چونکہ یہ آیات تحریم شراب کے متصل بعد آئی ہیں، اس لئے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس آیت نے ایمان دار اور نیک لوگوں کے لئے (معاذ اللہ) شراب کی بھی اجازت دیدی ہے، اور یہ صرف شبہ اور احتمال نہیں ہے بعض صحابہؓ تک کو اس آیت سے غلط فہمی ہو گئی تھی، اور انھوں نے حضرت عمرؓ

کے سامنے اس آیت سے استدلال کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ شراب پینے والا اگر ماضی میں نکو کار رہا ہو اور اس کی عام زندگی نیکیوں میں گزری ہو تو اس پر حد (شرعی سزا) نہیں ہو بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے شان نزول ہی کے حوالہ سے اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کیا؛

درحقیقت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب اور قمار کی حرمت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ جو صحابہؓ حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے وفات پا گئے اور اپنی زندگی میں شراب نوشی اور قمار بازی کے مرتکب ہوئے اُن کا کیا انجام ہوگا؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جن مومنوں نے حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پی یا قمار مال کھایا اُن پر کوئی عذاب نہیں ہوگا، بشرطیکہ وہ مومن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دو حکم کے پابند رہے ہوں؛

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے، سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:-
 اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَسَّ
 الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَىٰ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّكُوْتَ بِهِمَا، ۱۵
 ”بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو کوئی
 بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ
 ان دونوں (صفا اور مروہ) میں چکر لگائے“

اس آیت کے یہ الفاظ کہ ”اس پر کچھ گناہ نہیں ہے“ ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج یا عمرہ کے دوران صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں، چنانچہ حضرت عروہ بن زبیرؓ اسی غلط فہمی میں تھے، حضرت عائشہؓ نے انہیں بتایا کہ درحقیقت زمانہ جاہلیت سے ان پہاڑیوں

۱۵ الفہم؛ الجامع لاحکام القرآن، ص ۲۹۷، ج ۶، قاہرہ ۱۳۸۵ھ
 ۱۶ ایضاً ص ۲۹۴، ج ۶، ۱۵، البقرہ، ص ۱۵۸،

پر دو بت رکھے ہوئے تھے، ایک کا نام اسات مخفا، دوسرے کا نالہ، اس لئے صحابہ کرامؓ کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں ان بتوں کی وجہ سے سعی کرنا ناجائز نہ ہو گیا ہو، اُن کا یہ اشکال رفع کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی: ۱؎

یہ چند مثالیں محض نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ورنہ ایسی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بہت سی آیتوں کا صحیح مفہوم سبب علم نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا،

۳۔ قرآن کریم بیا اوقات ایسے الفاظ استعمال فرماتا ہے جن کا شان نزول سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اور اگر ان کا صحیح پس منظر معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ (معاذ اللہ) بے فائدہ اور بعض اوقات بے جوڑ معلوم ہونے لگتے ہیں جس سے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت حریف آتا ہے،

مثلاً سورۃ طلاق میں ارشاد ہے :

وَاللَّائِي يَلْسَنَنَّ مِنَ الْمَحْضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنْ ارْتَبْتُمْ
فَعِدَّ لَكُمْ أَشَدُّ قَالًا لِلَّائِي كُنَّ يَحْضُنَّ،

”اور تمہاری وہ عورتیں جو حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور جن لڑکیوں کو ابھی حیض نہیں آیا اُن کی بھی“ ۲؎

اس آیت میں یہ الفاظ کہ ”اگر تم کو شک ہو“ ان کا بظاہر کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ بعض اہل ظاہر نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ اگر سن رسیدہ عورت کو جن کا حیض بند ہو چکا ہو حمل کے بارے میں کوئی شک نہ ہو تو اس پر کوئی عدت واجب نہیں ہے ۳؎

۱؎ منہل العرفان، ص ۱۰۴، ج ۱ بحوالہ صحیح بخاری

۲؎ الاتقان، ص ۳۰، ج ۱

۳؎ الطلاق: ۴

لیکن سبب نزول ان الفاظ کی وجہ بتانا ہے، حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۃ نساء میں عورتوں کی عدت بیان کی گئی تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کی عدت قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئی، ایک تو چھوٹی بچیاں جنہیں حیض نہیں آیا، دوسرے سن رسیدہ عورتیں جن کا حیض بند ہو گیا، اور تیسرے حاملہ عورتیں، اس پر آیت نازل ہوئی، اور اس میں تینوں قسموں کا حکم بیان کر دیا گیا،

یا مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے :-

فَاِذَا اقْتَضَيْتُمْ مِّنْا سَيِّسَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَاءَكُمْ

”پس جب تم افعال حج پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے اپنے آباء کو یاد کرتے ہو“

اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو اس آیت کا یہ حصہ کہ ”جیسے اپنے آباء کو یاد کرتے ہو“ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس خاص مقام پر اللہ کی یاد کو آباء و اجداد کی یاد سے تشبیہ دینے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن سبب نزول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مزدلفہ کے وقوف کا ذکر ہو رہا ہے، اور مشرکین عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد یہاں اپنے اپنے آباء و اجداد کے مفاحض اور کارنامے بیان کیا کرتے تھے، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اب یہاں باپ دادا کی شیخیاں بگھارنے کے بجائے اللہ کا ذکر کیا کرو،

۴۔ قرآن کریم میں ایسے مقامات بھی تھوڑے نہیں ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے، اور جب تک واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا مطلب سمجھا جاتا

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ص ۳۸۱ ج ۲، ۲۔ البقرہ: ۲۰۰،

۳۔ ملاحظہ ہو اسباب النزول للواحدی ص ۳۴،

نہیں جاسکتا، مثلاً ارشاد ہے :-

وَمَا دَعَمَيْتَ إِذْ دَعَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ دَعَمَانِي
”اور جس وقت آپ نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تو وہ آپ نے
نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی“

در اصل اس آیت میں عنبرۃ بدر کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے نرغے کے وقت خاک کی ایک مٹھی اُن کی طرف پھینکی تھی،
اور اس کے بعد نرغہ ٹوٹ گیا تھا، لیکن غور فرمائیے کہ اگر یہ سبب نزول ذہن میں ہو
تو آیت کا مطلب کیسے سمجھا جاسکتا ہے ؟

یہاں اسباب نزول کے تمام فوائد بیان کرنے مقصود نہیں لیکن مندرجہ بالا
مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ تشران کریم کی تفسیر میں اسباب
نزول کی کیا اہمیت ہے، اسی وجہ سے امام ہمدانی فرماتے ہیں :-

”جب تک آیت کا سبب نزول اور متعلقہ واقعہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک
آیت کا مفہوم بیان کرنا ممکن نہیں“

لہذا جن لوگوں نے تفسیر تشران کے معاملہ میں اسباب نزول کی اہمیت سے
انکار کیا ہے وہ یا تو ناواقف ہیں یا اسباب نزول سے آزاد ہو کر قرآن کے مضامین کو
اپنا من مانا مفہوم پہنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں،
اسباب نزول اور شاہ ولی اللہؒ ؛

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب
”الفوز البکیر“ میں اسباب نزول پر جو محققانہ بحث کی ہے بعض لوگ اُسے پوری طرح
سمجھ نہیں سکے، اس لئے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے، کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ
نے تفسیر میں اسباب نزول کو اہمیت نہیں دی، یا اس کی اہمیت کو کم کر دیا ہو لیکن

درحقیقت یہ خیال حضرت شاہ صاحبؒ کا مطلب نہ سمجھے کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جمہور امت کی طرح وہ بھی اسباب نزول کے علم کو تفسیر کے لئے لازمی شرط قرار دیتے ہیں، لیکن انھوں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے:-

وَيَذْكُرُ الْمَعْدُودُونَ فِي ذَوِيلِ آيَاتِ الْقُرْآنِ كَثِيرًا مِنْ الْأَمْثِيَاءِ
لَيْسَتْ مِنْ قِسْمِ سَبَبِ النُّزُولِ فِي الْحَقِيقَةِ مِثْلَ اسْتِشْهَادِ الصَّحَابَةِ
فِي مَنَاطِرِ أَهْلِ بَابِ أَوْتِلَاوَتِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةً لِلْإِسْتِشْهَادِ
فِي كَلَامِهِ الشَّرِيفِ أَوْ رَوَايَةِ حَدِيثٍ وَافِقٍ الْآيَةَ فِي أَصْلِ الْغَرَضِ
أَوْ تَعْيِينَ مَوْضِعِ النُّزُولِ أَوْ تَعْيِينَ أَسْمَاءِ الْمَذْكُورِينَ بِطَرِيقِ
الِإِيهَامِ أَوْ بِطَرِيقِ التَّلَفُظِ بِكَلِمَةٍ قُرْآنِيَةٍ أَوْ فَضْلِ سُورَةٍ أَوْ آيَةٍ
مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ صُورَةٍ أَوْ مِثَالِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَمْرٍ مِنْ
أَوَّلِ الْقُرْآنِ وَنَحْوِ ذَلِكَ، وَلَيْسَ شَيْءٌ مِنْ هَذَا فِي الْحَقِيقَةِ مِنْ
أَسْبَابِ النُّزُولِ ۝

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت بعض اوقات
دسیوں روایات لکھی ہوتی ہیں، یہ تمام روایات اسباب نزول سے متعلق نہیں ہوتیں
بلکہ اس میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہو جاتی ہیں:-

- ۱۔ بعض مرتبہ کسی علمی مباحثہ میں کسی صحابی نے وہ آیت بطور دلیل پیش کر دی مفسرین
یہ واقعہ اس آیت کے تحت ادنیٰ مناسبت سے ذکر کر دیتے ہیں،
- ۲۔ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر اس آیت سے استشہاد
فرمایا مفسرین اُسے بھی آیت کے تحت نقل کر دیتے ہیں،
- ۳۔ جو بات کسی آیت میں بیان کی گئی ہے بعض مرتبہ وہی بات کسی حدیث میں
بھی آپؐ نے ارشاد فرمائی، تفسیر کی کتابوں میں وہ حدیث بھی اس آیت کے

تحت روایت کر دی جاتی ہے،

۴۔ بعض مرتبہ مفسرین کوئی روایت محض یہ بتانے کے لئے نقل کرتے ہیں کہ آیت

کس مقام پر نازل ہوئی، یہ روایت بھی تفسیر کے ذیل میں درج ہو جاتی ہے،

۵۔ بعض دفعہ قرآن کریم کچھ لوگوں کا ذکر مبہم طور پر فرماتا ہے، اور ان کا نام ذکر

نہیں کرتا، مفسرین روایتوں کے ذریعہ ان لوگوں کے نام متعین کر دیتے ہیں،

۶۔ بعض مرتبہ کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں لفظ کا صحیح

تلفظ کیا ہے؟ تفسیر کی کتابوں میں ایسی روایات بھی درج ہوتی ہیں،

۷۔ بعض احادیث اور آیات میں قرآن کریم کی مختلف سورتوں یا آیتوں کے

فضائل بیان ہوئے ہیں مفسرین ان روایات کو بھی متعلقہ مقامات پر نقل

کر دیتے ہیں،

۸۔ بعض مقامات پر ایسی احادیث بھی تفسیر کے ذیل میں منقول ہیں جن سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے اس حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح

عمل فرمایا؟

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایات نہ سبب نزول کی تعریف

میں داخل ہیں اور نہ مفسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی تمام روایات سے

پوری طرح واقف ہو،

البتہ جو روایات واقعہ آیت کا سبب نزول ہیں ان کا جاننا مفسر کے لئے

ہمایت ضروری ہے، اور اس کے بغیر علم تفسیر میں دخل دینا جائز نہیں، چنانچہ

خود حضرت شاہ صاحب آگے لکھتے ہیں:-

وانما شرط المفسر امران، الاول ما تعرض به الايات من

القصص فلا يتيسر فهم الايماء بتلك الايات الالبصرة

تلك القصص، والثاني ما يخص العالم من القصة او مثل

ذلك من وجوه صرف الكلام عن الظاهر فلا يتيسر فهم

المقصود من الآيات بدونها،

”ابنہ مفسر کے لئے دو باتوں کا جانا لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، ایک تو وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے، اور جب تک وہ قصہ معلوم نہ ہوں آیات کے اشاروں کو سمجھنا آسان نہیں، دوسرے کسی قصہ وغیرہ میں بعض اوقات الفاظ عام ہوتے ہیں، لیکن شان نزول سے اس میں تخصیص پیدا ہوتی ہے، یا کلام کا ظاہری مفہوم کچھ ہوتا ہے اور سبب نزول کوئی دوسرا مفہوم متعین کرتا ہے، اس جیسی روایات کا علم حاصل کئے بغیر آیات قرآنی کو سمجھنا مشکل ہے۔“

سبب نزول اور احکام کا عموم و خصوص؛

کسی سبب نزول کے تحت قرآن کریم کی جو آیات نازل ہوئیں، وہ اپنے عموم و خصوص کے لحاظ سے چار قسم کی ہیں :-

۱۔ وہ آیتیں جن میں کسی خاص شخص کا نام لے کر یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ آیت کا مضمون اسی کے حق میں ہے، ایسی آیتوں کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ ان کا مضمون صرف اسی متعین شخص کے بارے میں قرار دیا جائے گا، اور وہ دوسروں کو شامل نہیں ہوگا، مثلاً

تَبَيَّنَ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

”اے لوگو! تمہارے دونوں ہاتھ ہلاک ہوں“

اس آیت کا شان نزول معروف ہے، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ فرمائی تو اس پر ابو لہب نے کہا تھا :-

تَبَيَّنَ لَكَ، اَيْلَهَ اَدَعُوْنَا؟

”تمہارے لئے ہلاکت ہو کیا تم نے ہمیں سی لئے بلایا تھا؟“

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس میں خاص ابوہب کا نام لے کر اس کے لئے وعید بیان فرمائی گئی ہے، اس لئے یہ وعید خاص اُسی کے لئے ہے،

۲۔ آیتوں کی دوسری قسم وہ ہے جن میں کسی خاص شخص یا گروہ یا چیز کا نام لئے بغیر اس کے کچھ اوصاف بیان کئے گئے ہیں اور ان اوصاف پر کوئی حکم لگایا گیا ہے، لیکن دوسرے دلائل سے یہ ثابت ہو کہ اس سے مراد فلاں معین شخص یا فلاں معین گروہ یا فلاں معین چیز ہے، اس صورت کے بارے میں بھی تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ آیت کا مضمون یا حکم صرف اسی شخص یا گروہ یا چیز کی حد تک مخصوص رہے گا، جو قرآن کریم کی مراد ہو اور کوئی دوسرا اس میں داخل نہیں ہوگا، خواہ وہ اوصاف اس میں بھی پائے جاتے ہوں مثلاً سورۃ اللیل میں ارشاد ہے :-

وَسَيَجْزِيَنَّهَا الَّذِي نَفَقَىٰ إِلَىٰ مَالِهِ يَتَذَكَّرُ (اللیل: ۱۸-۱۷)

اور اُس (راگ) سے وہ متقی ترین شخص بچا لیا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کی غرض سے (مستحقین کو) دیتا ہے،

یہ آیت باتفاق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہو جو مفلس غلاموں کو خرید کر آزاد کیا کرتے تھے، یہاں اگرچہ حضرت ابو بکرؓ کا نام مذکور نہیں، لیکن اوصاف انہی کے بیان کئے گئے ہیں، اور روایات حدیث سے ثابت ہے کہ ان سے مراد حضرت ابو بکرؓ ہیں، لہذا اس آیت کی فضیلت بلا شرکت غیرے انہی کو حاصل ہے، اسی لئے امام رازیؒ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں کیونکہ اس آیت میں انھیں اَنَّفَقَ (متقی ترین شخص) کہا گیا ہے، اور دوسری آیت میں ارشاد ہے :-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)

بلاشبہ تم میں سب سے زیادہ قابلِ اکرام شخص وہ ہو جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

۱۔ اسباب النزول للواحدی، ص ۲۶۱، ۲۔ ایضاً ص ۲۵۵، ۳۔ الاتقان ص ۳۱ ج ۱

بہر حال باوجودیکہ حضرت ابو بکرؓ کا یہاں نام نہیں لیا گیا، لیکن جہو مفسرین نے آیت کو انہی کے حق میں خاص قرار دیا ہے، کیونکہ تخصیص کی دو دلیلیں موجود ہیں (ایک یہ کہ ”الاتقی“ کا لفظ (الف لام عہد کے ساتھ) صرف ایک ہی شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، دوسرے روایات حدیث نے اُن کی تعیین کر دی ہے، لہذا اگر کوئی اور شخص بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں حشر چ کرنے لگے تو وہ اس کے لئے کتنا ہی باعث اجر کیوں نہ ہو لیکن آیت بالا کا مصداق ہونے کی فضیلت اسے حاصل نہیں ہو سکتی یہ

۳۔ تیسری قسم میں وہ آیتیں آتی ہیں جو نازل تو کسی خاص واقعہ میں ہوئی تھیں لیکن الفاظ عام ہیں، آیت کے صریح الفاظ یا اور کسی خارجی دلیل سے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے، کہ آیت کا حکم اس واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس نوعیت کے ہر واقعہ کا یہی حکم ہے، اس قسم کے بارے میں بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ اس صورت میں آیت کا حکم اس کے الفاظ کے تابع ہو کر عام رہے گا، صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہوگا، مثلاً سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ حضرت خولہؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں، جن کے شوہر نے اُن سے یہ کہہ دیا تھا کہ اَنْتِ عَلٰی كَظْمٍ رَاحٍ (تم مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہو) لیکن آیت میں جن الفاظ کے ذریعہ حکم بیان کیا گیا وہ اس بات کی صراحت کر رہے ہیں کہ یہ حکم صرف خولہؓ کے شوہر کے لئے نہیں، بلکہ تمام ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی بیوی سے ظہار کر لیں، (یعنی مذکورہ بالا الفاظ کہیں) (ایسے تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے قبل ایک غلام آزاد کریں، یا نساٹھ روزے رکھیں یا نساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں)

۴۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ آیت کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی، لیکن الفاظ

۱۔ لہ اس قسم کی مزید تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان ص ۳۰ ج ۱
۲۔ اسباب النزول للواحیدی، ص ۲۳۱

عام استعمال کئے گئے، اور آیت یا کسی خارجی دلیل سے یہ صراحت معلوم نہیں ہوتی کہ آیت کا حکم یا مضمون صرف اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، یا اس نوعیت کے ہر واقعہ کے لئے عام ہے، اس صورت میں اہل علم کا تھوڑا سا اختلاف رہا ہے، بعض حضرات کا کہنا یہ تھا کہ اس صورت میں آیت کو صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ مخصوص رکھا جائے۔ لیکن جمہور علماء و فقہاء کی رائے اس کے برخلاف یہی ہے کہ مذکورہ شکل میں سبب نزول کے خاص واقعے کے بجائے الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا، اور آیت کے الفاظ جس جس صورت کو شامل ہوں ان کا حکم بھی ان سب پر نافذ کیا جائے گا، اس قاعدہ کے لئے علماء اصول فقہ و تفسیر میں یہ جملہ مشہور ہے کہ :-

اَلْعَبْرَةُ لِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوصِ السَّبَبِ

”اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سبب نزول کے خاص واقعہ کا“

لیکن درحقیقت یہ اختلاف نظریاتی نوعیت کا ہے، عملاً اس سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، کیونکہ جو حضرات آیات قرآنی کو ان کے سبب نزول کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں وہ بھی عملاً آیت کا حکم اُس نوعیت کے دوسرے واقعات میں جاری کر دیتے ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک تو اس حکم کا ماخذ ہی آیت ہوتی ہے، اور یہ حضرات اس کا ماخذ کسی دوسری دلیل شرعی مثلاً حدیث اجماع یا قیاس وغیرہ کو قرار دیتے ہیں،

وضاحت کے لئے ایک مثال پر غور فرمائیے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے :-

وَ اِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مٰیْسَرَةٍ

”اور اگر (قرض دار) تنگ دست ہو تو اسے کشادگی تک مہلت دید“

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بنو عمر و بن عمر کا کچھ قرض بنو مغیرہ پر واجب تھا، جب سود کی حرمت نازل ہوئی تو بنو عمر و نے اپنے مقرض قبیلے سے کہا کہ ہم سود تو چھوڑتے ہیں لیکن اصل قرضہ واپس کرو، بنو مغیرہ نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہاتھ تنگ ہے، اس لئے ہمیں کچھ مہلت دیدو، بنو عمر و نے مہلت دینے سے انکار کیا تو اس پر یہ

آیت نازل ہوئی،^۱

اب آیت کا یہ حکم تو سب کے نزدیک عام ہے، ہر قرص خواہ کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ مقروض کو تنگ دست دیکھے تو اسے ہمت دیدے، لیکن فرق اتنا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ عام حکم اسی آیت سے ثابت ہوا ہے، اور جو لوگ آیت کو سبب نزول کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں، کہ آیت کا حکم تو صرف بنو عمر کے لئے تھا، لیکن دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ حکم اُن احادیث سے ثابت ہوا ہے جس میں مقترض کو ہمت دینے کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں،

اس سے واضح ہے کہ اس اختلاف کا عملی طور پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا^۲

سبب نزول اور اختلاف روایات ؛

اسباب نزول کے سلسلے میں تفسیر کے دوران ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کئی کئی مختلف روایتیں ملتی ہیں، اور جو شخص تفسیر کے اصول سے واقف نہ ہو وہ اُلجھن اور طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے یہاں اس اختلاف روایت کی حقیقت سمجھ لینى ضروری ہے،

اصول تفسیر اور اصول فقہ کے علماء نے اس سلسلے میں بڑے کارآمد قواعد بیان فرمائے ہیں، یہاں اُن کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے :-

۱۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر میں یہ الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ نزولت الایۃ فی کذا ۱ (یہ آیت فلاں مسئلہ یا معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی) ان الفاظ سے بظاہر یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ آیت کا سبب نزول بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ ان الفاظ سے اُن کا مقصد ہمیشہ سبب نزول بیان کرنا نہیں ہوتا

۱۔ اسباب النزول، للواحدی، ص ۱۵

۲۔ یہاں اس مسئلہ کا نہایت مختصر خلاصہ پیش کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، البرہان

للمرکشی ص ۲۳ ج ۱، والاتقان ص ۳۰ ج ۱ و مناہل العرفان ص ۸۸ تا ص ۱۲۴ ج ۱،

بلکہ بسا اوقات اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ یا معاملہ آیت کے حکم کے تحت داخل ہے مثلاً سورہ نسا میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا یہ قول نقل فرمایا ہے :-

وَلَا مَرْتَبَ لَهُمْ فَلَیْغَیْبُونَ خَلْقَ اللّٰهِ

”اور نہ، ان انسانوں کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق

کو بدل ڈالیں گے“ (النساء: ۱۱۸)

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عکرمہؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ یہ آیت اختصار (خصمتین نکلا دینے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد رسالت میں کسی نے خصمتین نکلا دیئے تھے، اور یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اختصار کا عمل بھی اُنہی شیطانی افعال میں داخل ہے جنہیں شیطان نے اللہ کی تخلیق بدل ڈالنے سے تعبیر کیا ہے، ورنہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی تخلیق کو بدل دینا، اختصار میں منحصر ہے بلکہ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جن کی تفصیل کتب تفسیر میں موجود ہے، صحابہؓ و تابعینؓ کا یہ اسلوب بیان معلوم ہونے سے شان نزول کے باب میں دو قاعدے واضح ہوتے ہیں :-

(الف) ایک قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو مختلف روایتیں ہوں، دونوں میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہوں کہ نَزَلَتْ الْاٰیَةُ فِيْ كَذَا رَیَہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی، لیکن دونوں نے الگ الگ معاملات ذکر کئے ہوں تو درحقیقت دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مقصد بھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ آیت کا سبب نزول ہے، بلکہ منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ آیت کے مفہوم اور حکم میں داخل ہے

۱۔ ابن تیمیہ: مقدمۃ فی اصول تفسیر، ص ۹، المکتبۃ العلمیۃ لاہور، ۱۳۸۷ھ والاقتان

۲۔ البیہقی: الدر المنثور، ص ۲۲۳ ج ۲،

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، باری تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

تَجَانِيْ الْجُنُوْبُ مِنْهُمْ عَنِ الْمَصَاجِعِ

”اُن کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں“

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اُن صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی جو مغرب اور عشاء کے درمیان نفلیں پڑھتے رہتے تھے، ایک اور روایت میں انہی سے مروی ہے کہ یہ آیت اُن حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نماز عشاء کے انتظار میں جاگتے رہتے تھے، اور بعض دوسرے صحابہؓ اسے تہجد گزار حضرات کے بارے میں قرار دیتے ہیں، اب بظاہر یہ اختلاف شانِ نزول کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ آیت کے مختلف مصداق ہیں، اور یہ تمام نیک اعمال آیت کے مفہوم میں داخل ہیں،

(ب) دوسرا قاعدہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو روایتیں ہوں، ایک میں نزلت الایۃ فی کن ا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اور دوسری میں صراحت کسی واقعہ کو آیت کا سببِ نزول قرار دیا گیا ہو، تو اس دوسری روایت پر اعتماد کیا جائے گا، اور پہلی روایت چونکہ شانِ نزول کے مفہوم میں صریح نہیں ہے اس لئے اسے راوی کے اپنے اجتہاد و استنباط پر محمول کیا جائے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

رَسَاؤُكُمْ حَرَّتْ لَكُمْ فَاَتَوْا حَرَّكُمْ اَنَّى شِئْتُمْ

”تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتی میں آؤ جہاں

چاہو“ (البقرہ: ۲۲۳)

۱۔ الم سجدہ: ۱۶،

۲۔ ابن جریرؒ: تفسیر جامع البیان، ص ۵۸۵ ج ۲، میمنہ، مصر،

اس آیت کے بارے میں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ
 اُنزلت فی ایتان النساء فی ابدارھنؓؑ یہ آیت عورتوں کے ساتھ پشت میں رحمت
 کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے (لیکن حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 وغیرہ اس کا سبب نزول صراحتاً یہ بتاتے ہیں کہ یہودیوں کا خیال یہ تھا کہ اگر مباشرت
 پیچھے کی جانب سے اگلے ہی حصّہ میں کی جائے تو اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے، اس کی تردید
 کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے یہ واضح کر دیا کہ مباشرت کی جگہ تو ایک ہی ہے،
 (یعنی اگلا حصّہ) جس سے اولاد پیدا ہو سکے، لیکن اس کے لئے راستہ کوئی بھی اختیار
 کیا جاسکتا ہےؓؑ

ان دونوں روایتوں میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت چونکہ
 مفصل اور صریح ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی، اور حضرت ابن عمرؓ کے قول کو ان کا
 استنباط قرار دیا جائے گاؓؑ اور درحقیقت اُن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشت میں صحبت
 کرنا اس آیت کی رُو سے جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ
 لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں عورت کو کھینتی یعنی پیدائش
 اولاد کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور وہ لواطت میں ممکن نہیں)۔

۲۔ سبب نزول متعین کرنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر ایک روایت
 صحیح سند کے ساتھ آئی ہو اور دوسری ضعیف یا مخرج سند کے ساتھ تو صحیح روایت
 کو اختیار کر لیا جائے گا اور ضعیف کو ترک کر دیا جائے گا، مثلاً سورہ ضحیٰ کی ابتدائی
 آیات ہیں:-

وَالضُّحٰی، وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی، مَا وَدَّعَکَ
 رَبُّکَ وَمَا قَلٰی،

۱۔ الاتقان، ص ۳۲ ج ۱، ۲۔ اسباب النزول للواحدی ص ۴۰ ج ۱،

۳۔ الاتقان، ص ۳۲ ج ۱، ۴۔ منہل العرفان، ص ۱۰۸ ج ۱،

قسم و قسم چاشت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے کہ آپ کے
پر درنگار نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ خفا ہوا ہے»

اس آیت کے شان نزول میں بخاری، مسلم نے حضرت جندبہ کی یہ روایت
ذکر کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی تکلیف کی وجہ سے ایک یا دو راتیں
(تہجد کی) نماز نہ پڑھ سکے، اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ
تمھارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں،
دوسری طرططی ۲ اور ابن ابی شیبہ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولہ سے
(جو حضور کی خادمہ تھیں) یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک گتے کا پلا حضور
کے گھر میں آکر چار پائی کے نیچے بیٹھ گیا، اور وہیں اسے موت آگئی، اس واقعہ کے
بعد چار دن تک آپ پر وحی نازل نہ ہوئی، آپ نے مجھ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے
گھر میں ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو جبریلؑ میرے پاس نہیں آ رہے، میں نے دل میں
کہا کہ مجھے گھر میں جھاڑ پونچھ کرنی چاہیے، چنانچہ میں نے جھاڑ چار پائی کے نیچے مار کر
صفائی کی تو پلا نکل آیا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں،

لیکن یہ دوسری روایت سنداً صحیح نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے
فرمایا کہ اس کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں، لہذا قابل اعتماد شان نزول دہی ہو
جو صحیح بخاری میں مروی ہے،

۳۔ بعض مرتبہ شان نزول کی دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں،
لیکن کسی ایک روایت کے حق میں کوئی وجہ ترجیح پائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ ایک کی
سند دوسری کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہے، یا ایک کا راوی ایسا ہے جو واقعہ
کے وقت موجود تھا اور دوسری روایت کا راوی واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا،
ایسی صورت میں اس روایت کو اختیار کیا جائے گا جس کے حق میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

اس کی مثال سورہ اسرار کی یہ آیت ہے :-

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

”یہ آپ سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ رُوح میرے پروردگار کے امر سے ہے، اور تمہیں نہیں دیا گیا علم کا حصہ مگر تھوڑا“

اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت تو امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا اور آپؐ کھجور کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے، اتنے میں آپؐ کا گذر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ ان (حنوڑ) سے کچھ سوالات کرنے چاہئیں، چنانچہ انہوں نے آکر آپؐ سے کہا کہ: ہمیں رُوح کے بارے میں بتائیے، اس پر آپؐ رک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپؐ نے سر اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا، کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر آپؐ نے فرمایا قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي الخ دوسری روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ قریش مکہ نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان صاحبِ رحمہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ سکیں، اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے رُوح کے بارے میں سوال کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا، سند کے اعتبار سے بھی دونوں روایتیں صحیح ہیں، لیکن پہلی روایت کے حق میں یہ وجہ ترجیح موجود ہے کہ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس واقعہ کے وقت خود موجود تھے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خود اس واقعہ کے وقت حاضر ہوں، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت قابل ترجیح ہے۔

۴، بعض مرتبہ ایک آیت کے اسبابِ نزول ایک سے زائد ہوتے ہیں، یعنی ایک جیسے کئی واقعات یکے بعد دیگرے پیش آتے ہیں، اور ان سب کے بعد آیت نازل ہوتی ہے، اب کوئی راوی اس آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ ذکر کرتا ہے، اور دوسرا کوئی اور واقعہ ذکر کرتا ہے، بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت تعارض نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں ہی واقعات سببِ نزول ہوتے ہیں، مثلاً سورۃ نور کی آیاتِ لعان کے بارے میں امام بخاریؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہلال بن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ الْخِيفَةُ، دوسری طرف امام بخاریؒ ہی نے ایک اور روایت حضرت سہل بن سعدؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت عویمیرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ ملوث دیکھے اور اس شخص کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص لیا جائے گا؟ ایسے شخص کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمھارے بارے میں قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں، اولاً پھر ہی آیات آپؐ نے سنائیں، تیسری طرف مسندِ تراز میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ اسی قسم کا سوال وجواب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان ہوا تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں،

واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں واقعات ان آیات کے نزول سے قبل پیش آچکے تھے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کو سببِ نزول قرار دینا درست ہے،

۵۔ بعض اوقات اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ہوتا ہے، مگر اس کے سبب سے کئی آیتیں نازل ہو جاتی ہیں، اب ایک راوی اس واقعہ کو نقل کر کے کہتا ہے کہ اس پر فلاں آیت نازل ہوئی، اور دوسرا اسی واقعہ کو نقل کر کے

کسی دوسری آیت کا حوالہ دیتا ہے، اس سے بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا،

اس کی مثال یہ ہے کہ امام ترمذیؒ اور حاکمؒ نے حضرت اُمّ سلمہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، قرآن کریم میں ہجرت وغیرہ کے باب میں مجھے عورتوں کا ذکر نہیں ملتا، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّیْ لَا اُصْنِعُ عَمَلًا غَامِلًا
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی، (ال عمران: ۱۹۵)

”پس اُن کے رب نے اُن کی دعاؤں کو قبول کر لیا، اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہوا کرتا نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت“

اور امام حاکمؒ نے حضرت اُمّ سلمہؓ ہی سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، قرآن کریم میں مردوں ہی کا ذکر ہے، عورتوں کا کہیں تذکرہ نہیں، اس پر ایک آیت نوازل ہوئی: اَلْمُسْلِمٰتُ وَالْمُسْلِمٰتُ اَلْمُحْزَنٰتُ اَلْمُحْزَنٰتُ اَلْمُحْزَنٰتُ اَلْمُحْزَنٰتُ اور دوسری آیت: لَا اُصْنِعُ عَمَلًا غَامِلًا مِّنْكُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی اِلَیْہِ تکرارِ نزول اور اس کی حقیقت؛

۶۔ چھٹی صورت تکرارِ نزول کی ہے، یعنی بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی آیت ایک سے زائد مرتبہ نازل ہوئی، اور ہر مرتبہ اس کا نزول کسی نئے واقعہ کے پس منظر میں ہوا، اب کسی راوی نے ایک نزول کا واقعہ ذکر کر دیا، اور کسی نے دوسرے نزول کا، اس سے ظاہری طور پر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں تضاد اس لئے نہیں ہوتا کہ آیت دونوں واقعات میں دونوں مرتبہ نازل ہوئی،

۷۔ یہ سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ ہے، اور اس میں بہت سے اعمالِ صالحہ کا ذکر کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں دونوں کا الگ الگ نام لیا گیا ہے، لے اتفاقاً ص ۳۵ ج ۱،

مثلاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ چچا جان! آپ لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی سفارش کر دوں گا، اس وقت ابو جہل اور عبد اللہ ابن امیہ بھی موجود تھے، انھوں نے ابوطالب کو ایمان کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو فوراً بولے: ”کیا تم عبد المطلب کے دین سے برگشتہ ہونا چاہتے ہو؟“ اس کے بعد وہ دونوں بولتے ہی رہے، یہاں تک کہ ابوطالب یہ کہہ اٹھے کہ: ”میں عبد المطلب ہی کے دین پر ہوں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا، جب تک کہ مجھے اس سے روک نہ دیا جائے“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ

”نبی کو اور مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے

مغفرت طلب کریں“

دوسری طرف امام ترمذیؒ نے حضرت علیؓ سے بسندِ حسن نقل کیا ہے کہ میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لئے استغفار کرتے سنا، میں نے اس سے کہا کہ تمھارا والدین تو مشرک تھے، ان کے لئے استغفار کیسے کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے والد کے لئے استغفار کیا تھا، حالانکہ اُن کے والد بھی مشرک تھے، یہ بات میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو اُس پر یہ آیت نازل ہوئی،

تیسری طرف امام حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن قبرستانِ شریف لے گئے، اور ایک قبر کے پاس بیٹھ کر دیر تک مناجات کرتے اور روتے رہے، پھر فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا تھا وہ میری والدہ کی قبر تھی، میں نے اپنے پروردگار سے اُن کے لئے دعا کرنی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں ملی، اور یہ آیت نازل ہوئی، مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا،

یہاں تینوں واقعات میں ایک ہی آیت کا نزول بیان کیا گیا ہے، چنانچہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت تینوں مرتبہ الگ الگ نازل ہوئی ہے، اب یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب ایک آیت ایک مرتبہ نازل ہو چکی، اُسے لکھ کر محفوظ کر لیا گیا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہؓ کو یاد ہو گئی تو پھر دوبارہ اور بارہ اُسے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا بہترین جواب حضرات، شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، اور وہ یہ کہ ”تکرار نزول“ کی مذکورہ بالا صورت میں آیت کا اصلی نزول تو ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے، لیکن وہ آیت جس واقعہ میں نازل ہوئی تھی، جب اُسی جیسا کوئی اور واقعہ پیش آتا ہے تو وہی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں دوبارہ ڈال دی جاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں بھی اسی آیت سے رہنمائی ملے گی، یہ آیت کا قلب مبارک میں مستحضر ہو جانا چونکہ منجانب اللہ ہوتا ہے، اس لئے یہ وہی ”نفت فی الرّوع“ ہے جو وحی کی ایک قسم ہے، اور جس کا مفصل بیان وحی کے طریقوں میں پیچھے گذر چکا ہے، اسی کو مفسرین ”نزول مکرّر“ سے تعبیر فرمادیتے ہیں، گویا جتنی مرتبہ وہ آیت قلب میں منجانب اللہ وارد ہوئی، اتنی ہی مرتبہ اس کا نزول ہوا،

اسباب نزول کے سلسلے میں روایات کے اندر جو تعارض یا اختلاف ہوتا ہو وہ مذکورہ بالا چھ اصولوں کے تحت عموماً باآسانی دُور ہو جاتا ہے، اور یہ چھ اصول ذہن میں رہیں تو اختلاف روایات کی صورت میں اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔

۱۔ یہ مثال الاتقان ج ۱ ص ۳۴ سے ماخوذ ہے، لیکن یہ اس تقدیر پر ہے کہ تینوں روایات کو صحیح قرار دیا جائے۔ ورنہ تیسری روایت کی صحت میں کلام ہو، چنانچہ حافظ ذہبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ”قلت ابو بن ہانی ضعف ابن عیین“ (مستدرک ص ۳۳۶ ج ۲) اور ابوب بن ہانی کے باری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جرح و تعدیل کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ص ۴۱۴ ج ۱) لہذا تو اس روایت کو موضوع کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کو عقیدہ کے کسی نازک مسئلہ کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، چنانچہ اہل سنت کی ایک بڑی جماعت بہت سے دلائل کی بنیاد پر اس بات کی قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ملتِ ابراہیمی پر فوت ہوئی کی بناء پر مؤمن شخص، خود علامہ سیوطیؒ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ

قرآن کے سات حروف

ایک صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-
 اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ
 فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ

یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس اُس میں
 جو تمھارے لئے آسان ہو اُس طریقے سے پڑھ لو۔

اس حدیث میں قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟
 یہ بڑی معرکہ الآراء و طویل الذیل بحث ہے، اور بلاشبہ علوم قرآن کے
 مشکل ترین مباحث میں سے ہے، یہاں یہ پوری بحث تو نقل کرنا مشکل ہے، لیکن
 اس کے متعلق ضروری ضروری باتیں پیش خدمت ہیں :-

جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور
 محدث امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اُس کے تواتر کی تصریح کی ہے، اور

حدیث و قرأت کے معروف امام علامہ ابن الجزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کئے ہیں، اور اُن کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر بن خطابؓ، ہشام بن حکیم بن حزامؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، ابی بن کعبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابو ہریرہؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابوبکرؓ، عمرو بن عاصؓ، زید بن ارقمؓ، انس بن مالکؓ، سمرہ بن جندبؓ، عمر بن ابی سلمہؓ، ابو جہمؓ، ابو طلحہؓ اور اُمّ ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے، اس کے علاوہ متعدد محدثین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ممبر پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہو کہ :-

”قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے“

چنانچہ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی جسے شمار نہیں کیا جاسکا، ۱۔

حُرُوفِ سَبْعہ کا مفہوم | اس حدیث میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سات حروف سلسلے میں آراء و نظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے، یہاں تک کہ علامہ ابن عربیؒ وغیرہ نے اس باب میں پینتیس اقوال شمار کئے ہیں، یہاں اُن میں سے چند مشہور اقوال پیش خدمت ہیں :-

۱۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراتیں ہیں، لیکن یہ خیال تو بالکل غلط اور باطل ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متواتر قراتیں ان سات قراءتوں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اور بھی متعدد قراتیں تواتر کے ساتھ ثابت

۱۔ ابن الجزریؒ: النشر فی القراءات العشر، ص ۲۱، ج ۱ دمشق ۱۳۲۵ھ
۲۔ ایضاً،

۳۔ الترکبۃ: البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۱۲، ج ۱

ہیں، یہ سات قرأتیں تو محض اس لئے مشہور ہو گئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قرات کی قرأتیں جمع کر دی تھیں، نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ قرأتیں سات میں منحصر ہیں، اور نہ وہ حروف سبعہ کی تشریح ان سات قراتوں سے کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی،

۲۔ اسی بناء پر بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حروف سے مراد تمام قراتیں ہیں، لیکن ”سات“ کے لفظ سے سات کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے، اور عربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لئے اکثر استعمال ہو جاتا ہے، یہاں بھی حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم ”بہت سے“ طریقوں سے نازل ہوا ہے، علماء متقدمین میں سے قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہو، اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے،

لیکن یہ قول اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہو کہ:-
 اقرأنی جبریل علی حرف فراجعتہ، فلم ازل استزیہ
 ویزیدنی حتی انتھی الی سبعة احرفؓ
 ”مجھے جبریل علیہ السلام نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا، اور وہ (قرآن کریم کے حروف میں) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے“

۱۔ اوجز المسالك الى موطاء الامام مالكؒ، ص ۵۶ ج ۲ مطبوعہ سہارنپور ۱۳۵۵ھ
 ۲۔ مصنفی شرح موطاء ص ۸۷ ج ۱ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۹۳ھ
 ۳۔ بحوالہ مناهل العرفان، ص ۱۳۳ ج ۱،

اسی کی تفصیل صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت ابی بن کعبؓ سے اس طرح مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو غفار کے تالاب کے پاس تھے:-

فَاتَاهُ جِبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ
أَنْ تَقْرَأَ أَمْتِكَ الْقُرْآنَ عَلَى حُرُوفٍ، فَقَالَ أَسْأَلُ اللَّهَ
مَعَاذَاتِهِ وَمَغْفِرَتِهِ وَإِنْ أَمَتِي لَا تَطِيقُ ذَلِكَ، ثُمَّ أَتَاهُ
الثَّانِيَةُ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَقْرَأَ أَمْتِكَ الْقُرْآنَ
عَلَى حُرُوفَيْنِ فَقَالَ أَسْأَلُ اللَّهَ مَعَاذَاتِهِ وَمَغْفِرَتِهِ وَ
أَنْ أَمَتِي لَا تَطِيقُ ذَلِكَ، ثُمَّ جَاءَتْهُ الثَّلَاثَةُ فَقَالَ
إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَقْرَأَ أَمْتِكَ الْقُرْآنَ عَلَى ثَلَاثَةِ
أَحْرَفٍ فَقَالَ أَسْأَلُ اللَّهَ مَعَاذَاتِهِ وَمَغْفِرَتِهِ وَإِنْ
أَمَتِي لَا تَطِيقُ ذَلِكَ، ثُمَّ جَاءَتْهُ الرَّابِعَةُ فَقَالَ: إِنَّ
اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَقْرَأَ أَمْتِكَ الْقُرْآنَ عَلَى سَبْعَةِ
أَحْرَفٍ فَأَيُّهَا حُرُوفُ قُرْءٍ وَأَعْلِيهِ فَقَدْ أَصَابُوا عَلَيْهِ
”پس حضورؐ کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ اللہ نے
آپؐ کو یہ بھم دیا ہے کہ آپؐ کی (ساری) اُمت قرآن کریم کو ایک
ہی حرف پر پڑھے، اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور
مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے،
پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے، اور فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمت قرآن کریم کو
دو حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور
مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے،

پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قرأت درست ہوگی۔

ان روایات کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ یہاں سات سے مراد محض کثرت نہیں، بلکہ سات کا مخصوص عدد ہے، اس لئے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ جمہور نے اس کی تردید کی ہے، بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن جریر طبریؒ نے وغیرہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، چونکہ اہل عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے قبیلہ سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی، اور یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی با میں علاقائی طور پر تھوڑے تھوڑے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی آسانی کے لئے قرآن کریم سات لغات پر نازل فرمایا، تاکہ ہر قبیلہ اُسے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے، امام ابو حاتمؒ رحمہ اللہ نے ان قبائل کے نام بھی معین کر کے بتا دیئے ہیں، اور فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان سات قبائل کی لغات پر نازل ہوا ہے: قریش، ہذیل، تیمم الزباب، ازد، ربیعہ، ہوازن اور سعد بن بکر، اور حافظ ابن عبد البرؒ نے بعض حضرات سے نقل کر کے اُن کی جگہ یہ قبائل بتائے ہیں: ہذیل، کنانہ، قیس، ضبہ، تیمم الزباب، اسد بن خزیمہ اور قریشؒ۔

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبد البر، علامہ سیوطیؒ اور علامہ ابن الجوزیؒ وغیرہ نے اس قول کی بھی تردید کی ہے، اول تو اس لئے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے، ان میں سے صرف ان سات کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے درمیان قرآن کریم کی تلاوت میں اختلاف ہوا جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاریؒ وغیرہ میں مروی ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرات قریشی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصدیق فرمائی، اور وجہ یہ بتائی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اگر سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہوتیں تو حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ دونوں قریشی تھے، اگرچہ علامہ آوسیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ کسی اور لغت پر قرآن پڑھایا ہو، لیکن یہ جواب کمزور ہے، کیونکہ مختلف لغات میں قرآن کریم کے نازل ہونے کا منشاء یہی تو تھا کہ ہر قبیلہ والا اپنی لغت کے مطابق آسانی سے اُس کو پڑھ سکے، اس لئے یہ بات حکمت رسالت سے بعید معلوم ہوتی ہے، کہ ایک قریشی کو دوسری لغت پر قرآن کریم پڑھایا گیا ہو، اس کے علاوہ اس پر امام طحاویؒ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ سات حروف سے مراد سات قبائل کی لغات ہیں، تو یہ اُس آیت کے خلاف ہوگا جس میں ارشاد ہے :-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ

”اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں“

اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی، اس لئے ظاہر ہے

کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے، امام طحاویؒ کی اس بات کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جمع ثانی کا ارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا، اس وقت انھیں یہ ہدایت فرمائی تھی :-

إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ
فَاكْتُبُوا بِسَانَ قُرَيْشٍ فَإِنَّمَا نَزَلَ بِلسَانِهِمْ
”جب قرآن (کی کتابت) میں تمھارے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اُسے قریش کی لغت پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے“

اس میں حضرت عثمانؓ نے تصریح فرمادی ہے کہ قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، رہا یہ سوال کہ پھر اختلاف پیش آنے کا کیا مطلب ہے؟ سواں مفصل جواب انشاء اللہ آگے آئے گا،

اس کے علاوہ اس قول کے قائلین اس بات پر متفق ہیں کہ ”احرف سبعہ“ اور ”قرارات“ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، قرارات کا اختلاف جو آج تک موجود نہ رہا وہ صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے اندر ہے، اور باقی حروف یا منسوخ ہو گئے یا مصلحہ انھیں ختم کر دیا گیا، اس پر دو سکر اشکالات کے علاوہ ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ پورے ذخیرہ احادیث میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا، کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک ”سبعۃ احرف“ کے اور ایک قرارات کے، بلکہ احادیث میں جہاں کہیں قرآن کریم کے کسی لفظی اختلاف کا ذکر آیا ہے وہاں صرف ”احرف“ کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے، قرارات کا کوئی جداگانہ اختلاف بیان نہیں

کیا گیا، ان دجہ کی بناء پر یہ قول بھی نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے،

۲۔ چوتھا مشہور قول امام طحاوی کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر ایک کے لئے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت بہت دشوار تھی، اس لئے ابتداء اسلام میں یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ اپنی علاقائی زبان کے مطابق مرادفات الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ جن لوگوں کے لئے قرآن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی، اُن کے لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرادفات متعین فرمادیئے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تعالٰیٰ کی جگہ ھَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ دیا جائے، معنی سب کے ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، جبکہ تمام اہل عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا، اہل عرب اس کے عادی ہو گئے، اور ان کے لئے اسی پہلی لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہو گئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے عوضہ اخیرہ کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ مرادفات پڑھنے کی اجازت ختم کر دی گئی، اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا،

اس قول کے مطابق ”سات حروف“ والی حدیث اُسی زمانے سے متعلق ہے، جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی، اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اُسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر

پڑھا جاسکے گا، اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کئے جاسکتے ہیں ان کی تعداد سات ہے، اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کر لے، بلکہ متبادل الفاظ کی تعیین بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، اور ہر شخص کو آپ نے اس طرح قرآن سکھایا تھا جو اس کے لئے آسان ہو، لہذا صرف ان مرادفات کی اجازت دینی تھی، جو حضور سے ثابت تھے۔

امام محادیؒ کے علاوہ حضرت سفیان بن عیینہؒ، ابن وہبؒ اور حافظ ابن عبد البرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے، بلکہ حافظ ابن عبد البرؒ نے تو اس قول کو اکثر علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ قول پچھلے تمام اقوال کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسند احمدؒ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:-

أَنَّ جَبْرِئِيلَ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اقْرَأِ الْقُرْآنَ عَلَى حُرُوفٍ، قَالَ
مِيكَائِيلُ اسْتَوْدَعَهُ حَتَّى بَلَغَ سَبْعَةَ أَحْرَفٍ، قَالَ كُلُّ
شَاذٍ كَافٍ مَا لَمْ تَغْلُظْ آيَةَ عَذَابٍ بِرَحْمَةٍ أَوْ رَحْمَةٍ
بِعَذَابٍ، نَحْوُ قَوْلِكَ تَعَالَى وَهَلُمَّ وَاذْهَبْ وَأَسْبِرْ
وَعَجِّلْ

جبریل علیہ السلام نے (حضور سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک

۱۔ فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۹،
۲۔ الزرقانیؒ: شرح الموطأ، ص ۱۱ ج ۲، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر ۱۳۵۵ھ
۳۔ ہذا اللفظ روایت احمدؒ و اسنادہ جید (اوجز المسالك، ص ۵۷ ج ۲،

حرف پر پڑے، میکائیل علیہ السلام نے (حضور سے) کہا اس میں اضافہ کرو ایڑی
یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے
فرمایا، ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تاوقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت
سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کر دیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ تَعَالٰی (آؤ)
کے معنی کو اَقْبِلْ، هَلُمَّ، اِذْهَبْ، اَسْرِعْ اور عَجَلْ کے الفاظ سے ادا کریں۔

اس قول پر اور تو کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن ایک اُلجھن اس میں بھی باقی رہتی
ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں آج تک متواتر چلی آرہی ہیں، اس
قول کے مطابق ان کی حیثیت واضح نہیں ہوتی، اگر ان قراءتوں کو ”سات حروف“
سے الگ کوئی چیز قرار دیا جائے تو اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، احادیث کے
وسیع ذخیرے میں ”احرف“ کے اختلاف کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور لفظی اختلاف
کا ذکر نہیں ملتا، پھر اپنی طرف سے یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت
میں ”احرف سبعہ“ کے علاوہ ایک اور قسم کا اختلاف بھی تھا، اس اُلجھن کا کوئی
اطمینان بخش حل اس قول کے قائلین کے یہاں مجھے نہیں مل سکا،

سَبْعَةُ أَحْرَفٍ کی رائج ترین تشریح | ہمارے نزدیک قرآن کریم کے ”سات
حروف“ کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر
ہے کہ حدیث میں ”حروف کے اختلاف“ سے مراد ”قراءتوں کا اختلاف“ ہے، اور ”سات
حروف سے مراد“ اختلاف قراءات کی سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ قراءتیں تو اگرچہ
سات سے زائد ہیں، لیکن ان قراءتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ سات
اقسام میں منحصر ہیں، (ان سات اقسام کی تشریح آگے آرہی ہے)۔

ہمارے علم کے مطابق یہ قول متقدمین میں سے سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
کے یہاں ملتا ہے، مشہور مفسر قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوریؒ اپنی تفسیر
غرائب القرآن میں لکھتے ہیں کہ احرف سبعہ کے بارے میں امام مالکؒ کا یہ مذہب منقول
ہے کہ اس سے مراد قراءات میں مندرجہ ذیل سات قسم کے اختلافات ہیں :-

۱۔ مفرد اور جمع کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری میں صیغہ جمع، مثلاً وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ، اور كَلِمَاتُ رَبِّكَ،

۲۔ تذکر و تائید کا اختلاف، کہ ایک میں لفظ مذکر استعمال ہوا اور دوسری میں مؤنث جیسے لَا يُقْبَلُ اور لَا تُقْبَلُ

۳۔ وجوہ اعراب کا اختلاف، کہ زیر زیر وغیرہ بدل جائیں، مثلاً هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ اور غَيْرُ اللَّهِ،

۴۔ صرفی ہیئت کا اختلاف، جیسے يَجِيْ شَوْنِ اور يُجِيْ شَوْنِ،

۵۔ ادوات (حروفِ نحویہ) کا اختلاف، جیسے لَكِنَّ الشَّيَاطِیْنَ اور لَكِنَّ الشَّيَاطِیْنَ

۶۔ لفظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں، جیسے تَعْلَمُوْنَ اور يُعْلَمُوْنَ اور تُنْشِئُهَا اور تُنْشِئُهَا،

۷۔ ہجول کا اختلاف، جیسے تخفیف، تغیم، امالہ، مد، قصر، انہار اور ادغام وغیرہ

پھر یہی قول علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابو الفضل رازیؒ، قاضی ابوبکر بن الطیبؒ باقلانیؒ اور محقق ابن الجوزیؒ رحمہم اللہ نے اختیار فرمایا ہے، محقق ابن الجوزیؒ جو قرأت کے مشہور امام ہیں اپنا یہ قول بیان کرنے سے قبل تحریر فرماتے ہیں :-

”ہیں اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مبتلا رہا، اور اس پر تیس سال سے زیادہ غور و فکر کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کی ایسی تشریح کھول دی جو انشاء اللہ صحیح ہوگی“

یہ سب حضرات اس بات پر تو متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد اختلافِ قرأت کی سات نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعیین میں ان

۱۔ اینشاپوریؒ: غرائب القرآن و رغائب الفرقان، ہامش ابن جریر، ص ۲۱ ج ۱، المطبعة الميمنية مصر
۲۔ ابن قتیبہؒ، ابو الفضل رازیؒ اور ابن الجوزیؒ کے اقوال، فتح الباری، ص ۲۵ و ۲۶ ج ۹،
اور اتقان، ص ۴۷ ج ۱ میں موجود ہیں، اور قاضی ابن الطیبؒ کا قول تفسیر القرطبیؒ ص ۴۵ ج ۱ میں ...
دیجا جاسکتا ہے، ۳۔ النشر فی القراءات العشر، ص ۲۶ ج ۱،

حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے قرأت کا استقراء اپنے طور پر الگ الگ کیا ہے، ان میں جن صاحب کا استقراء سب سے زیادہ منضبط مستحکم اور جامع و مانع ہے، وہ امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں، کہ قرأت کا اختلاف سات اقسام میں منحصر ہے:-

- ۱۔ اسماء کا اختلاف، جس میں افسراد، تشنیہ و جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، (اس کی مثال یہی تَمَتَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ ہے، جو ایک قرأت میں تَمَتَّتْ کَلِمَاتُ رَبِّکَ بھی پڑھا گیا ہے)
- ۲۔ افعال کا اختلاف، کہ کسی قرأت میں صیغہ ماضی ہو، کسی میں مضارع اور کسی میں امر (اس کی مثال رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ہے کہ ایک قرأت میں اس کی جگہ رَبَّنَا بَعْدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا بھی آیا ہے)
- ۳۔ وجوہ اعراب کا اختلاف، جس میں اعراب یا حرکات مختلف قرار توں میں مختلف ہوں (اس کی مثال وَلَا يُضَارُّكَ كَاتِبُكَ اور لَا يُضَارُّكَ كَاتِبُكَ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیدِ)
- ۴۔ الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو (مثلاً ایک قرأت میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ہے، اور دوسری میں وَالذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ہے، اور اس میں وَمَا خَلَقَ کا لفظ نہیں ہے، اسی طرح ایک قرأت میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ اور دوسری میں تَجْرِیْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ)
- ۵۔ تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ مقدم اور دوسری میں مؤخر ہے (مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ)
- ۶۔ بدلیت کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں ایک لفظ ہی، اور دوسری قرأت میں اس کی جگہ دوسرا لفظ (مثلاً تُنْشِرُهَا اور تُنْشِرُهَا، نیز قَتَبْتُمَا اور قَتَبْتُمَا، قَتَبْتُمَا اور طَلَح اور طَلَح)

۱۔ لہجوں کا اختلاف، جس میں تغیم، ترقیق، امالہ، قصر، مد، ہمر، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں، مثلاً مؤسسی ایک قرأت میں امالہ کے ساتھ ہے، اور اُسے مؤسسی کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور دوسری میں بغیر امالہ کے ہے) علامہ ابن الجوزیؒ، علامہ ابن قتیبہؒ اور قاضی ابوطیبؒ کی بیان کردہ وجوہ اختلاف بھی اس سے ملتی جلتی ہیں، البتہ امام ابو الفضل رازیؒ کا استقراء اس لئے زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف چھوٹا نہیں ہے، اس کے برخلاف باقی تین حضرات کی بیان کردہ وجوہ میں آخری قسم یعنی لہجوں کے اختلاف کا بیان نہیں ہے، اور امام مالکؒ کی بیان کردہ وجوہ میں لہجوں کا اختلاف تو بیان کیا گیا ہے، لیکن الفاظ کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور بدلیت کے اختلافات کی پوری وضاحت نہیں ہے، اس کے برخلاف امام ابو الفضل رازیؒ کے استقراء میں یہ تمام اختلافات وضاحت کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں، محقق ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے تیس سال سے زائد غور و فکر کرنے کے بعد سات احرف کو سات وجوہ اختلاف پر محمول کیا ہے، انہوں نے بھی امام ابو الفضلؒ کا قول بڑی وقعت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اُن کے مجموعی کلام سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ انھیں امام ابو الفضلؒ کا استقراء خود اپنے استقراء سے بھی زیادہ پسند آیا ہے؛ اس کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان تینوں اقوال میں امام ابو الفضل رازیؒ کے استقراء کو ترجیح دی ہے، کیونکہ انھوں نے علامہ ابن قتیبہؒ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ہذا وجہ حسن (یہ اچھی توجیہ ہے) پھر امام ابو الفضلؒ کی بیان کردہ سات وجوہ بیان کر کے تحریر فرمایا ہے:

قلت وقد اخذت کلام ابن قتیبہ و نقحہ،

میرا خیال ہے کہ امام ابو الفضل رازیؒ نے ابن قتیبہ کا قول اختیار کر کے اُسے اور نکھار دیا ہے؛

آخری دور میں شیخ عبد العظیم الزرقانیؒ نے بھی اپنی کے قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں متعلقہ دلائل پیش کئے ہیں!

بہر کیف! استقراء کی وجہ میں تو اختلاف ہے، لیکن اس بات پر امام مالکؒ علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابو الفضل رازیؒ، محقق ابن الجبرریؒ اور قاضی باقلانیؒ پانچ حضرات متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد قرات کے وہ اختلافات ہیں جو سات نوعیتوں میں منحصر ہیں،

احقر کی ناچیز رائے میں ”سبعة احرف“ کی یہ تشریح سب سے زیادہ بہتر ہے، حدیث کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے، اور یہ مختلف طریقے اپنی نوعیتوں کے لحاظ سے سات ہیں، ان سات نوعیتوں کی کوئی تعین چونکہ کسی حدیث میں موجود نہیں ہے اس لئے یقیناً کتب تو کسی کے استقراء کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ حدیث میں وہی مراد ہے، لیکن بظاہر امام ابو الفضل رازیؒ کا استقراء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ موجودہ قرات کی تمام انواع کو جامع ہے،

اس قول کی وجہ ترجیح | ”سبعة احرف“ کی تشریح میں جتنی اقوال حدیث تفسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں بیان ہوئیں، ہمارے نزدیک ان سب میں یہ قول در کہ سات حروف مراد اختلاف قرات کی سات نوعیتیں ہیں (سب سے

زیادہ راجح، قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہے، اور اس کی مندرجہ ذیل وجہ یہ ہے:-
۱۔ اس قول کے مطابق ”حروف“ اور ”قرآت“ کو دو الگ الگ چیزیں مقرر کر دینا نہیں پڑتا، علامہ ابن جریرؒ اور امام طحاویؒ کے اقوال میں ایک مشترک الجھن یہ ہے کہ ان میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک حروف کا اختلاف اور دوسرے قرات کا اختلاف، حروف کا اختلاف اب ختم ہو گیا، اور قرات کا اختلاف باقی ہے، حالانکہ احادیث کے اتنے بڑے ذخیرہ

میں کوئی ایک ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ”حروف“ اور قراءت ”دوالگ الگ چیزیں ہیں“ احادیث میں صرف حروف کے اختلاف کا ذکر ملتا ہے اور اسی کے لئے کثرت سے ”قراءة“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اگر قراءت ”ان حروف“ سے الگ ہوتیں تو کسی نہ کسی حدیث میں ان کی طرف کوئی اشارہ تو ہونا چاہئے تھا، آخر کیا وجہ ہو کہ ”حروف“ کے اختلاف کی احادیث تو تقریباً تو اتر تک پہنچی ہوئی ہیں، اور قراءت کے جداگانہ اختلاف کا ذکر کسی ایک حدیث میں بھی نہیں ہے؟ محض اپنے قیاس سے یہ کہہ دینا کیونکر ممکن ہو کہ اختلاف حروف کے علاوہ قرآن کریم کے الفاظ میں ایک دوسری قسم کا اختلاف بھی تھا؟

مذکورہ بالا قول میں یہ الجھن بالکل رفع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں ”حروف“ اور ”قراءت“ کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے،

۲۔ علامہ ابن جریر کے قول پر یہ مانتا پڑتا ہے کہ سات حروف میں سے چھ حروف منسوخ یا متروک ہو گئے، اور صرف ایک حرف قریش باقی رہ گیا، موجودہ قراءت اسی حرف قریش کی ادائیگی کے اختلافات ہیں اور اس نظریہ کی قباحتیں ہم آگے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، مذکورہ بالا آخری قول میں یہ قباحتیں نہیں ہیں، کیونکہ اس کے مطابق ساتوں حروف آج بھی باقی اور محفوظ ہیں،

۳۔ اس قول کے مطابق ”سات حروف“ کے معنی بلا تکلف صحیح ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرے اقوال میں یا ”حروف“ کے معنی میں تاویل کرنی پڑتی ہے یا سات کے عدد میں ۴۔ ”سبعة احرف“ کے باب میں جتنے علماء کے اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور عہد رسالت سے قریب ہستی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اور وہ علامہ نیشاپوری کے بیان کے مطابق اسی قول کے قائل ہیں،

۵۔ علامہ ابن قتیبہ اور محقق ابن الجوزی دونوں علم قراءت کے مسلم الثبوت امام ہیں اور دونوں اسی قول کے قائل ہیں، اور مؤخر الذکر کا یہ قول پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے تین سال سے زائد اس حدیث پر غور کرنے کے بعد اس قول کو اختیار کیا،

اس قول پر وارد ہوئیوالے | اب ایک نظر ان اعتراضات پر بھی ڈال لیجئے جو اس قول
اعتراضات اور ان کا جواب پر وارد ہو سکتے ہیں یا وارد کئے گئے ہیں۔

۱۔ اس پر ایک اعتراض تو یہ کیا گیا ہے کہ اس قول میں جتنی وجوہ اختلاف بیان
کی گئی ہیں وہ زیادہ تر صرف فی اور نحوئی تقسیمات پر مبنی ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جیڑتہ یہ حدیث ارشاد فرمائی اس وقت صرف و نحو کی یہ فنی اصطلاحات اور تقسیمات
راجح نہیں ہوئی تھیں، اُس وقت اکثر لوگ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، ایسی صورت
میں ان وجوہ اختلاف کو ”سبعۃ احرف“ قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجر
نے یہ اعتراض نقل کر کے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ:-

دلایلم من ذلك توھین ما ذهب الیه ابن قتیبۃ
لاحتمال ان یكون الاغصار المذکور فی ذلك وقع اتفاقاً
وانما اطلع علیہ بالاستقراء و فی ذلك من الحکمة
البالغة ما لا یخفی^۱

”اس سے ابن قتیبہ کے قول کی کمزوری لازم نہیں آتی، اس لئے کہ
یہ ممکن ہے کہ مذکورہ اغصار اتفاقاً ہو گیا ہو، اور اس کی اطلاع استقراء
کے ذریعہ ہو گئی ہو، اور اس میں جو حکمت بالغہ ہو وہ پوشیدہ نہیں“

ہماری ناچیز فہم کے مطابق اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے عہد رسالت
میں یہ اصطلاحات رائج نہ تھیں، اور شاید یہی وجہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
”سبعۃ احرف“ کی تشریح اس دور میں نہیں فرمائی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ فنی اصطلاحات
جن مفہیم سے عبارت ہیں وہ مفہیم تو اس دور میں بھی موجود تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان مفہیم کے لحاظ سے وجوہ اختلاف کو سات میں منحصر قرار دیا ہو، تو
اس میں کیا تعجب ہے؟ ہاں اُس دور میں اگر سات وجوہ اختلاف کی تفصیل بیان

کی جاتی، تو شاید عامۃ الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی، اس لئے آپؐ نے اس کی تفصیل بیان فرمانے کے بجائے صرف اتنا واضح فرمادیا کہ یہ وجوہ اختلاف کُلِّ سَات میں مختص ہیں بعد میں جب یہ مطلقاً حات راج ہو گئیں تو علماء نے استقرار نام کے ذریعہ ان وجوہ اختلاف کو اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کر دیا، یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کسی خاص شخص کے استقرار کے بارے میں یقین کامل سے یہ کہنا مشکل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی، لیکن جب مختلف لوگوں کا استقرار یہ ثابت کر رہا ہے کہ وجوہ اختلاف کُلِّ سَات ہیں، تو اس بات کا قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ ”سبعۃ احرف“ سے آپؐ کی مراد سَات وجوہ اختلاف تھیں، خواہ ان کی تفصیل بعینہ وہ نہ ہو جو بعد میں استقرار کے ذریعہ معین کی گئی ہے، بالخصوص جبکہ ”سبعۃ احرف“ کی تشریح میں کوئی اور صورتِ معقولیت کے ساتھ بنتی ہی نہیں ہے،

سَات حروف کے ذریعہ | (۲) اس قول پر دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کو سَات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا، تاکہ امت کی آسانی پیدا ہوئی؟ کے لئے تلاوت قرآن میں آسانی پیدا کی جائے، یہ آسانی علامہ ابن جریر کے قول پر تو سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ عرب میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، اور ایک قبیلے کے لئے دوسرے قبیلے کی لغت پر قرآن پڑھنا مشکل تھا لیکن امام مالکؒ، امام رازیؒ اور ابن الجزریؒ وغیرہ کے اس قول پر تو ساتوں حروف ایک لغت قریش ہی سے متعلق ہیں، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب قرآن کریم ایک ہی لغت پر نازل کرنا تھا تو اس میں قرآت کا اختلاف باقی رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اعتراض کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن میں سَات حروف کی جو سہولت امت کے لئے مانگی تھی اس میں قبائل عرب کا اختلاف لغت آپؐ کے پیش نظر تھا، حافظ ابن جریر بطبریؒ نے اسی بناء پر ”سَات حروف“ کو ”سَات لغات عرب“ کے معنی پہنچائے ہیں، حالانکہ یہ وہ بات ہے جس کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی، اس کے برعکس ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ بیان فرمادیا ہے کہ سات حروف کی آسانی طلب کرتے ہوئے آپ کے پیش نظر کیا بات تھی؟ امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعبؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:-

لَقِيَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبْرِيْلَ عِنْدَ حِجَابِ الْمَلَأِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَجَبْرِيْلَ: إِنِّي بُعِثْتُ إِلَى أُمَّةٍ أُمِّيَّةٍ فِيهِمْ الشَّيْخُ الْفَانِي وَالْعَجُوزُ الْكَبِيرُ وَالْغُلَامُ، قَالَ فَمُرْهُمْ فَلْيَقْرَءُوا الْقُرْآنَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ،

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مردہ کے پتھروں کے قریب حضرت جبریل علیہ السلام سے ہوئی، آپ نے حضرت جبریلؑ سے فرمایا: میں ایک اُن پڑھ امت کی طرف بھیجا گیا ہوں جن میں لپ گور بوڑھے بھی ہیں، سن رسیدہ بوڑھیاں بھی، اور بچے بھی، حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اُن کو حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حروف پر پڑھیں۔“

ترمذیؒ ہی کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا:-

إِنِّي بُعِثْتُ إِلَى أُمَّةٍ أُمِّيَّةٍ مِنْهُمْ الْعَجُوزُ وَالشَّيْخُ وَالْكَبِيرُ وَالْغُلَامُ وَالْجَارِيَّةُ وَالَّذِي لَمْ يَقْرَأْ كِتَابًا قَطُّ،

”مجھے ایک اُن پڑھ امت کی طرف بھیجا گیا ہے، جن میں بوڑھیاں بھی ہیں، بوڑھے بھی، سن رسیدہ بھی، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور ایسے لوگ بھی جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔“

اس حدیث کے الفاظ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتلا رہے ہیں کہ اُمت کے لئے سات حروف کی آسانی طلب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ بات تھی کہ آپ ایک اُمّی اور آن پڑھ قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جس میں ہر طرح کے افسردہ ہیں، اگر قرآن کریم کی تلاوت کے لئے صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا گیا تو اُمت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی، اس کے برعکس اگر کئی طریقے رکھے گئے تو یہ ممکن ہو گا کہ کوئی شخص ایک طریقے سے تلاوت پر قادر نہیں ہو تو دوسرے طریقے سے انہی الفاظ کو ادا کر دے، اس طرح اس کی نماز اور تلاوت کی عبادات درست ہو جائیں گی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بوڑھوں، بوڑھیوں یا آن پڑھ لوگوں کی زبان پر ایک لفظ ایک طریقہ سے چڑھ جاتا ہے اور اس کے لئے زیر زبر کا معمولی فرق بھی دشوار ہوتا ہے، اس لئے آپ نے یہ آسانی طلب فرمائی کہ مثلاً کوئی شخص معروف کا صیغہ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی جگہ دوسری قراءت کے مطابق جھول کا صیغہ ادا کر لے، یا کسی کی زبان پر صیغہ مفرد نہیں چڑھتا تو وہ اسی آیت کو صیغہ جمع سے پڑھ لے، کسی کے لئے ہجاء کا ایک طریقہ مشکل ہو تو دوسرا اختیار کر لے، اور اس طرح اس کو پورے قرآن میں سات قسم کی آسانیاں مل جائیں گی،

آپ نے مذکورہ بالا حدیث میں ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کی آسانی طلب کرتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ میں جس اُمت کی طرف بھیجا گیا ہوں وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کی لغت جدا ہے، اس لئے قرآن کریم کو مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت دی جائے، اس کے برخلاف آپ نے قبائلی اختلافات سے قطع نظر ان کی عمروں کا تفاوت اور ان کے اُمّی ہونے کی صفت پر زور دیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سات حروف کی آسانی دینے میں بنیادی عامل قبائل کا لغوی اختلاف نہ تھا، بلکہ اُمت کی ناخواندگی کے پیش نظر تلاوت میں ایک عام قسم کی سہولت دینا پیش نظر تھا جس سے اُمت کے تمام افراد فائدہ اٹھا سکیں،

(۳) اس قول پر تسلیم اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اختلافِ قراءت کی جو سات نوعیتیں بیان کی گئی ہیں وہ خواہ مالک یا ابو الفضل رازیؒ کی بیان کی ہوئی ہوں یا علامہ ابن قتیبہؒ، محقق ابن الجزریؒ اور قاضی ابن الطیبؒ کی، بہر حال! ایک قیاس اور تخمینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اسی وجہ سے ان حضرات میں سے ہر ایک نے ان سات وجوہ اختلاف کی تفصیل الگ الگ بیان کی ہے، اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی،

اس کا جواب یہ ہے کہ ”سبعۃ احرف“ کی کوئی واضح تشریح کسی حدیث یا کسی صحابی کے قول میں نہیں ملتی، اس لئے اس باب میں جتنے اقوال ہیں، اُن سب میں روایات کو مجموعی طور پر جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ قول زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی بنیادی اعتراض واقع نہیں ہوتا، روایات کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بعد ہمیں اس بات کا تو قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث میں سات حروف سے مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، رہی ان نوعیتوں کی تعیین و تشخیص، سو اس کے بارے میں ہم پہلے بھی یہ عرض کر چکے ہیں کہ اسے معلوم کرنے کا ذریعہ استقرار کے سوا کوئی اور نہیں، امام ابو الفضل رازیؒ کا استقرار ہمیں جامع و مانع ضرور معلوم ہوتا ہے، مگر یقین کے ساتھ ہم کسی کے استقرار کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، کہ حضورؐ کی مراد یہی تھی، لیکن اس سے یہ اصولی حقیقت مجروح نہیں ہوتی کہ ”سبعۃ احرف“ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں تھیں، جن کی تفصیل کا یقینی علم حاصل کرنے کا نہ ہمارے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ اُن کی چنداں ضرورت ہے،

۴۔ اس قول پر چونکہ اعتراض یہ ممکن ہے کہ اس قول میں ”حروف سبعۃ“ سے الفاظ اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کا اختلاف مراد لیا گیا ہے، معانی سے اس میں بحث نہیں ہے، حالانکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سات قسم کے معانی ہیں، امام طحاویؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں :-

كان الكتاب الاول ينزل من باب واحد على حرف
واحد ونزل القرآن من سبعة ابواب على سبعة
احرف زاجر وامر وحلال وحرام ومحكم ومتشابه
وامثال الخ،

پہلے کتاب ایک باب سے ایک حرف پر نازل ہوتی تھی اور قرآن کریم
سات ابواب سے سات حرود پر نازل ہوا (وہ سات حرود ہیں)
زاجر (کسی بات سے روکنے والا) آمر (کسی چیز کا حکم دینے والا)،
حلال، حرام، محکم (جس کے معنی معلوم ہیں) متشابه (جس کے لغتی
معنی معلوم نہیں) اور امثال !!

اسی بناء پر بعض علماء سے منقول ہے کہ انھوں نے سات حرود کی تفسیر سات

قسم کے معانی سے کی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے، امام طحاویؒ
اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے ابو سلمہؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
سے روایت کیا ہے، حالانکہ ابو سلمہ کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نہیں ہوئی
اس کے علاوہ قدیم زمانہ کے جن بزرگوں سے اس قسم کے اقوال منقول ہیں، ان کی
تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ ان کا مقصد ”سبعة احرف“
والی حدیث کی تشریح کرنا نہیں تھا، بلکہ ”سبعة احرف“ کے زیر بحث مسئلہ بالکل
الگ ہو کر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قرآن کریم اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے،
رہے وہ لوگ جنھوں نے ”سبعة احرف“ والی حدیث کی تشریح ہی میں اس قسم

کی باتیں کہی ہیں، اُن کا قول بالکل بدیہی البطلان ہے، اس لئے کہ سچے جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، اُن کو سرسری نظر ہی سے دیکھ کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ حروف کے اختلاف سے مراد معانی اور مضامین کا نہیں، بلکہ الفاظ کا اختلاف ہے، چنانچہ محقق علماء میں سے کسی ایک نے بھی اس قول کو خست یا نہیں کیا، بلکہ اس کی تردید کی ہے۔^{۱۵}

ف سب سے اب بھی محفوظ ہیں یا متروک ہو گئے؟ ”سات حروف“ کے معنی متعین ہو جانے کے بعد اہم بحث یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف آج بھی باقی ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں متقدمین سے تین قول منقول ہیں :-

(۱) پہلا قول حافظ ابن جریر طبریؒ اور ان کے متبعین کا ہے، پیچھے ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک ”حرف سبعة“ سے مراد قبائیل عرب کی سات لغات ہیں اسی بنا پر وہ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم ان ساتوں حروف پر پڑھا جاتا تھا، لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا تو ان حروف سبعة کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے، مختلف لوگ مختلف حروف پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور ایک دوسرے کی تلاوت کو غلط سمجھتے تھے، اس فتنہ کے انسداد کے لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے پوری اُمت کو صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے مطابق سات مصاحف مرتب فرما کر مختلف صوبوں میں بھیج دیئے اور باقی تمام مصاحف کو نذر آتش کر دیا، تاکہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے، لہذا اب صرف لغت قریش کا حرف باقی رہ گیا ہے، اور باقی چھ حروف محفوظ نہیں ہوئے اور سرائے توں کا جو اختلاف آج تک باقی چلا آتا ہے وہ اسی ایک حرف قریش کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں؛

۱۵ تفصیلی تردید کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان ص ۴۹ ج ۱، نوے ۱۶، اور النشر فی القراءات لعشر

لابن الجزری ص ۲۵ ج ۱، ۱۶ تفسیر ابن جریر ص ۵ ج ۱

حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ اپنا یہ نظریہ
اور اس کی قباحتیں | اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بڑی تفصیل اور جزم و وثوق
کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس لئے یہ قول بہت مشہور ہوا۔

اور آجکل حروفِ سبعہ کی تشریح عموماً اسی کے مطابق کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ
بیشتر محقق علماء نے اسے اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید فرماتی ہے،
کیونکہ اس قول پر متعدد الجھنیں ایسی کھڑی ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے،
اس نظریہ پر سب سے پہلا اعتراض تو وہی ہوتا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس
میں ”حروف“ اور ”قراءات“ کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بات
کسی حدیث سے ثابت نہیں،

دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف تو
یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ ساتوں حروفِ منزل من اللہ تھے، دوسری طرف یہ فرماتے ہیں
کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے مشورے سے چھ حروف کی تلاوت کو ختم فرمایا
حالانکہ اس بات کو باور کرنا بہت مشکل ہے کہ صحابہ کرامؓ ان حروف کو یکسر ختم کرنے پر
متفق ہو گئے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی فرمائش پر امت کی آسانی کے لئے نازل فرمایا
تھے، صحابہ کرامؓ کا اجماع بیشک دین میں حجت ہی، لیکن صحابہ کرامؓ سے یہ ممکن نہیں
معلوم ہوتا کہ جس چیز کا قرآن ہونا تو ان کے ساتھ ثابت ہوا سے وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیں
پر متفق ہو جائیں،

حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل
امت کو قرآن کریم کی حفاظت کا حکم ہوا تھا اور اسے ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیدیا تھا
کہ وہ سات حروف میں سے جس حرف کو چاہے اختیار کر لے، چنانچہ امت نے اس اختیار
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اجتماعی مصلحت کی خاطر چھ حروف کی تلاوت چھوڑ دی

لے ان علماء کے اسماء گرامی آگے آرہے ہیں،

اور ایک حرف کی حفاظت پر متفق ہو گئی، اس اقدام کا منشاء نہ ان حروف کو منسوخ قرار دینا تھا اور نہ ان کی تلاوت کو حرام قرار دینا تھا، بلکہ اپنے لئے اجتماعی طور پر ایک حرف کا انتخاب تھا،

لیکن یہ جواب بھی اس لئے کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اگر صورت یہی تھی تو کیا یہ سب نہ تھا کہ اُمت اپنے عمل کے لئے خواہ ایک حرف کو اختیار کر لیتی، باقی چھ حروف کا وجود مسکے ختم کرنے کے بجائے اُسے کم از کم کسی ایک جگہ محفوظ رکھتی، تاکہ اُن کا وجود ختم نہ ہو، قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے :-

إِنَّا نَخْنُتُ نَزْلَ الْكِتَابِ كَرَدًا نَأْتَاكَ لِحَافِظُونَ ۝

بلاشبہ ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

جب ساتوں حروف قرآن تھے تو اس آیت کا صاف تقاضا یہ ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں گے، اور کوئی شخص ان کی تلاوت چھوڑنا بھی چاہے تو وہ ختم نہیں ہو سکیں گے، حافظ ابن جریر طبریؒ نے اس کی نظیر میں یہ مسئلہ پیش کیا ہے کہ قرآن کریم نے جھوٹی قسم کھانے کے کفارے میں انسانوں کو تین باتوں کا اختیار دیا ہے، یا تو وہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا دس مسکینوں کو کپڑا دے، اب اگر اُمت باقی صورتوں کو ناجائز قرار دیتے بغیر اپنے عمل کے لئے ان میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لے تو یہ اُس کے لئے جائز ہے، اسی طرح قرآن کے سات حروف میں سے اُمت نے ایک حرف کو اجتماعی طور پر اختیار کر لیا، لیکن یہ مثال اس لئے درست نہیں کہ اگر اُمت کفارۃ یمین کی تین صورتوں میں سے ایک صورت اس طرح اختیار کر لے کہ باقی صورتوں کو ناجائز تو نہ کہے لیکن عملاً ان کا وجود بالکل ختم ہو کر رہ جائے، اور لوگوں کو صرف اتنا معلوم رہ جائے کہ کفارۃ یمین کی دو صورتیں اور تھیں جن پر اُمت نے عمل ترک کر دیا، لیکن وہ صورتیں کیا تھیں؟ اُن کا جاننے والا بھی کوئی باقی نہ رہے تو یقیناً اُمت کے لئے ایسے اقدام کی گنجائش نہیں ہے،

پھر سوال یہ ہے کہ باقی چھ حروف کو ترک کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟

حافظ ابن جریرؒ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں ان حروف کے اختلاف کی وجہ سے شدید جھگڑے ہو رہے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان سب کو ایک حرف پڑھ کر دیا جائے، لیکن یہ بھی ایسی بات ہو جسے باور کرنا بہت مشکل ہو حروف کے اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کا اختلاف تو خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا، احادیث میں ایسے متعدد واقعات مروی ہیں کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو مختلف طریقے سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے سنا تو باہمی اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ صحیح بخاریؒ کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ کے گلے میں چادر ڈال کر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے، اور حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ حروف کا یہ اختلاف سن کر میرے دل میں زبردست شکوک پیدا ہوئے لگے تھے، لیکن اس قسم کے واقعات کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حروف سبعة کو ختم کرنے کے بجائے انہیں حروف کی رخصت سے آگاہ فرمایا، اور اس طرح کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکا، صحابہ کرامؓ سے یہ بعید ہو کہ انہوں نے اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے بجائے چھ حروف ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو،

پھر عجیب بات ہو کہ علامہ ابن جریرؒ کے قول کے مطابق صحابہؓ نے چھ حروف تو اختلاف کے ڈر سے ختم فرمادیئے، اور تراتین (جو ان کے قول میں حروف سے الگ ہیں) جو ان کی توں باقی رکھیں، چنانچہ وہ آج تک محفوظ چلی آتی ہیں، سوال یہ ہو کہ افتراق اختلاف کا جو اندیشہ مختلف حروف پر قرآن کی تلاوت جاری رکھنے میں تھا کیا وہی اندیشہ قرات کے اختلاف میں نہیں تھا؟ جبکہ ان تراتوں کی روشنی میں بعض مرتبہ ایک ایک لفظ بیس بیس مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے؟ اگرچہ حروف ختم کرنے کا منشاء یہی تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ سب ایک طریقہ سے قرآن کی تلاوت کیا کریں تو قراتوں کے اختلاف کو آخر کیوں ختم نہیں کیا گیا؟ جب قرات کے اختلاف کو باوجود مسلمانوں کے انشاد کو روکا جاسکتا تھا اور مسلمانوں کو یہ سمجھایا جاسکتا تھا

کہ ان تمام طریقوں سے تلاوت جائز ہے تو یہی تعلیم حروف سبعہ کے باب میں فتنہ کا سبب کیوں سمجھ لی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ”حروف سبعہ“ اور ”قرآت“ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی طرف ایسی حیرت انگیز و عملی منسوب کرنی پڑتی ہو جس کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں نہیں آتی،

پھر حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرف اتنے بڑے اقدام کی نسبت کسی صریح اور صحیح روایت کی بنا پر نہیں بلکہ بعض محل الفاظ کی قیاسی تشریح کے ذریعہ کی گئی ہے جن روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ انھوں نے چھ حروف کو ختم فرما دیا تھا بلکہ اس کے خلاف دلیلیں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اب کسی صحیح اور صریح روایت کے بغیر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان چھ حروف کو بالکل بے نشان کر دینا گوارا کر لیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار فرمائش پر بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو جمع و ترتیب قرآن کے نیک کام میں محض اس لئے تامل رہا ہو کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، جنھوں نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنے میں اپنی عمریں کھپائی ہوں، اور جنھوں نے منسوخ التلاوة آیات تک کو محفوظ کر کے اُمت تک پہنچایا ہو، اُن سے یہ بات بے انتہا بعید ہے کہ وہ سب کے سب چھ حروف کو ختم کرنے پر اس طرح متفق ہو جائیں کہ آج اُن حروف کا کوئی نام و نشان تک باقی نہ رہے، جن آیات کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی صحابہ کرامؓ نے انھیں بھی کم از کم تاریخی حیثیت میں باقی رکھ کر ہم تک پہنچایا ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ ”حروف“ جن کے بارے میں حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوئے، بلکہ محض مصلحہ اُن کی تشرارت و کتا ختم کر دی گئی، اُن کی کوئی ایک مثال کسی ضعیف روایت میں بھی محفوظ نہ رہ سکی، یہی وجہ ہے کہ بیشتر محقق علماء نے حافظ ابن جریر طبریؒ کے اس قول کی تردید

فرمائی ہے، جن کے اقوال کی تفصیل آگے آرہی ہے،

(۲) دوسرا مسلک امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا کہ
امام طحاوی کا قول | پیچھے گزر چکا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن کریم نازل تو صرف

ایک لغت قریش پر ہوا تھا، لیکن امت کی آسانی کے خیال سے یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت میں شائے کی حد تک دوسرے مرادفات استعمال کر سکتے ہیں اور یہ مرادفات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیے تھے، اسی اجازت کو محدثین قرآن کریم کے ساتھ ”ساحر“ فرما دیا ہوتا تھا، لیکن یہ اجازت ابتداء اسلام میں تھی، بعد میں جب کہ قرآنی لغت کے عادی ہو گئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اجازت منسوخ ہو گئی، اور جب کہ اپنی وفات پہلے رمضان میں حضرت جبریلؑ سے قرآن کریم کا آخری ذکر کیا تو اُس وقت یہ مرادفات منسوخ کر دی گئے، اور اب صرف ہی حرف باقی ہے جس پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، یعنی حرف قریش، باقی چھ مرادفات منسوخ ہو چکے،

یہ قول حافظ ابن جریر کے قول کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں صحابہ کرام کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی گئی کہ چھ حروف انہوں نے ترک کئے، بلکہ نسخ کی نسبت خود عہد رسالت کی طرف کی گئی ہے، لیکن اُس پر ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ اس قول کے مطابق چھ حروف منزل من اللہ نہیں تھے، حالانکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ کے درمیان جو اختلاف پیش آیا اس میں حضرت ہشامؓ نے حضورؐ کے سامنے سورۃ فرقان اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، تو اُسے سُکر آپؐ نے فرمایا، هَكَذَا اُنْزِلَتْ (یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے) اور پھر حضرت عمرؓ نے اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، اُسے سُکر بھی آپؐ نے فرمایا هَكَذَا اُنْزِلَتْ (یہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے) ان الفاظ کا کھلا ہوا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقے منزل من اللہ تھے،

دوسرے جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا اس قول میں بھی قرأت کی حیثیت واضح نہیں

ہوتی کہ وہ سات حروف میں داخل تھیں یا نہیں، اگر داخل تھیں تو چھ حروف کی طرح اُن کے بارے میں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ منزل من اللہ نہیں ہیں، حالانکہ یہ اجماع کے خلاف ہے، اور اگر داخل نہیں تھیں تو ان کے علاوہ وجود پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس قول پر بھی شرح صدر نہیں ہوتا،

سب سے بہتر قول | تیسرا قول جو سب سے زیادہ اطمینان بخش اور بے غبار ہے وہ یہی ہے کہ سات احرف سے مراد چونکہ اختلافِ قرأت ہی کی سات

مختلف نوعیتیں ہیں جن کا ذکر پیچھے آچکا ہے، اس لئے یہ ساتوں حروف آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں اور باقی ہیں، اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے، البتہ اتنا فرق ضرور ہوا کہ ابتداء سے سلام میں قرأتوں کے اختلافات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان میں مراد الفاظ کے اختلاف کی کثرت تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لغتِ قرآن کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے انھیں زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے، بعد میں جب اہل عرب لغتِ قرآن کے عادی ہو گئے تو مرادفات وغیرہ کے بہت سے اختلافات ختم کر دیئے گئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے جو آخری دور کیا، (اور جسے اصطلاح میں عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے) اُس وقت بہت سی قرأتیں منسوخ کر دی گئیں، جس کی دلیل آگے آرہی ہے، لیکن جتنی قرأتیں اُس وقت باقی رہ گئیں وہ ساری کی ساری آج تو اتر کے ساتھ چلی آتی ہیں، اور ان کی تلاوت ہوتی ہے،

”حرفِ سبعة“ کی چھپڑہ بحث میں یہ وہ بے غبار راستہ ہو جس پر تمام روایات حدیث بھی اپنی اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں، اور نہ اُن میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے، اور نہ کوئی اور معقول اشکال پیش آتا ہے، اس سلسلے میں ممکنہ شبہات کا جواب ہم آگے تفصیل کے ساتھ دیں گے، جس سے اُس قول کی حقانیت اچھی طرح واضح ہو سکے گی، لیکن پہلے یہ سن لیجئے کہ اس قول کے قائل کون حضرات ہیں؟ یہاں ہم اُن حضرات کے اسمائے گرامی اور حوالے پیش کرتے ہیں، جنھوں نے اس قول کو اختیار کیا ہے یا حافظ ابن جریر طبریؒ کی تردید کی ہے :-

اس قول کے قائلین حافظ ابو الحجاز محمد بن الحجزری (متوفی ۳۳۷ھ) جو قرآن کے اہم اعظم مشہور ہیں، اور حدیث وفقہ میں حافظ ابن کثیر کے شاگرد اور حافظ ابن حجر کے استاذ ہیں، اپنی مشہور کتاب "النشر فی القراءات العشر" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اما كون المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة فان هذه مسألة كبيرة اختلف العلماء فيها فذهب جماعات من الفقهاء والقراء والمتكلمين الى ان المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة وبنوا ذلك على انه لا يجوز على الامة ان تحمل نقل شيء من الحروف السبعة التي نزل القرآن بها وقد اجمع الصحابة على نقل المصاحف العثمانية من الصحف التي كتبها ابو بكر وعمر وارسال كل مصحف منها الى مصر من امصار المسلمين واجمعوا على ترك ما سوى ذلك، قال هؤلاء ولا يجوز ان ينهى عن القراءة ببعض الاحرف السبعة ولا ان يجمعوا على ترك شيء من القرآن، وذهب جماهير العلماء من السلف والخلف واعتمد المسلمون الى ان هذه المصاحف العثمانية مشتملة على ما يحتمل رسمها فقط جامعة للعرضة الاخيرة التي عرضها النبي صلى الله عليه وسلم على جبرئيل عليه السلام متضمنة لها لم تنزل حرفاً منها، قلت وهذا القول هو الذي يظهر صوابه لان الاحاديث الصحيحة والاحاد المشهورة المستفيضة تدل عليه وتشهد له "

"رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عثمان نے جو مصاحف تیار فرماتے تھے وہ ساتوں حرفوں پر مشتمل ہیں یا نہیں؟ سو یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے،

چنانچہ فقہاء فتراء اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساقوں حروف پر مشتمل ہیں، اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اُمت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک کر دے جن پر قرآن نازل ہوا، اور صحابہ نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصاحف اُن صحیفوں سے نقل کئے تھے جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے لکھے تھے، اور اُن میں ہر ایک مصحف عالم اسلام کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تھا، اور اُن کے ماسوا جتنے صحیفے تھے اُن کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ یہ بات جائز ہے کہ حروف سبعة میں سے کسی حرف کی قراءت روک دی جائے، اور نہ یہ کہ صحابہؓ قرآن کے کسی حصّے کے چھوڑنے پر متفق ہو جائیں، اور سلف و خلف کے علماء کی اکثریت کا قول یہی ہے، کہ یہ عثمانی مصاحف اُن حروف پر مشتمل ہیں جو اُن کے رسم الخط میں سما گئے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف ان مصاحف میں جمع ہیں، اُن میں سے کوئی حرف ان مصاحف میں نہیں چھوڑا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ قول ہے جس کی صحت ظاہر ہے، کیونکہ صحیح احادیث اور مشہور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں اور اسی کی شہادت دیتے ہیں ﷺ

اور علامہ بدر الدین عینیؒ نقل فرماتے ہیں :-

واختلف الاصوليون هل يقرأ اليوم على سبعة أحرف فمنعه
الطبري وغيره وقال انما يجوز بحرف واحد اليوم وهو حرف
زَيْدٍ ونحوه الى القاضى ابوبكرؓ، وقال ابو الحسن الاشعريؒ
اجمع المسلمون على انه لا يجوز حظر ما وسعه الله تعالى
من القراءة بالحرف التي انزلها الله تعالى ولا يسوغ للممثلة

ان تمنع ما يطلعه الله تعالى، بل هي موجودة في قراءتنا مفترقة
 في القرآن غير معلومة فيجوز على هذا، وبه قال القاضي ان
 يقرأ بكل ما نقله اهل التواتر من غير تمييز حرف من حرف
 في حفظ حرف نائم بحرف الكسائي وحزمة ولا حرج في ذلك^۱۔
 ”اور اس بارے میں اصولی علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن کریم کو آج سات حرف پر
 پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ علامہ راہن جریہ طبری وغیرہ نے اس سے انکار
 کیا ہے اور کہا ہے کہ آج قرآن کی قراءت ایک ہی حرف پر جائز ہے، اور وہ حضرت
 زید بن ثابتؓ کا حرف ہے، اور قاضی ابوبکرؓ بھی اسی طرف مائل ہیں، لیکن امام
 ابوالحسن اشعریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
 جو حروف نازل کر کے اُمت کو سہولت عطا فرمائی تھی اسے روکنا کسی کے لئے
 جائز نہیں اور اُمت اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ جس چیز کی اجازت اللہ نے
 دی ہو اسے روک دے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ قراءت^۲
 میں موجود ہیں، اور قرآن کریم میں متفرق طور سے شامل ہیں، البتہ معین طور سے
 معلوم نہیں، اس لحاظ سے اُن کی قراءت آج بھی جائز ہے، اور یہی قول قاضی حنا
 کا ہے، جتنے حروف تواتر کے ساتھ منقول ہیں اُن سب کو پڑھنا جائز ہے، اور ایک
 حرف کو دوسرے حرف سے ممتاز کرنے کی بھی ضرورت نہیں، چنانچہ نافعؓ کی
 قراءت کو کسائیؒ اور حمزہؒ کی قراءت کے ساتھ مخلوط کر کے یاد کر لیا جاتے تو
 اس میں کچھ حرج نہیں ہے^۳۔

اور علامہ بدر الدین زرکشیؒ قاضی ابوبکرؓ کا قول نقل کرتے ہیں :-

۱۔ عمدة القاری، کتاب الخصومات، ص ۲۵۸ ج ۱۲،

۲۔ غالباً قاضی عیاضؒ مراد ہیں،

۳۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو النشر فی القراءات العشر، ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱

والسابع اختاره القاضي ابوبكر، وقال: الصحيح ان هذه الاحرف
السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم
وضبطها عنه الائمة واشتبها عثمان والصحابة في المصحف^۱۔
تساوان قول قاضي ابوبكر نے اختیار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ساتوں
حروف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں، ائمہ نے انہیں
محفوظ رکھا ہی، اور حضرت عثمانؓ اور صحابہؓ نے انہیں مصحف میں باقی رکھا ہے۔

اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حافظ ابن جریرؒ کے قول کی بڑے سخت الفاظ
میں تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ چھ حروف کو ختم کرنے کا قول بالکل غلط ہے، اور اگر
حضرت عثمانؓ ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے، کیونکہ عالم اسلام کا چپہ چپہ ان حروف
سبعہ کے حافطوں سے بھرا ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

وأما قول من قال بطلت الاحرف الستة فقد كذب من قال
ذلك ولو فعل عثمان ذلك أو اراده لخرج عن الاسلام ولما
مطل ساعة بل الاحرف السبعة كلها موجودة عندنا قائمة كما
كما كانت مثبتة في القرآت المشهورة المأثورة^۲۔

”ربا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو منسوخ کر دیا تو جس نے یہ بات کہی
ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے، اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرتے یا اس کا ارادہ کرتے
تو ایک ساعت کے توقف کے بغیر اسلام سے خارج ہو جاتے، بلکہ واقعہ یہ ہے

۱۔ البربان فی علوم القرآن، ص ۲۲۳ ج ۱۔ غالباً قاضی ابوبکر باقلانیؒ مراد ہیں، کیونکہ یہی عبارت
علامہ نوویؒ نے قاضی باقلانیؒ کے نام سے روایت کی ہے (نووی شرح مسلم، ص ۲، ج ۱)۔
۲۔ ابن حزمؒ: الفصل فی الملل والاہواء والخل، ص ۷۷، ۷۸، ج ۲ مکتبۃ المثنیٰ بغداد،
۳۔ علامہ ابن حزمؒ کا یہ قول اس صورت میں ہے جبکہ یوں کہا جاتا کہ حضرت عثمانؓ نے (معاذ اللہ)
چھ حروف کو منسوخ کر دیا، لیکن واضح رہے کہ حافظ ابن جریرؒ کے قول کے مطابق انہوں نے چھ حروف
کو منسوخ نہیں کیا بلکہ انکی قرأت ترک فرمائی تھی، اس لہٰذا اگرچہ حافظ ابن جریر طبریؒ کا قول درست
ہو لیکن وہ اتنے سخت الفاظ کے... مستحی نہیں ہیں،

کہ ساتوں کے ساتوں حروف ہمارے پاس بعینہ موجود اور مشہور اور قراتوں

میں محفوظ ہیں۔

اور مشہور شارح موطاء علامہ ابوالولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۹۴ھ) نے
”سبعة احرف“ کی تشریح سات وجوہ قرات سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

فان قيل هل تقولون ان جميع هذه السبعة الاحرف ثابتة في
المصحف فان القراءة بجميعها جائزة قيل لهم كذلك نقول،
والدليل على صحة ذلك قوله عز وجل اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ
وَإِنَّا لَهُ لَنَحَافِظُونَ، ولا يصح انفصال الذكرا المنزل من قراءته
فيمكن حفظه دونها وهما يدل على صحة ما ذهبنا اليه ان
ظاهر قول النبي صلى الله عليه وسلم يدل على ان المقران
انزل على سبعة احرف تيسيرا على من اراد قراءته ليقرا
كل رجل منهم بما تيسر عليه وبما هو اخف على طبعه و
اقرب الى لغته لما يلحق من المشقة بذلك المألوف
من العادة في النطق ونحن اليوم مع عجمة السنتنا و
بعدنا عن فصاحة العرب احوال

”اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا آپ کا قول یہ ہو کہ یہ ساتوں حروف مصحف میں
راج بھی موجود ہیں، اس لئے کہ ان سب کی قرات (آپ کے نزدیک)
جائز ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ جی ہاں ہمارا قول یہی ہے، اور اس کی صحت کی
دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ
لَنَحَافِظُونَ (ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے
والے ہیں) اور قرآن کریم کو اس کی قرات سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کو

محفوظ رہے اور اس کی قرارت ختم ہو جائیں اور ہمارے قول کی صحت پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کھلے طور پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا تاکہ اس کی قرارت کرنے والے کو آسانی ہو تاکہ ہر شخص اس طریقہ سے تلاوت کر سکے جو اس کے لئے آسان ہو اس کی طبیعت کے لحاظ سے زیادہ سہل اور اس کی لغت سے زیادہ قریب ہو، کیونکہ گفتگو میں جو عادت پڑ جاتی ہے اُسے ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے، اور آج ہم لوگ اپنی زبان کی عجیت اور عربی فصاحت سے دور ہونے کی بنا پر اس سہولت کے زیادہ محتاج ہیں۔

اور حضرت امام غزالیؒ اصول فقہ پر اپنی مشہور کتاب ”المستصفیٰ“ میں قرآن کریم کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:-

”مَّا نَقَلَ السَّابِقِينَ دَفْعِي الْمَصْحَفِ عَلَى الْأَحْرَفِ السَّبْعَةِ الْمَشْهُورَةِ
نَقْلًا مُتَوَاتِرًا“^۱

”وہ کلام جو مصحف کی دو دفتیوں میں مشہور سات حروف کے مطابق متواتر نقل پر ہم تک پہنچا ہے“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام غزالیؒ بھی حروف سبعة کے آج تک باقی رہنے کے قائل ہیں، اور ملا علی قاریؒ (متوفی ۱۰۱۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:-

”وَكَاثَرَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَشَفَ لَهُ أَنَّ الْقِرَاءَةَ الْمَتَوَاتِرَةَ تَسْتَقِرُّ
فِي أُمَّتِهِ عَلَى سَبْعٍ وَهِيَ الْمَوْجُودَةُ الْآنَ الْمَتَّفِقُ عَلَى تَوَاتُرِهَا وَالْجَبْهُو
عَلَى أَنَّ مَا فَوْقَهَا شَاذٌ لَا يَحِلُّ الْقِرَاءَةُ بِهِ“^۲

”اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ

۱۔ المستصفیٰ، ص ۶۵ ج ۱، المكتبة التجارية الكبرى، مصر ۱۳۵۶ھ

۲۔ مرقاة المفاتیح، ص ۱۶ ج ۵، مكتبة المدادیہ طمان، ۱۳۸۶ھ

متواتر قراتیں آپ کی اُمت میں آخر کار سات رہ جائیں گی، چنانچہ وہی آج موجود ہیں اور اُن کے متواتر اتفاق ہے، اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس کے علاوہ جو قراتیں ہیں وہ شاذ ہیں اور اُن کی تلاوت جائز نہیں۔“

اس میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا تو درست نہیں ہے کہ سات قرات توں کچھ ماسوا جتنی قراتیں ہیں وہ سب شاذ ہیں، کیونکہ علماء قرات نے اس کی سخت تردید کی ہے، لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک احرفِ سبعہ آج بھی باقی ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا قول سچھے گزر چکا ہے، کہ ”وہ سبتہ احرف میں سات کے عدد کو کثرت کے معنی پر محمول کرتے ہیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-“

”و دلیل بر آنکہ ذکر سبعہ سبب تکثیر است نہ برائے تحدید اتفاق ائمہ است بر قرات عشر دہر قراتے را ازین عشرہ دو راوی ست دہریکے با دیگرے مختلف ست پس مرتقی شد عدد قراۃ تا بیست“

”اور اس بات کی دلیل کہ سات کا عدد حدیث میں تکثیر کے لئے ہے نہ کہ تحدید کے لئے دس قرات توں پر ائمہ کا اتفاق ہے، اور اُن دس قرات توں میں سے ہر ایک کے دو راوی ہیں، اور ہر ایک دوسرے مختلف ہے، پس قرات کی تعداد بیس تک پہنچ گئی ہو“

اس عبارت میں اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ ”سبعہ“ کو جمہور کے خلاف تکثیر کے لئے قرار دیا ہے، (کیونکہ شاید بین قرات توں کو سات وجوہ اختلاف میں منحصر قرار دینا ان پر واضح نہیں ہو سکا) لیکن اس سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جن حروف کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قراتیں ہی ہیں اور وہ منسوخ یا متروک نہیں ہوئے، بلکہ آج بھی باقی ہیں

آخری دور میں دینی علوم کے امام، محقق عصر، اور حافظ حدیث حضرت علامہ
 اقدس شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے مسئلہ کی
 حقیقت مختصر الفاظ میں اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اُسے حرف آخر کہنا چاہئے، یہاں
 ہم اُن کی پوری تحقیق نقل کرتے ہیں :-

واعلم انهم اتفقوا على انه ليس المراد من سبعة احرف القراءة
 السبعة المشهورة، بان يكون كل حرف منها قراءة من تلك
 القراءات، اعني انه لا انطباق بين القراءات السبع والآخر
 السبعة كما يذهب اليه الوهم بالنظر الى لفظ السبعة في
 الموضعين، بل بين تلك الاحرف والقراءة عموم وخصوص
 وجهي، كيف، وان القراءات لا تنحصر في السبعة، كما صرح
 ابن الجزري في رسالة النشر في قراءة العشر، وانما اشهرت
 السبعة على الالسنه لانها التي جمعها الشاطبي ثم اعلم
 ان بعضهم فهم ان بين تلك الاحرف تغاير من كل وجه،
 بحيث لا يربط بينهما وليس كذلك، بل قد يكون الفرق بالمجرد
 والمزيد واخرى بالابواب، ومرة باعتبار الضيف من الغائب
 والحاضر، وطورا بتحقيق الهنزة وتسهيلها، فكل هذه
 التغييرات يسيرة او كانت او كثيرة حرف برأسه، وغلاط من
 فهم ان هذه الاحرف متغايرة كلها بحيث يتعد راجعها
 اما انه كيف عد السبعة فتوجه اليه ابن الجزري بحق
 ان التصرفات كلها ترجع الى السبعة وراجع القسطلاني و
 الذرقاني، بقي الكلام في ان تلك الاحرف كلها موجودة او رفع
 بعضها وبقي البعض فاعلم ان ما قرأه جبرئيل عليه السلام
 في العرصة الاخيرة على النبي صلى الله عليه وسلم كلمة

ثابت فی مصحف عثمانؓ، ولما يتعین معنی الاحرف عند ابن جریر
 ذهب الى رفع الاحرف الست منها وبقى واحد فقط^۱
 یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ سات حروف سے مراد
 مشہور سات قراءتیں نہیں اور یہ بات نہیں ہے کہ ہر حرف ان سات قراءتوں
 میں سے ایک قراءت ہو، مطلب یہ ہے کہ سات قراءتیں اور سات حروف ایک
 چیز نہیں جیسے کہ سات کے لفظ سے پہلی نظر میں دہم ہوتا ہے، بلکہ ان حروف اور
 سات قراءتوں میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے، اور یہ دونوں ایک کسو
 ہو سکتے ہیں جبکہ قراءتیں سات میں منحصر نہیں، جیسا کہ علامہ ابن الجوزیؒ نے
 النشر فی قراءۃ العشر میں تصریح کی ہے، البتہ سات قراءتوں کا لفظ زبان پر
 اس لئے مشہور ہو گیا کہ علامہ شاطبیؒ نے انہی سات قراءتوں کو جمع کیا ہے،
 چھو یہ بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ یہ سمجھے ہیں کہ سات حروف کے درمیان
 کلی تغایر ہے، اور ان میں کوئی باہم ربط نہیں ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں
 بلکہ بعض اوقات دو حروف میں فرق صرف صیغۂ مجرّد اور صیغۂ مزید کا ہوتا
 ہے اور بعض مرتبہ صرف (صرفی) ابواب کا، اور بعض دفعہ غائب و حاضر کے
 صیغوں کا اور کبھی صرف ہمزہ کو باقی رکھنے اور اس کی تسہیل کرنے کا، پس یہ
 تمام تغیرات خواہ معمولی ہوں یا بڑے بڑے مستقل حروف ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھی
 ہیں کہ حروف کے درمیان کلی تغایر ہے، اور ان کا (ایک کلمہ میں) جمع ہونا ممکن

۱۔ فیض الباری، ص ۳۲۱، ۳۲۲ ج ۳، ۴۔ مطلب یہ ہے کہ سات قراءتوں میں سے بعض قراءتیں
 احرف سبعہ میں سے ہیں، جیسے کہ تمام متواتر قراءات اور بعض قراءتیں ایسی ہیں جو احرف سبعہ میں داخل
 نہیں مثلاً قرآن سبعہ کی شاذ قراءتیں، یا وہ قراءتیں جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور احرف سبعہ
 کے بعض اختلافات ایسے ہیں جو قراءات سبعہ میں شامل نہیں، مثلاً امام یعقوبؒ، امام ابو جعفرؒ اور
 خلفؒ کی متواتر قراءتیں کہ یہ احرف سبعہ میں ہیں، مگر معروف قراءات سبعہ میں سے نہیں ۱۲ محمد تقی

اُن سے غلطی ہوئی ہے، رہی یہ بات کہ حدیث میں سات کے عدد کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا جواب علامہ ابن الجوزیؒ نے دیا ہے، اور تحقیق یہ بیان کی ہے کہ یہ سائرے تغیرات سات قسم کے ہیں، اور اس مسئلہ میں قسطلانیؒ اور زرقانیؒ کی مراجعت بھی کر لیجیے،

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ تمام حروف موجود ہیں، یا ان میں سے بعض ختم کر دیئے گئے، اور بعض باقی ہیں، پس یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جتنے حروف حضورؐ کے ساتھ قرآن کے دور میں پڑھے تھے وہ سب حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود ہیں، اور چونکہ علامہ ابن جبریرؒ پر حروف کے معنی واضح نہیں ہو سکے، اس لئے انھوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا کہ کچھ حروف ختم ہو گئے، اور صرف ایک باقی رہ گیا۔

اسی طرح مصر کے علماء متاخرین میں سے مشہور محقق علامہ زاہد الکوثریؒ (متوفی ۱۳۸۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:-

والدول رأی القائلین بان الاحرف السبعة كانت في ميد
الامر ثم نسخت بالعرضة الاخيرة في عهد النبي صلى الله
عليه وسلم فلم يبق الا حرف واحد ورأى القائلين بان
عثمان رضي الله عنه، جمع الناس على حرف واحد ومنع من
الستة الباقية لمصلحة، واليه نجا ابن جبرير وتهييئه
ناس فتابعوه لكن هذا رأی خطير قام ابن حزم باشتد
النكير عليه في الفصل وفي الاحكام وله الحق في ذلك والثاني
رأى القائلين بانها هي الاحرف السبعة المحفوظة كما هي
في العرضة الاخيرة، الخ

”پہلی رائے (کہ موجودہ قراءات ایک ہی حرف کی مختلف شکلیں ہیں) اُن حضرات کی ہجو یہ کہتے ہیں کہ سات حروف ابتداء اسلام میں تھے، پھر عرضہ اخیرہ (حضرت جبریلؑ سے حضورؐ کے آخری دور) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں منسوخ ہو گئے، اور اب صرف ایک باقی رہ گیا، نیز یہی رائے اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک حرف پر جمع کر دیا تھا، اور ایک مصلحت کی وجہ سے باقی چھ حروف کی قرابت روک دی تھی، حافظ ابن جریرؒ کا یہی مسلک ہے، اور بہت سے لوگ اس معاملہ میں اُن سے مرعوب ہو کر اُن کے پیچھے لگ گئے، لیکن درحقیقت یہ بڑی سنگین اور خطرناک رائے ہے، اور علامہ ابن حزمؒ نے ”الفصل“ اور ”الاحکام“ میں اس پر سخت ترین نکیر ہے، جس کا انھیں حق تھا، اور دوسری رائے (کہ موجودہ قراءت ہی) احرف سبعہ ہیں، اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ حروف ہیں جو عرضہ اخیرہ کے مطابق محفوظ چلے آتے ہیں۔“

ہم نے یہ تمام اقوال تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کئے ہیں کہ آجکل علامہ ابن جریر طبریؒ کا قول ہی زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اور علامہ ابن جریرؒ کی جلیل القدر شخصیت کے پیش نظر اسے عموماً ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے، اس کی بناء پر ابن الجریؒ کا یہ بے غبار قول یا تو لوگوں کو معلوم نہیں ہے، یا اگر معلوم ہے تو اسے ایک ضعیف قول سمجھا جاتا ہے، حالانکہ گزشتہ بحث کی روشنی میں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالکؒ، علامہ ابن قتیبہؒ، علامہ ابوالفضل رازیؒ، قاضی ابوبکر ابن الطیبؒ، امام ابوالحسن شعریؒ، قاضی عیاضؒ، علامہ ابن حزمؒ، علامہ ابوالولید باجیؒ، امام غزالیؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ساتوں حروف آج بھی محفوظ اور باقی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرضہ اخیرہ کے وقت جتنے حروف باقی رہ گئے تھے اُن میں سے کوئی نہ منسوخ ہوا، نہ اُسے ترک کیا گیا، بلکہ محقق ابن الجریؒ نے اپنے اس قول کو اپنے سے پہلے جمہور علماء کا

مسلک قرار دیا ہے، علماء متاخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور علامہ زاہد کوثریؒ کا بھی یہی قول ہے، نیز مصر کے مشہور علماء علامہ محمد نجیب مطیعؒ، علامہ خضریٰ دمیاطیؒ اور شیخ عبد العظیم زرقانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، لہذا دلائل سے قطع نظر، محض شخصیات کے لحاظ سے بھی یہ قول بڑا وزنی قول ہے،

اُس قول کے دلائل | اب وہ دلائل ذیل میں پیش خدمت ہیں جن سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، اس کے کچھ دلائل تو مذکورہ بالا

اقوال میں آچکے ہیں، مزید مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ قرآن کریم کی آیت **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ**

ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جو آیات قرآنی خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ نہ فرمائی ہوں وہ قیامت تک باقی رہیں گی، دوسری طرف پیچھے وہ احادیث گزر چکی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ قرآن کے ساتوں حروف منزل من اللہ تھے، اس لئے مذکورہ آیت کا واضح تقاضا یہی ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں

۲۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر مصحف تیار کیا ہوتا تو اس کی کہیں کوئی صراحت تو ملنی چاہئے تھی، حالانکہ نہ ضرر اس کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحف عثمانی میں ساتوں حروف موجود تھے، مثلاً روایات میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا مصحف حضرت ابوبکرؓ کے جمع فرمودہ صحیفوں کے مطابق لکھوایا تھا، اور لکھنے کے بعد دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا، جس کے بارے میں خود حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں :-

فحضرت المصحف علیہا فلم یختلفنا فی شئی، لہ
 ”میں نے مصحف کا مقابلہ ان صحیفوں سے کیا تو دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا“

اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن جریر طبریؒ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے
 میں ساتوں حروف موجود تھے، اس لئے حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں میں قرآن کریم کو قیثاً
 ان ساتوں حروف پر لکھا گیا ہو گا، لہذا اگر حضرت عثمانؓ نے کچھ حروف کو ختم کر دیا ہوتا
 تو حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ ارشاد کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ”دونوں میں کوئی اختلاف
 نہیں تھا“

۳۔ علامہ ابن الانباریؒ نے کتاب المصاحف میں حضرت عبیدہ سلمانیؓ کا جو
 مشہور تابعی ہیں یہ قول نقل فرمایا ہے :-

قراءتنا التي جمع الناس عثمانؓ علیہا هي العشرة الاخرى
 ”ہماری وہ قراءت جس پر حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع فرمایا وہ عشرۃ اخیرہ
 کی قراءت تھی“

حضرت عبیدہؓ کا یہ قول اس بات پر بالکل صریح ہے کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے
 اُن حروف میں سے کوئی نہیں چھوڑا، جو عشرۃ اخیرہ (حضرت جبریلؑ کے ساتھ حضورؐ
 کے آخری قرآنی دور) کے وقت باقی تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ
 کا آخری دور صرف ایک حرف قریش پر ہوا تھا، اور اسی پر حضرت عثمانؓ نے سب کو
 جمع کر دیا، لیکن یہ بات بہت بعید ہے کہ جو حروف منسوخ نہیں ہوئے تھے وہ اس
 دور سے خارج رہے ہوں،

۵۔ حضرت محمد بن سیرینؒ بھی مشہور تابعی ہیں، علامہ ابن سعدؒ نے اُن کا یہ قول

لہ مشکل الآثار، ص ۱۹۳ ج ۴، ۵ کنز العمال، حدیث نمبر ۴۸۴۰ ج ۱، دائرۃ المعارف
 دکن، ۱۳۱۸ھ، یہی روایت حافظ ابن حجرؒ نے بھی مسند احمدؒ ابن ابی داؤدؒ اور طبریؒ کے حوالہ سے
 نقل کی ہے (فتح الباری، ص ۹۳۶)۔

نقل فرمایا ہے:-

”کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
کلّ عامّ مرّة فی رمضان فلما کان العامّ الذی توفی فیہ
عرضہ علیہ مرتین، قال محمّد، فأنا رجوان تكون قراءتنا
العرضة الاخيرة ۛ

”حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ رمضان میں حضورؐ کے سامنے
قرآن پیش کیا کرتے تھے، چنانچہ جب وہ سال آیا جس میں آپؐ کی وفات ہوئی
تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو مرتبہ قرآن پیش کیا، پس مجھے امید ہے کہ
ہماری موجودہ قراءت اس عرضہ اخیرہ کے مطابق ہے۔“

۶۔ حضرت عامر شعبیؓ بھی مشہور تابعی ہیں، اور انھوں نے اس صحابہؓ سے استفادہ کیا ہے،
علامہ ابن الجوزیؒ نے ان سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے،
یہ تینوں حضرات تابعی ہیں اور حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہنایت قریب ہیں،
اس لئے اُن کا قول اس باب میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے،

۷۔ پورے ذخیرہ احادیث میں ہمیں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے
یہ ثابت ہو کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک سائے
حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءتوں کا اختلاف، اس کے بجائے بہت سی روایتوں
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کے اختلاف پر سب وقت
”اختلاف قراءت“ اور ”اختلاف احرف“ دونوں الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے، مثال
کے طور پر حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں:-

كنت بالمسجد فدخل رجل يصلي فقرأ قراءة ۛ نكرتها عليه و

ودخل آخر قراءة سوى قراءة صاحبه فلما قضيها الصلوة
دخلنا جميعاً على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت ان
هنا اقرأ قراءة انكرها عليه ودخل آخر فقرا قراءة سوى
قراءة صاحبه فامرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم فقرا
فحسن النبي صلى الله عليه وسلم شأنهما فسقط في نفسي
من التكذيب ولا اذ كنت في الجاهلية فلما رأي رسول الله صلى
الله عليه وسلم ما قد غشيتني ضرب في صدرى ففضت
عرقاً وكأنا النظر الى الله فرقا فقال لي يا أباي ان ربي عز وجل
ارسل الى ان اقرأ القرآن الى حرف فرددت اليه ان هوون
على أمتي فردّ الى الثانية اقرأه على حرفين فرددت اليه
ان هوون على أمتي فردّ الى الثالثة اقرأه على سبعة احرف
میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص داخل ہو کر نماز پڑھنے لگا، اس نے ایک ایسی قرات
پڑھی جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کی
قرات کے سوا ایک اور قرات پڑھی، پس جب ہم نے نماز ختم کر لی تو ہم سب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص
نے ایک ایسی قرات پڑھی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص
آیا اس نے پہلے شخص کی قرات کے سوا ایک دوسری قرات پڑھی، اس پر
آپ نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا، ان دونوں نے قرات کی تو حضور نے
دونوں کی تحسین فرمائی، اس پر میرے دل میں تکذیب کے ایسے وسوسے آنے لگے
کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات نہیں آتے تھے، پس جب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر مارا جس سے میں پسینہ میں

میں شرابور ہو گیا، اور خوف کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اللہ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ اے ابی! میرے پروردگار نے میرے پاس پیغام بھیجا تھا، کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمائے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن دو حرفوں پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمائے، تو اللہ تعالیٰ نے تیسری بار پیغام بھیجا کہ میں اسے سات حرفوں پر پڑھوں۔“

اس روایت میں حضرت ابی بن کعبؓ دونوں اشخاص کے اختلاف تلاوت کو بار بار اختلاف قراءت سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کے اختلاف سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ قراءت کے اختلاف اور حروف کے اختلاف کو عہد رسالت میں ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا، اور اس کے خلاف کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو دونوں کی جداگانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اور جب قراءت کا محفوظ ہونا تو اترا اور اجماع سے ثابت ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ احرف سبعہ آج بھی محفوظ ہیں،

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حروف سبعہ کا جتنا حصہ عرصہ اخیرہ کے وقت باقی رہ گیا تھا وہ سارا کا سارا عثمانی مصاحف میں محفوظ کر لیا گیا تھا، اور وہ آج تک محفوظ چلا آتا ہے، نہ اسے کسی نے منسوخ کیا اور نہ اس کی قراءت ممنوع قرار دی گئی، لیکن ضروری ہے کہ مکمل وضاحت کے لئے ان ممکنہ سوالات کا جواب بھی دیا جائے جو اس قول پر وارد ہو سکتے ہیں،

اس قول پر وارد ہونے والے
 سوالات اور ان کا جواب

(۱) اس قول پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساتوں حروف کو باقی رکھا ہے تو پھر ان کا وہ امتیازی کارنامہ کیا تھا جسکی

وجہ سے اُن کو ”جامع قرآن“ کہا جاتا ہے ۱

اس کا جواب یہ ہو کہ اگرچہ قرآن کریم بے شمار صحابہ کو پورا یاد تھا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم کا معیاری نسخہ صرف ایک تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتب فرمایا تھا، یہ نسخہ بھی مصحف کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ ایک ایک سُورۃ علیحدہ علیحدہ صحیفوں میں لکھی ہوتی تھی، لیکن بعض صحابہؓ نے انفرادی طور پر اپنے اپنے مصاحف الگ الگ تیار کر رکھے تھے، اُن میں نہ رسم الخط متحد تھا، نہ سورتوں کی ترتیب یکساں تھی، اور نہ ساتوں حروف جمع تھے، بلکہ ہر شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس حرف کے مطابق قرآن سیکھا تھا اسی کو اپنے طور پر لکھ لیا تھا، اس لئے کسی مصحف میں کوئی آیت کسی حرف کے مطابق لکھی ہوئی تھی، اور دوسرے مصحف میں کسی اور حرف کے مطابق، جب تک ہمدردِ رسالتؐ قریب تھا اور مسلمانوں کا تعلق مرکز اسلام یعنی مدینہ طیبہ سے مضبوط اور مستحکم تھا، مصاحف کے اس اختلاف سے کوئی قابلِ ذکر خرابی اس لئے پیدا نہ ہو سکی کہ قرآن کریم کی حفاظت میں اصل مدار مصاحف کے بجائے حافظہ پر تھا، اور صحابہؓ کی اکثریت اس بات سے باخبر تھی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، لیکن جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا اور نئے نئے لوگ مسلمان ہوتے تو انھوں نے صرف ایک ایک طریقے سے قرآن سیکھا، اور یہ بات ان میں عام نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس لئے ان میں اختلاف پیش آنے لگا، بعض لوگ اپنی قراءت کو حق اور دوسرے کی قراءت کو باطل سمجھنے لگے، ادھر چونکہ انفرادی طور پر تیار کئے ہوئے مصاحف بھی، حرف اور رسم الخط کے اعتبار سے مختلف تھے، اور ان میں حروف سبعہ یحج کرنے کا اہتمام نہیں تھا، اس لئے کوئی ایسا معیاری نسخہ ان کے پاس موجود نہیں تھا جس کی طرف رجوع کر کے اختلاف رفع کیا جاسکے،

ان حالات میں حضرت عثمانؓ نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورتِ حال برقرار رہی اور انفرادی مصاحف کو ختم کر کے قرآن کریم کے معیاری نسخہ عالم اسلام میں نہ پھیلاؤ گئے تو زبردست فتنہ رونا ہوجائے گا، اس لئے انھوں نے مندرجہ ذیل کام کئے :-

۱۔ قرآن کریم کے سات معیاری نسخے تیار کر لئے اور انھیں مختلف اطراف میں روانہ کر دیا،

۲۔ ان مصاحف کا رسم الخط ایسا رکھا کہ اس میں ساتوں حروف سما جائیں، چنانچہ یہ مصاحف نقطوں اور حرکات سے خالی تھے، اور انھیں ہر حرف کے مطابق پڑھا جاسکتا تھا۔
۳۔ جتنے انفرادی مصاحف لوگوں نے تیار کر رکھے تھے ان سب کو نذر آتش کر کے دفن کر دیا،

۴۔ یہ پابندی عائد کر دی کہ آئندہ جتنے مصاحف لکھے جائیں وہ سب ان سات مصاحف کے مطابق ہونے چاہئے،

۵۔ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفے الگ الگ سورتوں کی شکل میں تھے، حضرت عثمانؓ نے ان سورتوں کو مرتب کر کے ایک مصحف کی شکل دیدی،

ان اقدامات سے حضرت عثمانؓ کا مقصد یہ تھا کہ پورے عالم اسلام میں رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں حروف سب سے اس طرح جمع ہو جائیں کہ بعد میں کسی شخص کو کسی صحیح قراءت سے انکار کرنے یا غلط قراءت پر اصرار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے، اور اگر کبھی قراءت میں کوئی اختلاف رونما ہو تو مصحف کی طرف رجوع کر کے اُسے باسانی رفع کیا جاسکے،
یہ بات حضرت علیؓ کے ایک ارشاد سے واضح ہے جو امام ابن ابوداؤدؒ نے کتاب المصنوع میں صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے:-

قال علیؓ لا تقولوا فی عثمانؓ الا خیر اقول الله ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملأمتنا، قال، ما تقولون فی هذه القراءۃ فقد بلغنی ان بعضهم یقول ان قراءتی خیر من قراءتک، وهذا یکاد ان یکون کفراً، قلنا فما تری؟ قال أری أن نجسم الناس علی مصحف واحد فلا تكون فرقة ولا اختلاف، قلنا فنعم ما رأیتؑ

۱۔ کتاب المصاحف، لابن ابی داؤدؒ، ص ۲۲ مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۵۵ھ و فتح الباری ص ۱۵ ج ۹،

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا، انھوں نے ہم سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قرأتوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ ”میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے“ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے حضرت عثمانؓ سے کہا: ”پھر آپ کی کیا رائے ہے؟“ انھوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ پھر کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے، ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی ہے۔“

یہ حدیث حضرت عثمانؓ کے کام کے بارے میں واضح ترین حدیث ہے، اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ”تصحیح الناس علی مصحف واحد“ فرما کر یہ ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ ہم ایک ایسا مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پورے عالم اسلام کے لئے یکساں ہو، اور اس کے ذریعہ باہمی اختلافات کو ختم کیا جاسکے، اور اس کے بعد کسی قرأت کے انکار اور منسوخ یا شاذ قرأت پر اصرار کی گنجائش باقی نہ رہے، نیز ابن ہشتمہؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ:-

اختلفوا فی القرآن علی عهد عثمان حتی اقتتل القلامان المعلنون
فبلغ ذلك عثمان بن عفان فقال عندی تکن بون وتلحنون فیہ
فمن نأی عنی کان أشد نکذ یبأ واکثر لحنا، یا اصحاب محمد
اجتمعوا فاکتبا للناس اماماً

حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے بارے میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ بچے اور معلمین لڑنے لگے، یہ اطلاع حضرت عثمانؓ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا

کہ تم میرے قریب رہتے ہوئے (صحیح قراءتوں کی) تکذیب کرتے ہو اور اس میں غلطیاں کرتے ہو، لہذا جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور غلطیاں کرتے ہوں گے، پس اے اصحابِ محمدؐ جمع ہو جاؤ، اور لوگوں کے لئے ایک ایسا نسخہ تیار کر دو جس کی اقتدار کی جائے۔“

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مقصد قرآن کے کسی حرف کا ختم کرنا نہیں تھا، بلکہ انھیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ صحیح حروف کا انکار کر رہے ہیں اور بعض لوگ غلط طریقہ بے تلاوت پر اصرار کر رہے ہیں، اس لئے وہ ایک معیاری نسخہ تیار کرنا چاہتے تھے، جو پوری دنیا کے سلام کے لئے یکساں ہو۔

لغت قریش پر لکھنے کا مطلب (۲) یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی قیادت میں مصحفِ قرآنی مرتب کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، تو ان سے فرمایا تھا:-

اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابتؓ فی شیء من القرآن فاكتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانہمؑ

”جب تمھارے اور حضرت زید بن ثابتؓ کے درمیان قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان پر نازل ہوا ہے۔“

۱۔ بہت سے علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل کی یہی تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہوا الفصل فی الملل و الاہواء والنحل: ابن حزمؒ، ص ۷۷ ج ۱، مکتبۃ المثنیٰ بغداد، اور البیان فی علوم القرآن: مولانا عبدالحق حقانی، باب نمبر ۲ فصل نمبر ۲، ص ۶۲ مطبوعہ نعیمیہ دیوبند و مناہل العرفان: للزرقانی ج ۲ ص ۲۴۸ تا ۲۵۶ ج ۱،

۲۔ صحیح بخاری باب جمع القرآن مع فتح الباری ص ۱۶ ج ۹،

.... اگر حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف باقی رکھے تھے تو اس ارشاد کا کیا مطلب ہو؟
 اس کا جواب یہ ہو کہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی وہ جملہ ہے
 جس سے حافظ ابن جریرؒ اور بعض دوسرے علماء نے یہ سمجھا ہو کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف
 ختم کر کے صرف ایک حرف قریش کو مصحف میں باقی رکھا تھا، لیکن درحقیقت اگر حضرت
 عثمانؓ کے اس ارشاد پر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب سمجھنا
 درست نہیں ہو کہ انھوں نے حرف قریش کے علاوہ باقی چھ حروف کو ختم فرما دیا تھا بلکہ
 مجموعی روایات دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے حضرت عثمانؓ کا یہ مطلب
 تھا کہ اگر تہران کریم کی کتابت کے دوران رسم الخط کے طریقے میں کوئی اختلاف ہو تو
 قریش کے رسم الخط کو اختیار کیا جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی اس ہدایت
 کے بعد صحابہؓ کی جماعت نے جب کتابت قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں
 اُن کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش آیا، جس کا ذکر امام زہریؒ نے اس طرح فرمایا ہے:-

فَاخْتَلَفُوا يَوْمَئِذٍ فِي التَّابُوتِ وَالتَّابُوتِ فَقَالَ التَّفْهِيُّ الْقَشِيرِيُّ
 التَّابُوتُ وَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ التَّابُوتُ فَرَفَعَ اخْتِلَافَهُمْ إِلَى عُمَرَ
 فَقَالَ اكْتُبُوا التَّابُوتَ فَإِنَّهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ نَزَلَ

”چنانچہ اس موقع پر اُن کے درمیان ”تابوت“ اور ”تابوہ“ میں اختلاف ہوا،
 قریشی صحابہؓ کہتے تھے کہ تابوت (بڑی تار سے لکھا جائے) اور حضرت زید بن
 ثابتؓ فرماتے تھے کہ تابوہ (گول تار سے لکھا جائے)، پس اس اختلاف
 کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا جس پر انھوں نے فرمایا کہ
 اسے التابوت لکھو، کیونکہ قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے۔“
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ اور قریشی صحابہؓ
 کے درمیان جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد رسم الخط کا اختلاف تھا نہ کہ لغات کا۔

مراد الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ (۳) تیسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبقتاً احرف کے اختلاف کی جو تشریح فرمائی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حروف مصاحف عثمانی میں

شامل نہیں ہو سکے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں:-

اَنْ جَبْرِیْلُ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اقْرَأْ الْقُرْآنَ عَلٰی حُرُوفٍ، قَالَ مِثْکَ اَنْبِیِّ
اسْتَزَدَہُ حَتّٰی بَلَغَ سَبْعَۃَ اَحْرِفٍ، قَالَ کُلُّ شَیْءٍ کَافٍ مَا لَمْ
تَخْلُطْ اٰیۃَ عَذَابٍ بِرَحْمَۃٍ اَوْ رَحْمَۃَ عَذَابٍ نَحْوَ قَوْلِكَ تَعَالٰی
وَاَقْبِلْ وَهَلْکُمْ وَاذْهَبْ وَاَسْرِعْ وَعَجِّلْ

”جبریل علیہ السلام نے (حضرت سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھئے، میکائیل علیہ السلام نے حضور سے کہا اس میں اضافہ کروائیے، یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تا وقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کر دیں، یہ ایسا ہی ہوگا، جیسے آپ تعالیٰ (آؤ) کے معنی کو اَقْبِلْ، هَلْکُمْ، اِذْهَبْ، اَسْرِعْ اور عَجِّلْ کے الفاظ سے ادا کریں“

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبقتاً احرف کا اختلاف درحقیقت مراد الفاظ کا اختلاف تھا، یعنی ایک حرف میں کوئی ایک لفظ اختیار کیا گیا تھا، اور دوسرے حرف میں اسی کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، حالانکہ عثمانی مصاحف میں جو قراتیں جمع ہیں اُن کے درمیان مرادفات کا یہ اختلاف بہت کم، ان قراتوں میں جو اختلاف ہے وہ زیادہ تر حرکات، صیغوں، تذکیر و تانیث اور لہجوں کا اختلاف ہے،

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نے ”سات حروف“ کی جس تشریح کو اختیار کیا ہے اس میں قراتوں کے درمیان سات قسم کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں اُن سات

۱۵ یہ الفاظ مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں (ادجز المسالک، ص ۳۵۷ ج ۲)

اقسام میں سے ایک قسم بدلیت مراد فہ کا اختلاف ہے، حضرت ابوبکرؓ نے یہاں سات حروف کے مکمل تشریح نہیں فرمائی، بلکہ اس کی صرف ایک مثال دی ہے، اس لئے اختلاف کی صرف ایک قسم یعنی اختلاف الفاظ بدلیت کا ذکر فرمایا ہے،

اب اختلاف قراءت کی یہ قسم یعنی اختلاف الفاظ ابتداء اسلام میں بہت زیادہ تھی، چونکہ تمام اہل عرب لغت قریش کے پوری طرح عادی نہ تھے، اس لئے شروع میں انھیں یہ سہولت زیادہ سے زیادہ دی گئی تھی، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے ہوئے متبادل الفاظ میں سے جس لفظ کے ساتھ چاہیں تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ شروع میں ایسا بکثرت تھا کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہو اور دوسری قراءت میں اس کا ہم معنی دوسرا لفظ، لیکن جب لوگ لغت قرآن سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو اختلاف قراءت کی یہ قسم رفتہ رفتہ کم کر دی گئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ سے قرآن کریم دُورِ تہبہ دُور فرمایا، اس وقت بہت سے الفاظ منسوخ کر دیئے گئے، اور اس طرح الفاظ مرادفہ کا اختلاف بہت کم رہ گیا،

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ الفاظ مرادفہ اپنے مصاحف میں جمع نہیں فرمائے، جو اس آخری دور میں منسوخ ہو چکے تھے، کیونکہ اُن کی حیثیت اب منسوخ التلاوة آیات کی سی تھی، البتہ قراءتوں کا جو اختلاف آخری دور میں بھی باقی رکھا گیا تھا، اسے حضرت عثمانؓ نے جُوں کا توں باقی رکھا، لہذا حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ نے حروف کے اختلاف کی جو قسم مذکورہ حدیث میں بطور مثال مذکور فرمائی ہے وہ قسم ہے جس کی بیشتر جزئیات عرضہ اخیرہ کے وقت منسوخ ہو چکی تھیں، چنانچہ وہ مصاحف عثمانی میں شامل نہیں ہو سکیں، اور نہ موجودہ قراءت اُن پر مشتمل ہیں،

مذکورہ بالا نتائج تین مقدمات سے مستنبط ہوتے ہیں :-

(۱) عرضہ اخیرہ (حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ حضورؐ کے آخری قرآنی دور)

کے وقت قرآن کریم کی متعدد قراتیں منسوخ کی گئی تھیں،
(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف عثمانی کو عرضہ اخیرہ کے مطابق ترتیب دیا،

(۳) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں مراد الفاط کا وہ اختلاف موجود نہیں ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمایا ہے،

جہاں تک تیسرے مقدمہ کا تعلق ہے وہ تو بالکل ظاہر ہے، اور دوسرے مقدمہ کے دلائل ہم بھی بیان کر چکے ہیں، جن میں سے صریح ترین دلیل حضرت عبیدہ سلمانیؓ کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ہمیں جس قرات پر جمع کیا وہ عرضہ اخیرہ کے مطابق تھی،

اب پہلا مقدمہ باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عرضہ اخیرہ کے وقت متعدد قراتیں منسوخ ہو گئی تھیں، اس کی دلیل محقق ابن الجریؒ کا یہ ارشاد ہے :-

ولاشك ان القرآن نسخ منه وغيره في العرصة الاخيرة
فقد صح النص بذلك عن غير واحد من الصحابة وروينا
باسناد صحيح عن زر بن حبیش قال قال لي ابن عباس
اتى القراءتين تقرأ قلت الاخيرة قال فان النبي صلى الله
عليه وسلم كان يعرض القرآن على جبرئيل عليه السلام في
كل عام مرة قال فعرض عليه القرآن في العام الذي قبض
فيه النبي صلى الله عليه وسلم مرتين فشهد عبد الله
يعني ابن مسعود ما نسخ منه وما بدل

”اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرضہ اخیرہ کے موقع پر قرآن کریم میں بہت کچھ

۱۔ کنز العمال، حدیث ۴۸۴ ص ۲۸۶ ج ۱،

۲۔ النشر فی القراءات العشر، ص ۳۲ ج ۱،

منسوخ کیا گیا اور بدلایا گیا ہے، کیونکہ اس کی تصریح متعدد صحابہؓ سے منقول ہے۔ ہم تک صحیح سند کے ساتھ حضرت زبیرؓ کا یہ قول پہنچا ہے کہ مجھ سے ابن عباسؓ نے پوچھا تم کو نسی قرأت پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ آخری قرأت، انھوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، پس جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اُس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا، اس موقع پر جو کچھ منسوخ ہوا اور جس قدر تبدیلی کی گئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس کے شاہد تھے ۱۱

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عرصہ اخیرہ کے وقت بہت سی قراتیں خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے منسوخ قرار دیدی گئی تھیں، حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے مراد الفاظ کے جن اختلاف کا ذکر فرمایا ہے اُس کی بہت سی جزئیات بھی یقیناً اسی وقت منسوخ ہو گئی ہوں گی، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے عرصہ اخیرہ کے مطابق مصحف تیار کرائے ہیں، ان میں الفاظ مرادفہ کا اختلاف بہت شاذ و نادر ہے،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۴۲) مذکورہ بالا تحقیق پر جو تھا اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ متعدد روایات سے ثابت ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حج قرآن کا جو کارنامہ

اور اُن کا مصحف ؛

انجام دیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس سے خوش نہیں تھے، اور انھوں نے اپنا مصحف بھی نذر آتش نہیں ہونے دیا، اگر حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم نہیں فرماتے تھے تو پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وجہ اعتراض کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کے کام پر دو اعتراض تھے، ایک یہ کہ کتابت قرآن کے کام میں انھیں کیوں شریک

۱۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس مضمون کی متعدد روایات مختلف محدثین کے حوالوں سے نقل کی ہیں، (فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

میں کیا گیا؟ دوسرے یہ کہ دوسرے مصاحف کو نذر آتش کیوں کیا گیا؟ پہلے اعتراض کا ذکر صحیح ترمذی کی ایک روایت میں امام زہریؒ نے فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ شکایت تھی کہ کتاب قرآن کا اُن کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا جبکہ انھوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلہ میں زیادہ طویل عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کیا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں شروع کیا تھا اور حضرت ابن مسعودؓ اُس وقت کوفہ میں تھے، اور حضرت عثمانؓ اُن کے انتظار میں یہ کارِ خیر مؤخر فرمانا نہیں چاہتے تھے، اس کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا، اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ جمع و ترتیب قرآن کا یہ حملہ بھی انہی کے ہاتھوں انجام پائے،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ نے یہ نسخہ مصحف تیار کرنے کے بعد باقی تمام انفرادی مصاحف کو نذر آتش کرنے کا حکم دیدیا تھا، اور وہ وہ اپنا مصحف نذر آتش کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ انھیں سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، لیکن انھوں نے فرمایا کہ: واللہ لا اذفعہ الیہم، اقرأنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بضعا وسبعین سورۃ ثم اذفعہ الیہم، واللہ لا اذفعہ الیہم، خدا کی قسم میں یہ مصحف ان کے حوالہ نہیں کروں گا، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر سے زیادہ سورتیں سکھائی ہیں، پھر میں یہ مصحف انھیں دیوں؟

۱۔ فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱

۲۔ مستدرک حاکم، ص ۲۲۸ ج ۲، دائرة المعارف دکن، ص ۱۷۳، قال الحاکم: "ہذا حدیث صحیح الاسناد واقرہ الذہبی"

خدا کی قسم میں انہیں نہیں دوں گا،

جن حضرات نے کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق اپنے مصاحف لکھ رکھے تھے، حضرت ابن مسعودؓ نے انہیں بھی یہی ترغیب دی کہ وہ اپنے مصاحف حوالہ نہ کریں حضرت خیم بن مالکؓ فرماتے ہیں:-

”اسر بالمصاحف ان تغیر، قال قال ابن مسعودؓ من استطاع منکم ان یغلّ مصحفه فلیغلّه، ثم قال قرأت من فم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبعین سورۃ، أفأترک ما اخذت من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلىٰ آلہ وصحبہ وسلم“

”مصحف میں تبدیلی کا حکم دیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے (لوگوں سے) فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے مصحف کو چھپا سکے وہ مزدور چھپالے پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سو تین بڑی ہی تو کیا میں وہ چیز چھوڑ دوں جو میں نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے حاصل کی ہے؟“

اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف عثمانی مصاحف سے کچھ مختلف تھا، اور آپ اسے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس میں کیا چیزیں عثمانی مصحف سے مختلف تھیں؟ اس کی صراحت صحیح روایات میں نہیں ملتی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، یہ بات پہلے بتائی جا چکی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جن صفحہ میں قرآن کریم کو جمع فرمایا تھا ان میں سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں، اور ان میں ترتیب نہیں تھی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف لکھوائے اُن میں سورتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا تھا،

امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:-

أَنَّ جَمْعَ الْقُرْآنِ لَمْ يَكُنْ مَرَّةً وَاحِدَةً فَقَدْ جَمَعَ بَعْضُهُ بَعْضُهُ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَمَعَ بَعْضُهُ بَعْضُهُ إِلَى بَعْضِهِ
الصَّحَابِيُّ، وَالْجَمْعُ الثَّلَاثُ هُوَ فِي تَرْتِيبِ السُّورَةِ، كَانَ فِي
خِلَافَةِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عِثْمَانَ بْنِ عَفَّانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ،
”جَمَعَ الْقُرْآنَ بِكَامٍ أَيْ هِيَ مَرْتَبَةٌ فِي مَجْمَلٍ نَهَى هُوَ، بَلْ كَرَّمَ الْقُرْآنَ كَرِيمًا كَاجْمَعَةٍ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِي مَوْجُودِ كِي فِي جَمْعٍ هُوَ كَيْفَا تَحَا، بَعْدَ كَاجْمَعَةٍ
أَبُو بَكْرٍ صَدِيقِ النَّبِيِّ فِي زَمَانِهِ هُوَ، أَوْ جَمْعٍ فَرَّاقٍ كَاتِبِ سِرِّهِمْ هُوَ تَحَا جَمْعٍ فِي
سُورَتَيْنِ كَوِ مَرْتَبَةٍ كَيْفَا كَيْفَا أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ هُوَ عِثْمَانَ بْنِ عَفَّانٍ فِي
هَبْدِ خِلَافَتِهِ فِي هُوَ“

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف حضرت عثمانؓ کے مصاحف سے ترتیب میں
بہت مختلف تھا، مثلاً اس میں سورۃ نسا، پہلے اور سورۃ آل عمران بعد میں تھی، اور
حضرت ابن مسعودؓ نے شاید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
قرآن کریم سیکھا ہوگا، اس لئے اُن کی خواہش تھی کہ یہ مصحف اسی ترتیب پر باقی رہے
اس کی تائید صحیح بخاریؒ کی ایک روایت سے ہوتی ہے، کہ عَاقِی کا ایک باشندہ
ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور:-

قَالَ يَا أُمُّ الْمُؤْمِنِينَ أَرَبِنِي مَصْحَفَكَ، قَالَتْ لِمَ؟ قَالَ لَعَلِّي
أُؤَلِّفُ الْقُرْآنَ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ يُقْرَأُ غَيْرَ مَوْءُؤَلَّفٍ، قَالَتْ وَمَا يُؤَلَّفُ
أَيُّهُ قَرَأْتُ قَبْلُ،

۱۔ المستدرک للحاکمؒ ص ۲۲۹ ج ۲ ۲۔ علامہ سیوطیؒ نے ابن اثیرؒ کے حوالہ سے حضرت ابن
مسعودؓ کے مصحف کی پوری ترتیب نقل کی ہے جو مصاحف عثمانی سے بہت مختلف ہے والاتفاق
ص ۶۶ ج ۱ ۳۔ صحیح بخاریؒ: باب تالیف القرآن،

” اس نے کہا کہ اُمّ المؤمنین! مجھے اپنا مصحف دکھائیے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا تاکہ میں (اپنے) قرآنی مصحف کو اس کے مطابق ترتیب دے لوں، اس لئے کہ وہ (ہمارے علاقہ میں) غیر مرتب طریقہ سے پڑھا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن کا جو حصہ بھی تم پہلے پڑھ لو تمہارے لئے مصحف نہیں۔“

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ عواتی شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت پر کاربند تھا، اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا مصحف نہ بدلا تھا اور نہ اُسے نابود کیا تھا، اس لئے اس کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور ظاہر ہے کہ عثمانی مصاحف کی ترتیب میں مناسبتوں کی رعایت دوسرے مصاحف کے مقابلہ میں زیادہ تھی، اس لئے اس عواتی شخص نے اپنے مصحف کو عثمانی مصحف کے مقابلہ میں غیر مرتب قرار دیا،^۱

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ رسم الخط کا فرق بھی ہو، اور اس میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا ہو جس میں عثمانی مصاحف کی طرح تمام سترائے سورتوں کی گنجائش نہ ہو، ورنہ اگر حافظ ابن جریرؒ کے بیان کے مطابق یہ کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر قرآن لکھوایا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف انہی متروک حروف میں سے کسی حرف پر لکھا ہوا تھا، تو اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات واقع ہوتے ہیں:-

(۱) صحیح بخاریؒ کی مذکورہ بالا حدیث میں عواتی باشندے نے صرف سورتوں کی ترتیب کا اختلاف کا ذکر کیا ہے، ورنہ اگر حرف کا اختلاف بھی ہوتا تو وہ زیادہ اہم تھا، اسے زیادہ اہتمام سے ذکر کیا جاتا،

(۲) حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے قول کے مطابق سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہیں، اگر یہ بات صحیح ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں اور عثمانی مصاحف میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس قول کے مطابق حضرت عثمانؓ نے سب کو حرف قریش پر جمع کر کے اسی کے مطابق مصحف لکھواکھے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی قریشی تھے،

(۳) حافظ ابن جریرؒ اور ان کے متبعین نے چھ حروف کو ختم کرنے پر سب بڑی دلیل اجماع صحابہؓ پیش کی ہے، لیکن اگر حضرت ابن مسعودؓ کسی اور حرف پر پڑتے اور اس کی کتابت کو جائز سمجھتے تھے تو یہ اجماع کیسے متحقق ہو سکتا ہے، جس اجماع میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے فقیہ صحابی شامل نہ ہوں وہ اجماع کہلاتا کیا مستحق ہی کہاں ہے؟ بعض حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے بعد میں حضرت عثمانؓ کی رائے کو قبول کر لیا تھا، لیکن اس بارے میں کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:-

”ابن ابی داؤدؒ نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے، کہ ”ابن مسعودؓ کا بعد میں حضرت عثمانؓ کے عمل پر راضی ہو جانا“ لیکن اس باب کے تحت کوئی ایسی صریح روایت نہیں لائے جو اس عنوان کے مطابق ہو“

حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے قول پر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ملتا، لہذا صحیح یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف عثمانی مصاحف میں باقی رکھے ہیں، اور حضرت ابن مسعودؓ کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ چھ حروف کیوں ختم کر دیئے گئے؟ کیونکہ فی الواقع ایسا

لے فتح الباری، ص ۴۰ ج ۹،

لے صرف ایک روایت مسند احمدؒ میں ایسی ملتی ہے جس سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم فرمادیئے تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ کو اسی پر اعتراض تھا اور دیکھئے الفتح الربانی، ص ۳۶ ج ۱۸، لیکن وہ ایک مجہول شخص سے مروی ہے، اس لئے مستند نہیں ہے،

ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ اعتراض یہ تھا کہ جو مصاحف پہلے سے لکھے ہوئے موجود ہیں اور جن کی ترتیب اور رسم الخط عثمانی مصاحف کے مطابق نہیں ہے انہیں ضائع کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ وہ بھی درست ہیں،

نتائج بحث | ”حروف سبعہ“ کی یہ بحث اندازے سے زیادہ طویل ہو گئی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا خلاصہ

آخر میں پیش کر دیا جائے، تاکہ اسے یاد رکھنا آسان ہو۔

۱۔ امت کی آسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرمائش کی کہ قرآن کریم کی تلاوت کو صرف ایک ہی طریقے میں منحصر نہ رکھا جائے، بلکہ اُسے مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کر دیا گیا،

۲۔ سات حروف پر نازل کرنے کا راجح ترین مطلب یہ ہے کہ اس کی قرأت میں سات نوعیتوں کے اختلافات رکھے گئے، جن کے تحت بہت سی قرائتیں وجود میں آ گئیں،

۳۔ شروع شروع میں ان سات وجوہ اختلاف میں سے اختلاف الفاظ و مرادفات کی قسم بہت عام تھی، یعنی ایسا بکثرت تھا کہ ایک قرائت میں ایک لفظ ہوتا تھا اور دوسری قرائت میں اس کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، لیکن رفتہ رفتہ جب اہل عرب قرآنی زبان سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو یہ قسم کم ہوتی گئی، نہایت کم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے اصطلاح میں **عوضہ اخیرہ** کہتے ہیں، تو اس میں اس قسم کے اختلافات بہت کم کر دیے گئے، اور زیادہ تر صیغوں کی بناوٹ، تذکیر و تانیث، افراد و جمع، معرف و مجہول اور لہجوں کے اختلافات باقی رہے،

۴۔ جتنے اختلافات **عوضہ اخیرہ** کے وقت باقی رہ گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے ان سب کو اپنے مصاحف میں اس طرح جمع فرمادیا کہ ان کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا، لہذا قراءتوں کے بیشتر اختلافات اس میں سما گئے، اور جو قراءتیں اس طرح ایک مصحف میں نہیں سما سکیں انھیں دوسرے مصاحف میں ظاہر کر دیا، اسی بنا پر عثمانی مصاحف میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظ کا اختلاف پیدا ہوا،

۵۔ حضرت عثمانؓ نے اس طرح سات مصاحف لکھوائے، اور ان میں سورتوں کو بھی مرتب فرمادیا جبکہ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں میں سورتیں غیر مرتب تھیں، نیز قرآن کریم کے لئے ایک رسم الخط متعین کر دیا، اور جو مصاحف اس ترتیب اور اس رسم الخط کے خلاف تھے انھیں نذر آتش کر دیا،
۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور وہ اس ترتیب کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنا مصحف نذر آتش کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ کے حوالے نہیں کیا،

سات حروف کے بارے میں | آخر میں ایک اور بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا
اختلاف آراء کی حقیقت، ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ ”سبعة احرف“ کی
ایک غلط فہمی کا ازالہ، مذکورہ بحث کو پڑھنے والا سرسری طور پر اس شبہ
میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جیسی بنیادی
کتاب کے بارے میں جو حفاظت خداوندی کے تحت آج تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے محفوظ
چلی آ رہی ہے مسلمانوں میں اتنا زبردست اختلاف آراء کیسے پیدا ہو گیا؟

لیکن ”سبعة احرف“ کی بحث میں جو اقوال ہم نے پیچھے نقل کئے ہیں اگر ان کا غور
سے مطالعہ کیا جائے تو اس شبہ کا جواب بآسانی معلوم ہو جاتا ہے، جو شخص بھی اس
اختلاف آراء کی حقیقت پر غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارا اختلاف
محض نظریاتی نوعیت کا ہے، اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت
اور اس کے بعینہ محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا،

کیونکہ اس بات پر سب کا بلا استثناء اتفاق ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں آن
ہمارے پاس موجود ہے وہ تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے، اس میں کوئی ادنیٰ تغیر نہیں
ہوا، اس بات پر بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ قرآن کریم کی حقیقی قراءتیں تواتر کے ساتھ
ہم تک پہنچی ہیں وہ سب صحیح ہیں، اور قرآن کریم کی تلاوت اُن میں سے ہر ایک کے
مطابق کی جاسکتی ہے، اس بات پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ متواتر قراءتوں
کے علاوہ جو شاذ قراءتیں مروی ہیں انھیں قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا،
یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ ”عرضہ اخیرہ“ یا اس سے پہلے جو قراءتیں منسوخ کر دی گئیں
وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب قرآن کا جزو نہیں رہیں،
یہ بات بھی سب کے نزدیک ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کے سات حروف
میں جو اختلاف تھا وہ صرف لفظی تھا، مفہوم کے اعتبار سے تمام حروف بالکل متحد
تھے، لہذا اگر کسی شخص نے قرآن کریم صرف ایک قراءت یا حرف کے مطابق پڑھا تو
تو اسے قرآنی مضامین حاصل ہو جائیں گے، اور قرآن کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے
اسے کسی دوسرے حرف کو معلوم کرنے کی احتیاج نہیں ہوگی، اس میں بھی کوئی ادنیٰ
اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف تیار کرائے وہ کامل
احتیاط، سینکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی اور پوری امت مسلمہ کی تصدیق کے ساتھ
تیار ہوئے تھے، اور ان میں قرآن کریم ٹھیک اس طرح لکھا گیا تھا جس طرح وہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور اس میں کسی ایک متنفس کو بھی اختلاف
نہیں ہوا،

لہذا جس اختلاف کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے وہ صرف اتنی بات
میں ہے کہ حدیث میں ”سات حروف“ سے کیا مراد تھی؟ اب جتنی متواتر قراءتیں موجود

۱۵ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے مصحف کو باقی رکھنے پر تومصر رہے، لیکن مصاحب عثمانیؓ
کی کسی بات پر انھوں نے ادنیٰ اختلاف نہیں فرمایا،

ہیں، وہ "سات حروف" پر مشتمل ہیں یا صرف ایک حرف پر؟ یہ محض ایک علمی نظریاتی اختلاف ہے، جس سے کوئی علمی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لئے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان اختلافات کی بنا پر قرآن کریم معاذ اللہ مختلف فیہ ہو گیا ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے ایک کتاب کے بارے میں ساری دنیا اس بات پر متفق ہو کہ یہ فلاں مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اس مصنف کی طرف اس کی نسبت قابل اعتمادی اور خود اُسے اُس نے اُسے چھاپ کر تصدیق کر دی کہ یہ میری لکھی ہوئی کتاب ہے، اور اس نسخے کے مطابق قیامت تک اسے شائع کیا جاسکتا ہے، لیکن بعد میں لوگوں کے درمیان یہ اختلاف پیدا ہو جائے کہ مصنف نے اپنے مسودے میں طباعت سے قبل کوئی لفظی ترمیم کی تھی یا جیسا شروع میں لکھا تھا ویسا ہی شائع کر دیا، ظاہر ہے کہ محض اتنے سے نظری اختلاف کی بنا پر وہ روشن حقیقت مختلف فیہ نہیں بن جاتی جس پر سب کا اتفاق ہے، یعنی یہ کہ وہ کتاب اُسی مصنف نے اپنی ذمہ داری پر طبع کی ہے، اُسے اپنی طرف منسوب کیا ہے، اور قیامت تک اپنی طرف منسوب کر کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح جب پوری اُمت اس بات پر متفق ہو کہ قرآن کریم کو مصاحف عثمانی میں ٹھیک اُسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا، اور اس کی تمام متواتر تراہیں صحیح اور منزل من اللہ ہیں، تو یہ حقائق اُن نظری اختلافات کی بنا پر مختلف فیہ نہیں بن سکے، جو حروف سبعہ کی تشریح میں پیش آئے ہیں، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم ۛ

باب چہارم

ناسخ و منسوخ

نسخ کی حقیقت علوم قرآن میں ایک اور اہم بحث ناسخ و منسوخ کی ہے، یہ بحث بڑی پہلو دار اور طویل الذیل ہے، لیکن یہاں اس کی تمام تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اس کے متعلق صرف بنیادی معلومات پیش کرتے ہیں۔ ”نسخ“ کے لغوی معنی ہیں ”مٹانا“ ”ازالہ کرنا“ اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:-

رَفَعَ الْحُكْمَ الشَّرْعِيَّ بِدَلِيلٍ شَرْعِيٍّ
کسی حکم شرعی کو کسی شرعی دلیل سے ختم کر دینا

مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتا ہے، پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمت بالغہ کے پیش نظر اس حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ کوئی نیا حکم عطا فرمادیتا ہے، اس عمل کو ”نسخ“ کہا جاتا ہے، اور اس طرح جو پرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اسے ”منسوخ“ اور جو نیا حکم آتا ہے اُسے ”ناسخ“ کہتے ہیں۔
نسخ کا عقلی نقلی ثبوت یہودیوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں ”نسخ“ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگر ”نسخ“

کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بھی اپنی رائے میں تبدیلی کر لیتا ہے، اُن کا یہ کہنا ہے کہ اگر احکام الہی میں نسخ و منسوخ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذ اللہ) اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا جسے اصطلاح میں ”بَدَا“ کہتے ہیں،

لیکن یہودیوں کا یہ اعتراض بہت سطحی نوعیت کا ہے، اور ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ”نسخ“ کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا، بلکہ ہر زمانے میں اُس دور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، نسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے، بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدتِ نفاذ متعین کر دے، اور یہ بتا دے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا، لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بنا پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامت فکر کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمتِ الہیہ کے عین مطابق ہے، اور اسے کسی بھی اعتبار سے کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا، حکیم وہ نہیں ہے جو قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض بدلتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کر کے نسخہ میں اُن کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔ اور یہ بات صرف شرعی احکام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کائنات کا سارا کارخانہ اسی اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے موسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار، کبھی خزاں، کبھی برسات، کبھی خشک سالی، یہ سارے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے عین مطابق ہے، اور اگر کوئی شخص اسے ”بَدَا“ قرار دے کر اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس سے معاذ اللہ خدا کی رائے میں تبدیلی لازم آتی ہے کہ اس نے ایک وقت سردی کو پسند کیا تھا، بعد میں غلطی واضح ہوئی، اور اس کی جگہ گرمی بھیج دی تو اسے

احق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، بعینہ ہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے کہ اُسے ”بُذار“ قرار دیکر کوئی عیب سمجھنا انتہا درجہ کی کوتاہ نظری اور حقائق سے بیگانگی ہے، چنانچہ ”نسخ“ صرف امت محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی نسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے جس کی بہت سی مثالیں موجودہ بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً بائبل میں ہے کہ ”حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز تھا، اور خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویاں لیاہ اور راحیل آپس میں بہنیں تھیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے ناجائز قرار دیدیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جاندار حلال تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام کر دیئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں عورت کے زنا کا ہونے کے سوا اُسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی“ غرض بائبل کے عہد نامہ جدید و قدیم میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی پر لانے حکم کو نئے حکم کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا،

<p>لفظ ”نسخ“ کے استعمال میں علماء متقدمین اور متأخرین کے درمیان اصطلاح کا ایک فرق رہا ہے، جسے</p>	<p>نسخ کے بارے میں متقدمین اور متأخرین کی اصطلاحات کا فرق</p>
---	---

سمجھ لینا ضروری ہے،
متقدمین کی اصطلاح میں لفظ ”نسخ“ ایک وسیع مفہوم کا حامل تھا، اور

۱۔ بائبل، کتاب پیدائش ۲۹: ۲۳ تا ۳۰، ۱۸: ۱۸،

۲۔ پیدائش ۹: ۳، ۱۷: ۱۷ اور استثناء ۱۲: ۷،

۳۔ استثناء ۲۲: ۲۱، ۱۵: ۱۵،

۴۔ انجیل متی ۱۹: ۱۵،

اس میں بہت سی وہ صورتیں داخل تھیں جو بعد کے علماء کی اصطلاح میں ”نسخ“ نہیں کہلاتیں، مثلاً متقدمین کے نزدیک عام کی تخصیص اور مطلق کی تفسیر وغیرہ بھی ”نسخ“ کے مفہوم میں داخل تھیں، چنانچہ اگر ایک آیت میں عام الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اور دوسری میں انھیں کسی خاص صورت سے مخصوص کر دیا گیا ہو، تو علماء متقدمین پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلا حکم بالکل ختم ہو گیا، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلی آیت سے جو عموم سمجھ میں آتا تھا دوسری آیت نے اس کو ختم کر دیا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ،
مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ
ایمان لے آئیں۔

اس میں ”مشرک عورتوں“ کا لفظ عام ہے، اور اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے، خواہ وہ بت پرست ہوں یا اہل کتاب، لیکن ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ يَنْ لَوْ تَوَّأْنُ الْكِتَابِ
اور (تمہارے لئے حلال ہیں) اہل کتاب میں سے
باعثت عورتیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں ”مشرک عورتوں“ سے مراد وہ مشرک عورتیں تھیں جو اہل کتاب نہ ہوں، لہذا اس دوسری آیت نے پہلی آیت کے عام الفاظ میں تخصیص پیدا کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ ان الفاظ سے مراد مخصوص قسم کی مشرک عورتیں ہیں، متقدمین اس کو بھی ”نسخ“ کہتے ہیں، اور پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں،

اس کے برخلاف متاخرین کے نزدیک ”نسخ“ کا مفہوم اتنا وسیع نہیں، وہ

صرف اس صورت کو ”نسخ“ قرار دیتے ہیں، جس میں سابقہ حکم کو بالکل ختم کر دیا گیا ہو محض عام میں تخصیص یا مطلق میں تقييد پيدا ہو جائے تو اسے وہ نسخ“ نہیں کہتے، چنانچہ مذکورہ بالا امثال میں متاخرين یہ کہتے ہیں کہ اس میں نسخ نہیں ہوا، کیونکہ اصل حکم (یعنی مشرک عورتوں سے نکاح کی مانعت) بدستور باقی ہے، صرف اتنا ہوا ہی کہ دوسری آیت سے یہ واضح ہو گیا کہ پہلی آیت کا مفہوم اتنا عام نہیں تھا کہ اس میں اہل کتاب عورتیں بھی داخل ہو جائیں، بلکہ وہ صرف غیر اہل کتاب کے ساتھ مخصوص تھی،

اصطلاح کے اس فرق کی وجہ سے متقدمین کے نزدیک قرآن کریم میں منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ معمولی فرق کی وجہ سے ایک آیت کو منسوخ اور دوسری کو نسخ قرار دیتے تھے، لیکن متاخرين کی اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہے،

قرآن کریم میں نسخ کی بحث

اس بات میں تو اُمت کے کسی فرد کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں ہے کہ شرعی احکام نسخ کا سلسلہ پچھلی اُمتوں کے وقت سے جاری رہا ہے، اور اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا التلام میں بہت سے احکام منسوخ ہوئے ہیں، مثلاً پہلے حکم یہ تھا کہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جائے، بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیدیا گیا، اس میں مسلمانوں میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے،

لیکن اس میں آراء کا کچھ اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں نسخ ہوا ہے یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت موجود

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوا لا تقان، ص ۲۲ ج ۲، لے جمال الدین القاسمی، تفسیر القاسمی، ص ۲۲ ج ۱، عیسیٰ ابیانی الحلبي مصر ۱۳۸۵ھ

ہے جس کا حکم منسوخ ہو چکا ہو اور اس کی تلاوت اب بھی کی جاتی ہو؟ جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، لیکن معتزلہ میں سے ابو مسلم اصفہانی کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ تمام آیات اب بھی واجب العمل ہیں، ابو مسلم اصفہانی کی اتباع میں بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور ہمارے زمانے میں اکثر تجدد پسند حضرات اسی کے قائل ہیں، چنانچہ جن آیتوں میں نسخ معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ان کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے نسخ تسلیم نہ کرنا پڑے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موقف دلائل کے لحاظ سے کمزور ہے، اور اسے اختیار کرنے کے بعد بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے جو اصول تفسیر کے بالکل خلاف ہے، جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں، دراصل ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ”نسخ“ ایک عیب ہے جس سے قرآن کریم کو خالی ہونا چاہئے، حالانکہ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ ”نسخ“ کو عیب سمجھنا کتنی کوتاہ نظری کی بات ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ ابو مسلم اصفہانی اور ان کے متبعین عموماً یہودی نصاریٰ کی طرح اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام میں نسخ ہوا بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں نسخ نہیں ہے، اب اگر نسخ ”کوئی عیب“ تو غیر قرآنی احکام میں یہ عیب کیسے پیدا ہو گیا؟ جبکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں، اور اگر یہ کوئی عیب نہیں ہے تو جو چیز غیر قرآنی احکام میں عیب نہیں تھی وہ قرآنی احکام میں عیب کیونکر قرار دی گئی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ بات حکمت الہی کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی آیت محض تبرکاً تلاوت کے لئے باقی رہ جاوے اور اس پر عمل کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہو، لیکن نہ جانے اس بات کو حکمت الہی کے خلاف کس بنا پر قرار دیا گیا ہے؟

حالانکہ قرآن کریم کی منسوخ احکام آیات کے باقی رہنے میں بہت سی مصلحتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اس سے احکام شرعیہ میں تدریج کی حکمت واضح ہوتی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے احکام کا پابند بنانے میں کس حکیمانہ طریقے سے کام لیا ہے؟ نیز اس سے شرعی احکام کی تاریخ کا علم ہوتا ہے، اور یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر کب اور کیا حکم نافذ کیا گیا تھا؟ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر پچھلی امتوں کے اُن احکام کا ذکر فرمایا ہے جو اُمت محمدیہ (علی صاحبہا السلام) میں منسوخ ہو گئے، مثلاً ارشاد ہے:-

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَزَمْ مَنَّا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ
حَزْمًا عَلَيْهِمْ شَحُومُهُمَا إِلَّا مَا حَزَمْتَ ظُهُورَهُمَا أَوِ الْخَوَايَا
أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (العام: ۱۴۶)

”اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے، اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی جسر بیاں اُن پر ہم نے حرام کر دی تھیں بجز وہ (چربی) جو اُن (دونوں) کی پشت پر یا آنتوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔“

ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک منسوخ حکم کا تذکرہ اسی لئے فرمایا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت حاصل کی جائے، اگر قرآن کریم میں بعض منسوخ احکام آیات کی تلاوت اسی مقصد کے لئے باقی رکھی گئی ہو تو اس میں کونسی بات حکمت الہیہ کے خلاف ہے؟ پھر یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے حکام کی حکمت معلوم ہے؟ یا وہ آیت قرآنی کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ اُس کے نزول میں کیا کیا حکمتیں تھیں؟ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا، اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ کے کسی کام سے محض اس بنا پر کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، جبکہ اس کام کا وقوع شرعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہو،

لہذا حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں ہیں، اُن کا وہ

بنیادی مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے، جس پر انھوں نے اپنے نظریے کی ساری عمارت کھڑی کی ہے، انھوں نے بعض قرآنی آیات کو دو دروازے کے معانی صرف اس لیے پہنچائے ہیں کہ ان کی نظریں ”نسخ“ ایک عیب ہے، جس سے وہ قرآن کریم کو خالی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے، اور اگر ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ نسخ کوئی عیب نہیں بلکہ حکمت الہی کا عین تقاضا ہے تو وہ ایسی آیتوں کی تفسیر وہی کریں گے جو عام طور سے کی جاتی ہے، کیونکہ ظاہر اور متبادر تفسیر وہی ہے،

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا، أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرہ: ۱۰۶)

”جس آیت کو بھی ہم منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے، اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آئیں گے، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“

اس آیت کو جو شخص بھی بغیر جانب داری کے ساتھ خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ اس سے نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کریم کی آیات میں نسخ کا سلسلہ خود قرآن کریم کی تصریح کے مطابق جاری رہا ہے، لیکن ابو مسلم اصفہانی اور ان کے ہم نوا جو نسخ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک عیب سمجھ کر قرآن کریم کو اس سے خالی قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مذکورہ آیت میں دو دروازے کا تاویلات کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک فرضی صورت کا بیان کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض ہم نے کسی آیت کو منسوخ کیا تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت نازل کر دیں گے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی کوئی آیت ضرور منسوخ کی جائے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک آیت میں ارشاد ہے :-

إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ۝

”اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہو تو میں سب سے پہلے اس کی پرستش کروں گا“

منکرین نسخ کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں ایک فرضی صورت کا بیان ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہوگا، اسی طرح مذکورہ بالا آیت

میں نسخ کا ذکر صرف ایک فرضی صورت کے طور پر کیا گیا ہے جس کا واقعہ میں موجود ہونا ضروری نہیں؛

لیکن آیت مذکورہ کی یہ تشریح ایک دور از کار تاویل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ اگر قرآن کریم کی آیات میں کبھی نسخ واقع نہیں ہونا تھا تو اللہ تعالیٰ کو بطور فرض ہی سہی اس کا ذکر فرمانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ قرآن کریم کا یہ منصب ہرگز نہیں ہے کہ جو واقعات کبھی پیش نہ آنے والے ہوں، انھیں بلاوجہ فرض کر کر کے اُن پر کوئی حکم لگائے، رہی اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَاِلٰہِ الْغٰیۃِ والی آیت، سو اس میں اور نسخ کی مذکورہ آیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) کسی لڑکے کی پیدائش ایک بالکل ناممکن چیز ہے، لہذا اس آیت کو پڑھنے والا ہر شخص فوراً یہ سمجھ لیگا کہ یہ بات محض ایک مفروضہ کے طور پر کہی گئی ہے، جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا، لیکن چونکہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کا سوال ہی نہیں ہے، اس کے برعکس ”نسخ“ کا وقوع خود ابوسلم اصفہانی کے نزدیک عقلی طور پر ناممکن نہیں ہے اس لئے اُسے محض ایک فرضی صورت قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں،

یہ بات مذکورہ آیت کے شان نزول سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کتب تفسیر میں مروی ہے کہ بعض کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ اپنے متبعین کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں اور کوئی نیا حکم لے آتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں نسخ کو تسلیم کر کے اس کی حکمت بیان کی گئی ہے، نسخ کا انکار نہیں کیا گیا، منسوخ آیات قرآنی کی تعداد | جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متقدمین کی اصطلاح میں

لہ قرآن مجھ از مولانا عبدالصمد رحمانی، ص ۲۱، مجلس معارف القرآن، دیوبند،

جلد ۵ روح المعانی، علامہ آکوسی، ص ۳۵۱ ج ۱،

نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، اسی لئے انھوں نے منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی ہے، لیکن علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے متاخرین کی اصطلاح کے مطابق لکھا ہے کہ پورے قرآن میں محض اُنیس آیتیں منسوخ ہیں، پھر آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان اُنیس آیتوں پر مفصل تبصرہ کر کے صرف پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے، اور باقی آیات میں اُن تفسیروں کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق انھیں منسوخ ماننا نہیں پڑتا، ان میں سے اکثر آیتوں کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی توجہات نہایت معقول اور قابل قبول ہیں، لیکن بعض توجہات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، بہر حال! جن پانچ آیتوں کو انھوں نے منسوخ تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں:-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتَ أَنْ تَرَكَ خَيْرَ
 بِالْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِأَمْعَرُوفٍ حَقًّا عَلَى
 الْمُتَّقِينَ ٥ (البقرہ: ۱۸۰)

”جب تم میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہو جائے اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو اس پر والدین اور اقرباء کے لئے وصیت بالمعروف کرنا فرض قرار دیدیا گیا ہے، یہ حکم متقیوں پر لازم ہے“

یہ آیت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب میراث کے احکام نہیں آئے تھے، اور اس میں ہر شخص کے ذمہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کر کے جائے کہ اس کے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کو کتنا کتنا مال تقسیم کیا جائے؟ بعد میں آیت میراث یعنی يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ الخ نے اس کو منسوخ کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نے تمام رشتہ داروں میں ترکہ کی تقسیم کا ایک ضابطہ خود متعین کر دیا، اب کسی شخص پر مرنے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا،

(۲) سورۃ انفال میں ارشاد ہے :-

إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَعْلِمُوا مَا مِثْلُهُمْ وَإِنْ
يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَعْلِمُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِنَّا هُمْ
قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ (الانفال: ۶۵)

”اگر تم میں سے بیس آدمی استقامت رکھنے والے ہوں گے تو وہ دوسو پر غالب
آجائیں گے، اور اگر تم میں سے ستر آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب
آجائیں گے، کیونکہ یہ کافر ایسے لوگ ہیں جو صحیح سمجھ نہیں رکھتے۔“

یہ آیت اگرچہ بظاہر ایک خبر ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے ایک حکم ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں
کو اپنے سے دس گنا زائد دشمن کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں، یہ حکم اگلی آیت کے
ذریعہ منسوخ کر دیا گیا۔

أَلَا نَخَفُّ اللَّهَ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا، فَإِنْ يَكُنْ
مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَعْلِمُوا أَلْفًا وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ
يَعْلِمُوا بِأَذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (الانفال: ۶۶)

”اب اللہ نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے، اور اللہ کو علم ہے کہ اب تم میں
کچھ کمزوری ہے، پس اب (اب) اگر تم میں سے ستر افراد استقامت رکھنے والے ہوں گے
تو وہ دوسو پر غالب رہیں گے، اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ ہزار پر
اللہ کے حکم سے غالب ہوں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اس آیت نے پہلی آیت کے حکم میں تخفیف پیدا کر دی، اور دشمن گنے دشمن کے بجائے
دو گنے کی حد مقرر کر دی، کہ اس حد تک راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں،
(۳) تیسری آیت جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے منسوخ قرار دیا ہے، سورۃ احزاب
کی یہ آیت ہے :-

لَا يَجِلُّ عَلَيْكَ الْإِسْلَامُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ
وَلَوْ أَغْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ، (الاحزاب: ۵)

”راے نبیؐ، آپ کے لئے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ حلال ہو کہ ان موجودہ ازواج کو بدل کر دوسری عورتوں سے نکاح کریں، خواہ آپ کو اُن کا حسن پسند آئے“

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید نکاح کرنے سے منع فرما دیا گیا تھا بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور اس کی ناسخ آیت وہ ہے جو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب میں مذکورہ بالا آیت سے پہلے مذکور ہے، یعنی :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي أَتَيْتَ أُجُورَهُنَّ
”اے نبیؐ، ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ ازواج حلال کر دی ہیں جنہیں آپ نے اُن کا ہر دیدیا ہو، الخ (الاحزاب : ۵۰)

حضرت شاہ صاحبؒ دیگرہ کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعہ سابقہ ممانعت منسوخ ہو گئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نسخ یقینی نہیں ہے، بلکہ اس کی وہ تفسیر بھی بڑی حد تک بے تکلف اور سادہ ہے، جو حافظ ابن جریر طبریؒ نے اختیار کی ہے، یعنی یہ کہ یہ دونوں آیتیں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی نازل ہوئی ہیں، یا اٰیہمَ النَّبِیِّؐ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الْخ والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مخصوص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ اُن کے ساتھ نکاح آپ کے لئے حلال ہے، پھر اگلی آیت لَیَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِہَا میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں، (۲) چوتھی آیت جو حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک منسوخ ہے، سورہ مجادلہ کی یہ آیت :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَوَلَّيْتُمْ الرِّسُولَ فَقَدْ مَوَّابَيْنَ يَدَيْ
تَجَوَّأَكُمْ مَدَقَّةَ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِنْ لَّمْ تَتَّجِدُوا
فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (المجادلہ : ۱۲)

لہ تفسیر ابن جریرؒ

”لے ایمان والو! جب تم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی کرنی ہو تو سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو یہ تمہارے لئے باعث خیر و طہارت ہے، پھر اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لئے) کچھ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہو گئی :-

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَاتِلُوْا بَيْنَ يَدَيِّ نَجْوٰكُمْ صَدَقَاتٍ فَاِذَا لَمْ تَقُوْا اَوْ تَابَ اللّٰهُ عَلٰیكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآُوْا الزَّكٰوةَ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (المجادلہ : ۱۳)

”کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو، پس جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی تو (اب) نماز قائم رکھو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔“

اس طرح سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا،

(۵) پانچویں آیت سورہ مزمل کی مندرجہ ذیل آیت ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الْمُرْسَلُ قِيَمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا يُّصْفَهُ اَوْ اَنْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا
”اے مرسل (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) رات کو (تہجد میں) کھڑے رہتے،

مگر تھوڑا سا حصہ آدھی رات یا اس میں سے بھی کچھ کر دیجئے۔“ (المزمل : ۱)

اس آیت میں رات کے کم از کم آدھے حصہ میں تہجد کی نماز کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں اگلی آیتوں نے اس میں آسانی پیدا کر کے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا، وہ آیتیں یہ ہیں :-

عَلِمَ اَنْ لَّنْ نَّحْصُوْهُ فَتَابَ عَلٰیكُمْ فَاَقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْ

الْقُرْاٰنِ (المزمل : ۲۰)

”اللہ کو معلوم ہے کہ تم (آئندہ) اس حکم کی پابندی نہیں کر سکو گے، اس لئے

اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، پس (اب) تم قرآن کا اتنا حصہ پڑھ لیا کرو،

جو تمھارے لئے آسان ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ہتجر کا حکم واجب نہیں تھا، لیکن پہلے اس میں زیادہ تاکید بھی تھی اور اس کا وقت بھی زیادہ وسیع تھا، بعد میں تاکید بھی کم ہو گئی، اور وقت کی اتنی پابندی بھی نہ رہی،

یہ ہیں وہ پانچ آیتیں جن میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قول کے مطابق نسخ ہوا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ پانچ مثالیں صرف اس صورت کی ہیں جس میں ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن کریم کے اندر موجود ہیں، اس کے علاوہ ایسی مثالیں قرآن کریم میں باتفاق بہت سی ہیں جن میں ناسخ تو قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن منسوخ موجود نہیں مثلاً تحویل قبلہ کی آیات وغیرہ،

نتیجہ بحث | مذکورہ بالا بحث سے ہمارے مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں نسخ کا وجود (معاذ اللہ) کوئی عیب نہیں ہے جس سے قرآن کریم کو خالی دکھانے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ حکمت الہی کا عین تقاضا ہے، لہذا کسی آیت کی کسی تفسیر کو محض اس بنا پر رد نہیں کرنا چاہئے کہ اس کے مطابق قرآن میں نسخ لازم آتا ہے، بلکہ اصول تفسیر کے مطابق جو تفسیر راجح ہو اسے اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں، خواہ اس میں آیت کو منسوخ قرار دینا پڑتا ہو، واللہ سبحانہ اعلم ۞

تاریخ حفاظتِ قرآن

نزولِ قرآن کی تاریخ اور اس کے متعلقہ مباحث سے ضروری حد تک فارغ ہونے کے بعد اب ”تاریخ حفاظتِ قرآن“ کے موضوع پر گفتگو پیش نظر ہے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے زمانوں میں قرآنِ کریم کی حفاظت کس طرح کی گئی؟ اُسے کس طرح لکھا گیا؟ اور یہ کوششیں کتنے مراحل سے گزری ہیں؟ نیز اس سلسلے میں غیر مسلموں اور ملحدوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اُن کا انشاء اللہ مکمل اور اطمینان بخش جواب دیا جائیگا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حفاظتِ قرآن

قرآنِ کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالاً کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے

عہدِ رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفاظ کے سینوں سے کرائی جانی چاہئے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا :-

وَمَا نَزَّلَ عَلَيْكَ فِي الْكِتَابِ إِلَّا الْفُتُوحُ
 ”یعنی میں تم پر ایک ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں جسے
 پانی نہیں دھو سکے گا“

مطلب یہ ہو کہ دنیا کی عام کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں، چنانچہ تورات، انجیل، اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہو گئے لیکن قرآن کریم کو سینوں میں اس طرح محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے، چنانچہ ابتداء سے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ اس کے الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:-

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَتَّبِعَ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ
 ”آپ قرآن کریم کو جلدی سے یاد کر لینے کے خیال سے اپنی زبان کو حرکت نہ
 دیجئے، (کیونکہ) اس (قرآن) کو جمع کرنا اور پڑھوانا تو ہم نے اپنے ذمے
 لے لیا ہے“ (القلمہ: ۱۶، ۱۷)

اس آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور ادھر وہ آپ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح ہر کارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنی غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت

جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دوسرے حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا،^۱ پھر آپؐ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے صرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اُس کے الفاظ بھی یاد کرتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سکھانے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی ہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوائے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نمازیں اُسے دہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبویؐ میں قرآن سکھنے اور سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور مچنے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمائی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مخالطہ پیش نہ آئے،^۲ اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، اور انھیں صدیوں تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد قرآن کریم کی وہ منزلِ ہدایت نصیب ہوئی تھی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے عزیز پونجی تصور کرتے تھے، اِس لئے انھوں نے اسے یاد رکھنے کے لئے کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اُن کے مزاج اور افتادِ طبع سے واقف ہے، چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی تعداد تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر یاد تھا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظِ قرآن کی اس جماعت میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت

۱۔ صحیح بخاری، مع فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹،

۲۔ منہل العرفان، ص ۲۳۲ ج ۱،

عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت خذیفہ بن یانؓ، حضرت سالم مونیٰ ابی خذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ، حضرت اُمّ ورقہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، ابو حلیمہ معاذؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت جحجیح بن جاریہؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت تیمم دارمیؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، اور حضرت ابو زید رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔

بھریہ تو صرف اُن صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی ہیں جن کا نام حافظِ مِستَران کی حیثیت سے روایات میں محفوظ رہ گیا، ورنہ ایسے صحابہؓ تو بے شمار ہوں گے جنہوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا، لیکن اس حیثیت سے اُن کا نام روایات میں محفوظ نہیں رہا۔ اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ایک قبیلے میں ستر ستر قاری قرآن کی تعلیم کے لئے بھیجے ہیں، چنانچہ صرف غزوہ بدرؓ کے موقع پر ستر قراء صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر روایات میں موجود ہے، اور حفاظ صحابہؓ کی تقریباً اتنی ہی تعداد آپ کے بعد جنگِ یمامہ میں شہید ہوئی، بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگِ یمامہ کے موقع پر سات سو قراء صحابہؓ شہید ہوئے تھے،

اس کے علاوہ یہ تو صرف اُن صحابہؓ کا ذکر ہے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا، اور ایسے صحابہؓ کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے،

۱۔ النثر فی القراءات العشر، ص ۶ ج ۱۔ الاتقان، ص ۳، ۴، ۵ ج ۱۔ تاریخ القرآن للکرمی، ص ۶۰

۲۔ الاتقان، ص ۳، ۴ ج ۱

۳۔ عمدة القاری ص ۱۶ و ۱۷ ج ۲۰ مطبوعہ دمشق،

۴۔ البرہان فی علوم القرآن للزکشی ص ۳۱ تا ۳۴، ۲، ۳ ج ۱،

غرض ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کو یاد کرا دیا گیا، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اُس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی، کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظہ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں،

اس طریقہ سے قرآن کریم کی نشر و اشاعت کس تیزی کے ساتھ ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہؓ عہد رسالت کے ایک کسب صحابی تھے، ان کا گھر ایک چشمہ کے کنارے واقع تھا، جہاں آنے جانے والے مسافر آرام کیا کرتے تھے، اُن کی عمر سات سال تھی اور ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن آنے جانے والوں سے قرآن کریم کی مختلف آیتیں اور سورتیں سن سن کر انھیں مسلمان ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم کا ایک اچھا خاصہ حصہ یاد ہو گیا تھا۔

عہد رسالت میں کتابت قرآن

پہلا مرحلہ

حفاظت قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، کتابت کا طریق کار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ:-

”كنت أكتب الوحي لرسول الله صلى الله عليه وسلم وكان إذا نزل عليه الوحي أخذته برجاء شديدة وعرقا مثل الجمان ثم ستره عنه، فكنت أدخل عليه بقطعة الكتف أو كسوة فأكتب وهو يبلى عليّ فما فرغ حتى تكاد رجلي تنكسر من نقل القرآن حتى أقول لا أمشي على رجلي أبداً فإذا فرغت قال اقرأ فأقرأه فان كان فيه سقط أقامه ثم أخرج به إلى الناس“

”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو سخت گرمی لگتی تھی، اور آپ کے جسم اہل پر پینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈسکنے لگتے تھے، پھر آپ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی، تو میں منڈھے کی کوئی بڑی (یا کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا آپ کو کھولتے رہتا اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، ہر حال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ فرماتے: ”پڑھو! میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپ اس کو اصلاح فرمادیتے، اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے“

کتابت وحی کا کام صرف حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے سپرد نہ تھا، بلکہ آپ نے بہت سے صحابہؓ کو اس مقصد کے لئے مقرر فرمایا ہوا تھا، جو حسب ضرورت کتابت وحی کے

۱۔ رواہ البیہقی ج ۱ ص ۱۵۲، باب عرض الکتاب بعد الاطلاع، دار الکتاب العربی، بیروت
۱۹۱۷ھ

فرائض انجام دیتے تھے، کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے، لیکن ان میں سے زیادہ شہور یہ حضرات ہیں:-

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ، حضرت ابان بن سعید بن العاصؓ، حضرت حنظلہ ابن الریحؓ، حضرت معقب بن ابی فاطمہؓ، حضرت عبداللہ بن ارقم الزہریؓ، حضرت شرجیل بن حسنہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت عامر بن فہرہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت میسرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ کا تب وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے، چنانچہ اُسے آپؐ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، اس زمانہ میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، اور چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کرتے گئے ہیں۔

۱۵ علوم القرآن، صبحی صالح، ترجمہ اردو غلام احمد حریری، ص ۱۱ بحوالہ مستشرق بلد شیر وغیرہ ملک برادرز لاہور ۱۹۶۸ء

۱۶ یہاں تک کے نام فتح الباری، ص ۸، ج ۹ سے ماخوذ ہیں،

۱۷ ان حضرات کے اسمائے گرامی کیلئے دیکھئے زاد المعاد لابن قیمؒ ص ۳۰ ج ۱ مطبوعہ مینیمہ مصر
۱۸ فتح الباری، ص ۸ ج ۹ بحوالہ مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن حبان وحاکم وصحیحہ ابن حبان وحاکم، ۱۵ ایضاً ج ۹ وعمدة القاری ص ۱۷ ج ۲، ادارة الطباعة المینیہ دمشق

اس طرح ہمد رسالت میں وشرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ کتابی شکل میں نہ تھا بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے جاری تھا جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اور ہبنوی حضرت سعید بن زیدؓ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور جب حضرت عمرؓ ان کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا، جس میں سورۃ ظہ کی آیات درج تھیں، اور حضرت خباب بن ارتؓ انھیں پڑھا رہے تھے۔

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے انفرادی طور پر اپنے پاس وشرآن کریم کے مکمل یا نامکمل نسخے لکھ رہے تھے مثلاً صحیح بخاریؒ میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ:-

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهي ان يسافر بالقرآن الى
ارض العدو،

رسول الله صلى الله عليه وسلم نے قرآن کریم کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کرنے سے منع فرمایا،

۱۔ سنن دارقطنی ص ۱۲۳ ج ۱ طبع مدینہ طیبہ، باب نہی المحرث عن مس القرآن وجمع الزوائد،
للہیثمی ص ۶۱ ج ۹ طبع بیروت، مناقب عمرؓ وسیرت ابن ہشام بہامش زاد المعاد ص ۸۶ و ۸۷،
ج ۱، حافظ زلیعی نے اس واقعہ کو سنداً جید قرار دیا ہے، (نصب الراية)
۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، ص ۴۱۹ و ۴۲۰ ج ۱، اصح المطابع،

نیز معجم طبرانی میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
 قرأه الرجل في غير المصحف ألف درجة وقرأه في المصحف
 تضاعفت على ذلك ألفي درجة،
 ”کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ میں دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب
 ایک ہزار درجہ ہے، اور اگر قرآن کے نسخہ میں دیکھ کر تلاوت کرے تو دو ہزار
 درجے ہیں۔“

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پاس عہد رسالت ہی میں
 قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے، ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو دیکھ کر تلاوت
 کرنے یا اسے لے کر دشمن کے علاقہ میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا،

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جمع قرآن

دوسرا مرحلہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے
 گئے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیت
 چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، زیادہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی
 کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس یا پانچ سورتیں، اور کسی کے
 پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے
 ہوئے تھے،

اس بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا
 کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ

۱۔ مجمع الزوائد، ص ۱۶۵ ج ۴ مطبوعہ بیروت، قال ابوشامہؒ رواہ الطبرانی وفيه ابو سعيد بن
 عون وثقة ابن معبد في رواية وضعفه في أخری وبقية رجاله ثقات،

کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں اُن کے پاس پہنچا، تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپیدانہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کر دالے کا کام شروع کر دیں، میں نے عمرؓ سے کہا، کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کر کے انھیں جمع کرو“

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ... مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا،

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:-

- ۱۔ سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے،
- ۲۔ پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے بلکہ لہذا حضرت زیدؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ بھی اپنے حافظہ سے اس کی توثیق فرماتے تھے،

لے فسخ الباری ص ۱۱ ج ۹ بحوالہ ابن ابی داؤد فی کتاب المصاحف لہ ایضاً بحوالہ مذکور،

۳۔ کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی، علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سال آپؐ پر پیش کر دی گئی تھی، اور آپؐ نے اس بات کی تصدیق فرمادی تھی کہ یہ اُن حروفِ سبعہ کے مطابق ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے، علامہ سیوطیؒ کی اس بات کی تائید متحدہ روایات سے بھی ہوتی ہے،

۴۔ اس کے بعد اُن لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، امام ابو شامہؒ فرماتے ہیں کہ اسطریق کار کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ جہتِ سیاط سے کام لیا جائے، اور صرف حافظہ پر اکتفا کرنے کے بجائے بعینہ اُن آیات سے نقل کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحیح قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں ہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب ابھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورۃ برارۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ الخ مجھے صرف حضرت ابو حنیفہؓ کے پاس ملیں، اُن کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابو حنیفہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو اُن کا جُز و قرآن ہونا معلوم نہ تھا،

۱۵ الاتقان، ص ۶۰ ج ۱، ۱۵

۱۵ ۱۰: ۱۵ طلب القرآن متفرقا ليعارض بالجمع عند من بقي ممن جمع القرآن ليشترك الجميع في علم ما جمع (البرهان في علوم القرآن، ص ۲۳۸ ج ۱)

۱۵ الاتقان، ص ۶۰ ج ۱، ۱۵

بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متفرق آیتیں لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہی یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اول تو جن سینکڑوں حفاظ کو پورا قرآن کریم یاد تھا، انھیں یہ آیات بھی یاد تھیں، دوسرے آیات قرآنی کے جو مکمل مجموعہ مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن چونکہ حضرت زید بن ثابتؓ نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالا ذرائع پر اکتفا کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا تھا، اس لئے انھوں نے یہ آیت اس وقت تک اس نئے مجموعہ میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقہ سے بھی وہ آپ کو دستیاب نہیں ہوگئی دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہؓ کو یاد ہونے اور عہد رسالتؐ کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کئی کئی صحابہؓ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی بھی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کئی کئی صحابہؓ لے کر آ رہے تھے، اس کے برعکس سورۃ براہت کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہؓ کو یاد تو تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیات فترآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں کسی اور کے پاس نہیں،

بہر حال، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انھیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا، لیکن ہر سورۃ علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا، اصطلاح

۱۔ البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۳۲ و ۲۳۵ ج ۱: ۱۔ عن سالم قال جمع ابو بکر القرآن فی قرطیس دانتان ص ۶۰ ج ۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ نسخہ بھی چمڑے کے پارچوں پر لکھا گیا لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے، (ایضاً)

میں اس نسخہ کو "اُمّ" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی؛

(۲) اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے؛

(۳) یہ نسخہ خطِ حیری میں لکھا گیا تھا؛

(۴) اس میں صرف وہ آیتیں درج کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی،

(۵) اس کو لکھولہ نے کامقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن سے متعلق یہ تفصیلات ذہن میں رہیں تو اس روایت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے قرآن کریم جمع کر لیا تھا، اس لئے کہ جہاں تک آیات قرآنی کے انفرادی مجموعوں کا تعلق ہے وہ ضرور حضرت علیؓ نے ہی نہیں اور بھی متعدد صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، لیکن ایسا معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تیار کر دیا،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق انھیں امّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل

۱۔ اتفاقاً ۶۰ ج ۱

۲۔ منہل العرفان، ص ۲۴۶ و ۲۴۷ ج ۱ تاریخ القرآن للکروی ص ۲۸ (۲)

۳۔ تاریخ القرآن از عبد الصمد ص ۴۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء

کر دیا گیا، پھر مروان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے طلب کئے تو انھوں نے دینے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہو گئی تو مروان نے وہ صحیفے منگوائے اور انھیں اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیب سور کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف کی اتباع لازمی ہے، اور کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اُن کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

تیسرا حصہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے در دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ اُن مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ بھی پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قرات کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اُس نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا، اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اُس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قرات کو صحیح اور دوسرے

کی قرات کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے کچھ ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیار ہی نہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے اُن جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قرات صحیح اور کونسی غلط ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا،

اس کارنامہ کی تفصیل روایات حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حفصہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حفصہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا، وہاں میں دیکھا کہ شام کے لوگ ابی بن کعبؓ کی قرات پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوئی، اور اہل عراق عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرات پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں،

حضرت عثمانؓ نے خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرات کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسری قرات کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا

اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرارت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کیا، اور فرمایا کہ ”مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرارت تمھاری قرارت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ”میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے،“ صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی،

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ”تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتدار ہو،“ اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے) جو صحیفہ موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیتے، حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ رضی اللہ عنہم تھے، اس جماعت کو اس حکام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان صحابہؓ میں سے چار حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے

اُن سے فرمایا کہ مجب محتار اور زید کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم اپنی کی زبان میں نازل ہوا ہے ۛ

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، یہاں تک کہ ابن ابی داؤد کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، جن میں حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت کثیر بن افلحؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا ۛ

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرار میں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراروں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً مسرھا لکھا، تاکہ اسے نَشْرُہَا اور نَشْرُہَا دونوں طرح پڑھا جاسکے، کیونکہ یہ دونوں فرائض درست ہیں ۛ

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی

ۛ یہ پوری تفصیل فتح الباری ص ۳ تا ۵ ج ۹ سے ماخوذ ہے،

ۛ مستدرک حاکم، ص ۲۲۹ ج ۲،

ۛ مناقب العرفان ص ۲۵۳ و ۲۵۴ ج ۱،

ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مکمل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا،^۱

(۲) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا، جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انھیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۃ احزاب کی ایک آیت **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ** **عَلَيْهِ عَلَيْهِ** لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت (انصاریؓ) کے پاس ملی، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

فَقَدْ آتَاةٌ مِنَ الْأَحْزَابِ حِينَ نَسَخْنَا الْمَصْحَفَ قَدْ كُنْتُ
اسْمُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهَا، فَالْتَمَسْنَا
فَوَجَدْنَا هَامِخَ خَزِيمَةَ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ،
”مجھے مصحف لکھتے وقت سورۃ احزاب کی آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ
خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی“

لے صحیح بخاری فتح الباری، ص ۹، ج ۹

لے صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۹، ج ۹

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۃ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی،

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے تذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسئلہ فتراقوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کا زمانہ کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں ان کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش ہوئی تھی جس کے اسباب ”سبعۃ احرف“ کی بحث میں گزر چکے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

لَا تَقُولُوا فِي عُمَانَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ مَا فَعَلَ الَّذِي فَعَلَ فِي الْمَصَاحِفِ
الْأَعْيُنُ مَلَأَتْهَا

”عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے سوانہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں رادر ہوا“

لے فتح الباری، ص ۱۵ ج ۹، بحوالہ ابن ابی داؤد در بسند صحیح،

تسہیل تلاوت کے اقدامات

چوتھا مرحلہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہ و تابعین نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی،

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر و بر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے،

نقطہ اہل عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، بلکہ لکھنے والا خالی حروف لکھنے پر اکتفا کرتا تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی آسانی ہو جاتا تھا، بلکہ بسا اوقات نقطے ڈالنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا، مورخ مدائنی نے ایک ادیب کا مقولہ نقل کیا ہے کہ:-

كثرة النقط في الكتاب سوء ظن بالمتكاتب اليه
 "خط میں کثرت سے نقطے ڈالنا مکتوب الیہ (کی فہم) سے بدگمانی کے مراد ہے"

چنانچہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، اور عمومی رواج کے علاوہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اس رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سہا سکیں، لیکن بعد میں عجمی اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی سہولت کے لئے قرآن کریم پر فقط ڈالے گئے، اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین کے تحت کیا، اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیانؓ نے ان سے یہ کام کرایا، اور بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر یہ کام کیا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسفؓ نے حسن بصریؓ، یحییٰ بن یعمرؓ اور نصر بن عاصم لیثیؓ کے ذریعہ انجام دیا، بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہی نقطوں کا موجد بھی ہو، اس سے پہلے نقطوں کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن علامہ قلعندیؒ نے (جو رسم الخط اور فن انشاء کے محقق ترین عالم ہیں) اس کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ نقطوں کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ایک روایت کے مطابق عربی رسم الخط کے موجد قبیلہ بولان کے مرآمر بن مرہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ ہیں، مرآمر نے حروف کی صورتیں ایجاد کیں، اسلم نے فصل وصل کے طریقہ وضع کئے، اور عامر نے نقطے بنائے، اور ایک روایت یہ بھی

۱۵ البرہان فی علوم القرآن ص ۲۵۰ ج ۱ والاتقان ص ۷۱ ج ۲ نوع ۷۶ ،

۱۶ صبح الاعشی ص ۱۵۵ ج ۳ ،

۱۷ البرہان ص ۲۵۰ و ۲۵۱ نوع ۱۲ ،

۱۸ الاتقان، ص ۷۱ ج ۲

۱۹ تفسیر القرطبی ص ۶۳ ج ۱ و تاریخ القرآن للکردی ص ۱۸۱ ،

۲۰ صبح الاعشی ص ۱۲ ج ۳ ،

ہے کہ نقطوں کے سب سے پہلے استعمال کا سہرا حضرت ابوسفیان بن حربؓ کے دادا ابوسفیان ابن امیہ کے سر ہے، انھوں نے یہ چہرہ کے باشندوں سے سیکھے تھے، اور چہرہ کے باشندوں نے اہل انبار سے؛ لہذا نقطے ایجاد تو بہت پہلے ہو چکے تھے، لیکن قرآن کریم کو متعدد مصلحتوں کے تحت اُن سے خالی رکھا گیا تھا، بعد میں جس نے بھی قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہ نقطوں کا موجد نہیں ہے، بلکہ صرف قرآن کریم میں ان کا استعمال سب سے پہلے اس نے کیا ہے

حركات | نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر بر پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے، کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؓ اور نصر بن عاصم لیشیؓ سے کرایا ہے۔ اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل معروف ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـ) زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ (ـ) پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ (ـ) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ـ) یا (ـ) یا (ـ) مفترقہ کے لئے بعد میں خلیل بن احمدؓ نے ہمزہ اور ثرید کی علامتیں وضع کیں، اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؓ، نصر بن عاصمؓ اور حسن بصریؓ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی اس موقع پر

۱۔ صبح الاعشی، ص ۱۳ ج ۳

۲۔ صبح الاعشی، ص ۱۵۵ ج ۳

۳۔ تفسیر القرطبی، ص ۶۳ ج ۱

۴۔ صبح الاعشی، ص ۱۶۰ ج ۳ و تاریخ القرآن للکردی، ص ۱۸۰

۵۔ الاتقان، ص ۱۷۱ ج ۲ و صبح الاعشی، ص ۱۶۱ ج ۳

حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زبر زبر پیش کی موجودہ صورتیں (سے سے) معترض کی گئیں تاکہ حرکت کے ذاتی نقطوں سے ان کا تناسب پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم،

احزاب یا منزلیں | صحابہؓ اور تابعینؓ کا معمول تھا کہ وہ ہر صفحے ایک قرآن کریم ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے ”حزب“ یا ”منزل“ کہا جاتا ہے، اس طرح قرآن کریم کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا، حضرت اوس بن حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ سے پوچھا آپ نے قرآن کے کتنے حزب بنائے ہوئے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا، اور آخری حزب مفصل میں ق سے آخر تک کا۔

اجزاء یا پارے | آجکل قرآن کریم تین اجزاء پر منقسم ہے جن میں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تین پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے مصاحف نقل کرتے وقت انھیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانے کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں ان کا رواج ہے، بظاہر

لہ البرہان فی علوم القرآن، ص ۵۰ ج ۱،

لہ تاریخ القرآن از مولانا عبد الصمد سارم، ص ۸۱،

لہ البرہان اس ۲۵۰ ج ۱، حزیذ دیکھے مناب العرفان، ص ۱۰۲ ج ۱،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم
اخماس اور اعشار | قرآنِ اُولیٰ کے متراکبی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج
 تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ
 ”خمس“ یا ”خ“ اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ ”عشر“ یا ”ع“ لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی
 علامتوں کو ”اخماس“ اور دوسری قسم کی علامتوں کو ”اعشار“ کہا جاتا تھا، علامت مندین
 میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے
 تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟
 ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے
 پہلے عباسی خلیفہ مأمون نے اس کا حکم دیا تھا، لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست
 معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں ”اعشار“ کا تصور ملتا ہے، مصنف ابن ابی
 شیبہؒ میں روایت ہے:

عن مسروق عن عبد الله بن كثر العشيري في المصحف
 ”مسروقؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مصحف میں اعشار کا نشان
 ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”اعشار“ کا تصور صحابہؓ کے زمانے ہی میں پیدا ہو چکا تھا،
رکوع | ایک اور علامت جس کا رواج بعد میں ہوا، اور آج تک جاری ہے رکوع
 کی علامت ہے، اور اس کی تعین معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں
 ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ”ع“) بنا دی گئی، احقر کو
 جب جو کہ باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور

۱۵ منہا، العرفان، ص ۲۰۳ ج ۱ ۱۵ الاتفاق، ص ۱۷ ج ۲ نوع ۷۷

۱۵ البرہان، ص ۲۵ ج ۱

۷۷ مصنف ابن ابی شیبہؒ ص ۲۹۷ ج ۲ کتاب الصلوٰۃ، مطبعة العلوم الشرقیہ دکن

۳۸۷

میں کی؟ بعض حضرات کا خیال ہو کہ ان رکوعات کی تعیین بھی حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں ہو چکی تھی، لیکن روایات سے اس دعوے کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو ”رکوع“ اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ان المشائخ رحمهم الله جعلوا القرآن على خمس مائة والعين
ركوعاً واعلموا ذلك في المصاحف حتى يحصل النعم في ليلة السات
والعشرين[ؑ]

”مشائخ نے قرآن کریم کو پانچ سو چالیس رکوعوں پر تقسیم کیا ہے، اور مصحف میں اس کی علامتیں بنادی ہیں، تاکہ (تراویح میں) قرآن کا ختم ستائیسویں شب میں ہو سکے“

رُمُوزِ اَوَاقِفُ | تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارات لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو ”رُمُوزِ اَوَاقِفُ“ کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی دان انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد بن طہوف سجاندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے ہیں، ان رموز کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ تاریخ القرآن از مولانا عبد الصمد صائم ص ۸۱،

۲۔ فتاویٰ عالمگیریہ، فصل التراویح ص ۹۴ ج ۱ مطبوعہ نوکلشیر،

۳۔ التشرنی القراءات العشر لاس الجوزی ص ۲۵ ج ۱،

۴۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے لیکن جیسیم نے قرآن کریم کے رُجُزِ نسوخی میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی۔ اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے جو سکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم

از ناشر
۱۳/۱۲/۹۲ھ

ط، یہ ”وقف مطلق“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے،
ج، یہ ”وقف جائز“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے،

ز، یہ ”وقف مجوز“ کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا تو درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے،

ص، یہ ”وقف مخصص“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دو سکے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے،^{۱۵}

ھ، یہ ”وقف لازم“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے ”وقف واجب“ بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا زیادہ بہتر ہے،^{۱۶}

لا، یہ ”لَا تَقِفْ“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ”یہاں نہ ٹھہرو“ لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں^{۱۷}

۱۵ ان چاروں رموز کی تشریح کے لئے دیکھئے المصنف الفکرۃ شرح المقدرۃ الجریۃ للآعلی القاری ص ۶۳،
مطبوعہ ابنہ غلام رسول، ۱۴۳۱ھ، ص ۲۳۱ ج ۱، ۱۴۳۳ھ،

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں مثلاً:۔
 مع، یہ ”معانقہ“ کا مخفف ہے، یہ علامت اُس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ذَلِكْ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَنَزْعٍ أَخْرَجَ شَطْرَهُ، الخ، اس میں اگر التورۃ پر وقف کر لیا تو الانجیل پر وقف درست نہیں، اور اگر الانجیل پر وقف کرنا ہے تو التورۃ پر درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں، تو درست ہے، اس کا ایک نام ”مقابلہ“ بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دہی امام ابو الفضل رازیؒ نے فرمائی ہے؛

سکتہ؛ یہ ”سکتہ“ کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رکنا چاہتے لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو،
 وقفہ؛ اس جگہ ”سکتہ“ سے قدرے زیادہ دیر تک رکنا چاہتے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے،

ق؛ یہ ”قیل علیہ الوقف“ کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے،
 قف؛ یہ لفظ ”قف“ ہے، جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، اور یہ اُس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں،

”وصل اولیٰ“ کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ ”ملا کر پڑھنا بہتر ہے“
 ”قدیوصل“ کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ بٹھرتے ہیں اور بعض ملا کر
 پڑ بنے کو پسند کرتے ہیں،

یہ رموز کافی مشہور ہیں، لیکن احقر کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا دامنغ و مؤجد
 کون ہے؟

قرآن کریم کی طباعت

پانچواں مرحلہ

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے
 تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن
 کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے
 مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف
 کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقل تصنیف
 چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں،

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۳۱۳ھ میں قرآن کریم
 طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد
 مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل
 نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر
 سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۵۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان
 میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۶۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر
 چھاپا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے،

۱۵ طباعت کی تاریخ کے لئے دیکھئے تاریخ القرآن لکھنؤ، ص ۸۶ اور علوم القرآن ڈاکٹر صبی صالح

اردو ترجمہ از غلام احمد حریری، ص ۱۴۲

فِترَات اور اُن کی تدوین

”سبۃ احرف“ کی بحث میں گزر چکے ہیں کہ تلاوت کی سہولت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فِترَانِ کریم کو متعدد قراءتوں میں نازل فرمایا تھا، قراءتوں کے اس اختلاف سے آیات کے مجموعی معنی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن تلاوت اور ادائیگی کے طریقوں میں فرق ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی ہے،

اُمّتِ مسلمہ نے فِترَانِ کریم کی ان قراءتوں کو بھی ہر دور میں محفوظ رکھا ہے، اور اس غرض کے لئے بے مثال خدمات انجام دی ہیں، یہاں ان جلیل القدر خدمات کا مختصر تذکرہ بھی ممکن نہیں، البتہ چند اشارات ضروری ہیں،

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ فِترَانِ کریم کی اشاعت کا اصل مدار کتابت کے بجائے حافظہ اور نقل و روایت پر ہے، اُدھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مصاحف عثمانی کو نقطہ اور حرکات سے اسی لئے خالی رکھا گیا تھا، تاکہ اس میں تمام مسلم قراءتیں سما سکیں، چنانچہ جب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مصاحف عالم اسلام کے مختلف خطوں میں روانہ کئے تو اُن کے ساتھ ایسے فِتراء کو بھی بھیجا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انھوں نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق لوگوں کو فِترَانِ کریم کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح ”علم قراءت“ کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اُمّت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ”قراءت“ قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں :-

۱۔ مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو،

۲۔ عربی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق ہو،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قراء میں مشہور ہو۔

جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو، اسے قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسل بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبیدہ قاسم ابن سلامؒ، امام ابو حاتم سحتمانیؒ، قاضی اسماعیلؒ اور امام ابو جعفر طبریؒ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں، جن میں بین سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس ابن مجاہدؒ (متوفی ۲۴۲ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قراءت کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراءت کی قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں یہی ہیں باقی قاریوں کی قراءتیں صحیح یا متواتر نہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا اور دوسری قراءتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ ”سبعۃ احرف“ کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں جنہیں ابن مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ ”سبعۃ احرف“ کی صحیح تشریح وہ ہے جو پیچھے ایک مستقل عنوان کے تحت گزر چکی ہے،

بہر حال، علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے

وہ یہ ہیں:-

۱۔ عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۲۴۲ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس

بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابویوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قرأت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قرأت کے راویوں میں بڑی اور قلیل زیادہ مشہور ہیں،

۲۔ نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیمؓ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا، جو براہ راست حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کے راویوں میں ابوموسیٰ قالونؓ (متوفی ۱۶۹ھ) اور ابوسعید درشامؓ (متوفی ۱۶۹ھ) مشہور ہوئے،

۳۔ عبداللہ الجعفی جو ابن عامرؓ کے نام سے معروف ہیں، (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قرأت کافن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؓ سے حاصل کیا، جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرأت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور ان کی قرأت کے راویوں میں ہشام اور ذکوان زیادہ مشہور ہیں،

۴۔ ابو عمر زبان بن العلاء بن عمارؓ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے حضرت مجاہدؓ اور سعید بن جبیرؓ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرأت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قرأت کے راویوں میں ابو عمر الدوریؓ (متوفی ۱۶۹ھ) اور ابو شعیب سوسیؓ (متوفی ۱۶۹ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۵۔ حمزہ بن حبیب الریاتیؓ مولیٰ عکرمہ بن زبیع الیتی (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمان اعمشؓ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؓ کے وہ زبیر بن حبیشؓ کے، اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؓ (م ۱۸۸ھ) اور خالد بن خالدؓ (م ۱۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۶۔ عام ابن ابی الجود الاسدی (متوفی ۲۱۷ھ) آپ حضرت زرار بن حبیشؓ کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اور ابو عبد الرحمن سلمیؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرأت کے راویوں میں شعبہ بن عیاش (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؓ (متوفی ۱۷۷ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عموماً تلاوت حفصؓ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے،

۷۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسانی الخویؓ (متوفی ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں... ابوالحارث مروزیؓ (متوفی ۱۷۷ھ) اور ابو عمر الدوریؓ (جو ابو عمروؓ کے بھی راوی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قرأتیں زیادہ ترکوفہ میں رائج ہوئیں،

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قرأتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بدین بن غلط فہمی پیدا ہوئی کہ صحیح قرأتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدد علماء نے (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن ہرانؒ نے) سات کے بجائے دس قرأتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ ”قراآت عشرہ“ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قرأتوں میں مندرجہ بالا سات قرأت کے علاوہ ان تین حضرات کی قرأتیں بھی شامل کی گئیں :-

۱۔ یعقوب بن اسحاق خضرمیؓ (متوفی ۲۲۵ھ) آپ نے سلام بن سلیمان الطویل سے استفادہ کیا اور انھوں نے عامؓ اور ابو عمروؓ سے، آپ کی قرأت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی،

۲۔ خلف بن ہشامؓ (متوفی ۲۵۲ھ) آپ نے سلیم بن عیسیٰ بن حمزہ بن حبیب زریات سے استفادہ کیا تھا، چنانچہ آپ حمزہؓ کی قرأت کے بھی راوی ہیں آپ کی قرأت کوفہ میں زیادہ رائج تھی،

۳۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع (متوفی ۳۱۵ھ) آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے استفادہ کیا تھا، اور آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں رائج رہی،

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چوڑہ قاریوں کی قراءتیں جمع کیں، اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قراء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:-

۱۔ حسن بصریؒ: (متوفی ۳۲۰ھ) آپ کبار تابعین میں سے ہیں، اور آپ کی قراءت کامرکز بصرہ میں تھا،

۲۔ محمد بن عبدالرحمن ابن محیصنؒ: (متوفی ۲۳۳ھ) آپ حضرت مجاہدؒ کے شاگرد اور ابو عمروؒ کے استاذ ہیں، اور آپ کامرکز مکہ مکرمہ میں تھا،

۳۔ یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ: (متوفی ۳۲۵ھ) آپ بصرہ کے باشندے تھے، اور ابو عمروؒ اور حمزہؒ سے استفادہ کیا تھا،

۴۔ ابوالفرج محمد بن احمد شنبوزیؒ: (متوفی ۳۸۵ھ) آپ بغداد کے باشندے تھے، اور اپنے استاذ ابن شنبوزؒ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے شنبوزی کہلاتے تھے،

بعض حضرات نے چوڑہ قاریوں میں حضرت شنبوزیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے،

ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں،

ہمارے زمانے کے مشہور مستشرق منٹگمری واٹ (Montgomery watt) نے اپنے استاذ بیل (Bell) کی متابعت میں علامہ ابن مجاہدؒ کے عمل کی جو غلط تشریح کی ہے یہاں اس کی نشان دہی بھی مناسب ہے، انھوں نے لکھا ہے

کہ ابن مجاہدؒ نے سات قرأتیں جمع کر کے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ حدیث میں قرآن کریم کے جن ”سات حروف“ کا تذکرہ ہو اُن سے یہی ”سات قرأتیں“ مراد ہیں، دوسری طرف ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سات قرأتوں کے علاوہ دوسری کوئی قرأت قابل اعتماد نہیں چنانچہ دوسرے علمائے بھی اُن کے اس نظریہ کو قبول کر لیا، اور اسی بناء پر علامہ ابن مقسمؒ اور ابن شنبوذؒ کو اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ وہ دوسری قرأتوں کو بھی قابل اعتماد سمجھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ واط کے مذکورہ بالا بیان میں ایک بات بھی درست نہیں، ہم سمجھے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں مختلف علماء اور قرآن نے اپنی اپنی سہولت کے لحاظ کئی کئی قرأتیں ایک ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں، اُن میں سے کسی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ دوسری قرأتیں ناقابل اعتماد ہیں، خود امام ابن مجاہدؒ نے بھی ان سات قرأتوں کو جمع کرتے وقت کہیں یہ نہیں لکھا کہ ”سات حروف“ کی تشریح ہے، اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ صحیح قرأتیں اپنی سات میں منحصر ہیں، دوسرے علماء نے بھی اُن کے عمل سے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ دوسری قرأتوں کو ناقابل اعتماد قرار دینا چاہتے ہیں، اس کے بجائے تمام محقق علماء اس خیال کی ہمیشہ تردید کرتے آئے ہیں، علم قرأت کے مستند ترین عالم علامہ ابن الجزریؒ نے جو ”محقق“ کے لقب سے مشہور ہیں اپنی کتابوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ہے، ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

”ہم نے اس بحث کو اس لئے طول دیا ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض بے علم لوگ صرف اپنی سات قرأتوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد صرف یہی سات

قراتیں ہیں..... اسی بنا پر بہت سے ائمہ متقدمین نے ابن مجاہد پر
یہ تنقید کی ہے کہ انہیں سات قراتیں جمع کرنے کے بجائے سات سے
کم یا سات سے زائد قراتیں ذکر کرنی چاہئے تھیں، یا اپنی مراد واضح کر دینی
چاہئے تھی تاکہ بے علم لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے ۱۱

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بہت سے ائمہ قرات کے اقوال نقل کئے ہیں،
جن میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ابن مجاہدؒ نے صرف ”مصاحف سبعہ“ کے عدد کی رعایت
سے ”سات قراتیں“ جمع کر دیں، ورنہ ان کا مقصد باقی قراتوں کو غلط یا ناقابل اعتماد
قرار دینا نہیں تھا، ۱۲

ربا ابن مقسمؒ اور ابن شبنوذہؒ کا قصہ، تو دراصل علماء نے جو ان کی تردید کی،
اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان سات قراتوں کے علاوہ دوسری قراتوں کو کیوں
صحیح سمجھتے ہیں؟ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُمت کے تمام علماء اس بات پر متفق رہے ہیں
کہ کسی قرات کے صحیح ہونے کے لئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے، ایک یہ کہ
مصحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ عربی صرف و نحو کے قواعد
کے مطابق ہو، تیسرے یہ کہ وہ صحیح سند کے ساتھ منقول اور ائمہ قرات میں مشہور ہو، یہ
شرائط جس قرات میں بھی پائی جائیں وہ قابل قبول ہے، خواہ وہ سات قراتوں میں
شامل ہو یا نہ ہو، اور جہاں ان میں سے کوئی بھی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ ناقابل اعتماد
ہے، خواہ وہ ان سات قراتوں میں شامل ہی کیوں نہ ہو، لیکن ابن مقسمؒ اور ابن شبنوذہؒ
نے اس اجماعی اصول کی خلاف ورزی کی تھی، ابو بکر محمد بن مقسمؒ کا کہنا یہ تھا کہ قرات

۱۱۔ النشرفی القرآن العشر، ص ۳۵ و ۳۶ ج ۱

۱۲۔ فتح الباری، ص ۲۵ تا ۲۹ ج ۹ والاتقان ص ۸۲ و ۸۳ ج ۱، نورع ۲۲،

۱۳۔ ابن مقسمؒ کا پورا نام ابو بکر محمد بن الحسن بن یعقوبؒ اور ابن شبنوذہؒ کا پورا نام محمد بن احمد
ابن ایوب ہے،

کے صحیح ہونے کے لئے صرف پہلی دو شرطیں کافی ہیں، لہذا اگر کوئی قرارت مصحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق ہو اور عربیت کے لحاظ سے بھی صحیح ہو تو اسے قبول کر لیا جائے گا، خواہ اس کی کوئی سند موجود نہ ہو، اور ابن شبنوذ نے اس کے برعکس یہ کہا تھا کہ اگر کوئی قرارت صحیح سند سے منقول ہو تو خواہ رسم عثمانی میں اس کی گنجائش نہ نکلتی ہو، اسے پھر بھی قبول کر لیا جائیگا، اس بنا پر اُمت کے تمام علماء نے ان دونوں کی تردید کی، اس مقصد کے لئے مباحثہ کی مجلسیں بھی ہوئیں، اور بالآخر ان دونوں نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کر لیا:

—————

۱۵ التشرنی القراءات العشر، ص ۷۴ و ۳۵۵ ج ۱ ادالاتقان ص ۱۹ ج ۱ و تاریخ بغداد،
للخطیب ص ۲۸۰ ج ۱ طبع بیروت و وفیات الأعیان لابن خلکان، ص ۷۹۰ ج ۱ طبع مصر

حفاظتِ قرآن متعلقِ شبہات

اور ان کا جواب

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا تھا:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

ہم نے ہی قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

اس میں یہ پیشینگوئی کر دی گئی تھی کہ قرآن کریم قیامت تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہے گا، اور دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹانے یا اس میں تحریف و ترمیم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی، گزشتہ صفحات میں آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشینگوئی کو عملی طور پر کس طرح سچا کر کے دکھایا، اور ہر دور میں اس کی کس طرح حفاظت کی گئی، چنانچہ آج یہ بات پورے وثوق اور دعوے کے ساتھ بلا خوف تردد یہ کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم ہمارے پاس اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی تھی، اور اس میں آج تک کسی ایک نقطے یا شوشے کا بھی فرق نہیں ہو سکا،

یہ بات صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں بلکہ منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی، لیکن جب نگاہوں پر تعصب یا عناد کا پردہ پڑ جائے تو ایک شفاف چشمہ بھی گرد لانظر کرنے لگتا ہے، چنانچہ بعض غیر مسلم مصنفین نے قرآن کریم کی حفاظت کے معاملہ میں بھی کچھ شبہات اعتراض اٹھائے ہیں، یہاں ہم ان شبہات کی حقیقت اختصار کے ساتھ واضح کرنا چاہتے ہیں، ابتدائی زمانہ کی کچھ آیات محفوظ نہیں رہیں، پہلا اعتراض

قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ ان کی حفاظت کا سارا دار و مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حفظ پر تھا، چنانچہ عین ممکن ہو کہ ابتدائی زمانہ کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں، اس دعوے کی دلیل میں پہلے قرآن کریم کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔

۱۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ.

(سورۃ اعلیٰ: ۶)

”ہم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ بھولیں گے نہیں، مگر جو کچھ اللہ چاہے“

۲۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا، (بقرہ: ۱۰۹)

”ہم جس آیت کو منسوخ کریں گے یا بھٹلا دیں گے ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے“

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم

کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

پہلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب جبریل علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دہراتے رہتے تھے، اور اس میں آپ کو شدید تعب ہوتا تھا، اس آیت میں آپ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے، لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظے سے محو ہو گئیں، اس کا جواب دینے کے لئے اَللّٰہُ مَا شَاءَ اللّٰہُ (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھادیئے گئے، جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اُسی وقت وہ آیت آپ کے حافظے سے محو ہو سکے گی اس کے بغیر نہیں، اُسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بنا پر آپ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہو جائیں گی،

لہذا ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیا تو ان کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا، مگر ساتھ ساتھ انہیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کر دیا گیا، ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو صراحتہً کہا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے، اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوتیں، ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

رہا ان آیتوں سے اس بات پر استدلال کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کریم لکھا نہیں جاتا تھا، سو یہ ایک قطعی بے بنیاد اور لغو استدلال ہے، ہم نیچے بتا چکے

ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے قرآن کریم کی آیتوں کا صحابہؓ کے پاس لکھا ہوا ہونا مستند روایات سے ثابت ہے، لہذا پہلی آیت میں صرف ”نسیان“ (بھول جانے) کے ذکر پر اکتفا کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اس وقت قرآن کریم مکتوب شکل میں نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ذکر ہی صرف ”نسیان“ کا چل رہا ہے، اس لئے اس مقام پر لکھی ہوئی آیتوں کو مٹانے کا ذکر کیا جاتا تو وہ قطعی بے موقع اور بے محل بات ہوتی، یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت میں چونکہ ”نسخ“ ہی موضوع گفتگو ہے اس لئے اس میں ”نسخ“ (لکھے ہوئے کو مٹانے) اور ”انسا“ (بھلا دینے) دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ”نسخ“ کے لغوی معنی زائل کرنے اور مٹانے کے آتے ہیں لہذا یہ لفظ صراحۃً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود تھا، اور اس کی بعض آیتوں کو منسوخ ہونے کی بناء پر مٹایا گیا ہے، حیرت ہو کہ یہ آیت جو صراحۃً قرآن کریم کے مکتوب ہونے پر دلالت کر رہی ہے اُس کو پہلے قرآن کے غیر مکتوب ہونے کی تائید میں پیش کر رہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ | مستشرق ڈی، ایس، مارگوئیو تھے
ایک آیت یاد نہیں ہی تھی؛ دوسرا عرض | نے صحیحین کی ایک حدیث کی بناء
پر قرآن کریم کی حفاظت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے؛ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے
کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو مسجد میں قرآن کریم پڑھتے
ہوئے سنا تو آپؐ نے فرمایا کہ:-

وَحِمَّةُ اللَّهِ، لَقَدْ أَذْكَرَنِي آيَةً كُنْتُ أَتَسَيِّمُهَا،
”اللہ ان پر رحم کرے، انھوں نے مجھے ایک ایسی آیت یاد دلادی

جو مجھ سے بھول گئی تھی ۱

اس روایت کو ذکر کرنے سے مارگو کو تھکا کا مقصد یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کسی وقت بھول سکتے ہیں تو (معاذ اللہ) دوسری آیات میں بھی یہ امکان ہے، نیز وہ اس روایت سے غالباً یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم کھایا ہوا نہیں تھا، ورنہ آپؐ یہ آیت نہ بھولتے، لیکن یہ اعتراض اس قدر عجیب اور بے بنیاد ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسے درست تسلیم نہیں کر سکتا، کیونکہ مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد تو ہوتی ہے، مگر چونکہ عرصہ دراز تک اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، نہ اُس کی طرف خیال جاتا ہے، اس لئے وہ ذہن میں مستحضر نہیں رہتی، اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً حافظے میں تازہ ہو جاتی ہے، یہ حقیقت میں بھول نہیں ہوتی، بلکہ عارضی طور پر خیال سے نکل جاتا ہوتا ہے، یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی، اس لئے ایسے واقعے کو بنیاد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسیان کی... نسبت کرنا اتہام درجے کی بے انصافی ہے جس کا منشا تعصب کے سوا کچھ نہیں، بلکہ اگر مسٹر مارگو کو تھکا بصیرت اور انصاف کی نگاہ سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اس واقعے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اس غیر معمولی طریقے سے فرمائی ہے کہ اس کے کسی حصے کے گم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، کیونکہ اس واقعے سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اتنے بے شمار افراد کو یاد دلا دی گئی تھی کہ اگر کوئی آیت کسی وقت اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر مستحضر نہ رہے تب بھی اس کے ضائع ہونے کا دور دورہ کوئی امکان نہیں تھا، رہی یہ بات کہ اُس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں

موجود نہیں تھا، سو یہ پہلی بات سے زیادہ بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے، اہم عرض کر چکے ہیں کہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر تحضر نہیں رہی تھی، جو ایک صحابی کی تلاوت سے فوراً ذہن میں تازہ ہو گئی، اس کے یہ کہان ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا، کیا مستشرق موصوفہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک مرتبہ لکھی گئی وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے اوجھل نہیں ہو سکتی؟ پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے آپ کے قرآن کریم کو یاد رکھنے کا کتابت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، لہذا مذکورہ واقعہ سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال وہی شخص کر سکتا ہو جس نے اپنے اوپر انصاف اور بصیرت کے سارے دروازے بند کر لئے ہوں،

سورۃ نساء میں سورۃ النعام کا حوالہ | پروفیسر مارگولئیو تھ نے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر ایک اور عجیب و غریب استدلال یہ کیا ہے کہ سورۃ نساء

میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَفْعَلُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ (نساء: ۱۳۰)

”اور اللہ تم پر قرآن میں یہ اتار چکا ہے کہ جب تم (کسی مجلس میں) اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر اور ہتھڑا ہوتا ہوا سنو تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو، نہ تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔“

یہ آیت مدنی ہے اور اس میں سورۃ النعام کی جس مکی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:-

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ط (الانعام: ۶۸)

”اور جب ہم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب جوئی کرتے ہیں تو ان

لوگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔“

پہلی آیت میں دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں مگر گویا
نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی نہیں تھیں، ورنہ اگر قرآن
لکھا ہوا ہوتا تو پہلی آیت میں بعینہ وہی الفاظ ذکر کئے جاتے جو دوسری آیت میں مذکور ہیں
الفاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کے نزول کے وقت دوسری آیت
کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے،

لیکن مگر گویا کایہ استدلال اس قدر بدیہی طور پر غلط ہے کہ اس کا جواب دیتے
ہوئے بھی شرم آتی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر سورۃ نسا کے نزول کے وقت سورۃ انعام کی مذکور
آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے تو پھر بعد میں وہ کیسے قرآن کریم میں لکھے
گئے؟ اگر سورۃ انعام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ بعد میں
لکھنے والے سورۃ انعام میں بھی بعینہ وہ الفاظ لکھے جو سورۃ نسا میں مذکور ہیں، ان دونوں
آیتوں کا لفظی اختلاف تو درحقیقت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیتوں کے
الفاظ ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدل تھے، اور ان میں کسی کے قیاس و گمان
کو کوئی دخل نہیں رہا، کیونکہ اگر قرآن کریم کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی
تو ان دو آیتوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے محاورات میں جب کسی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا
ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، بعض مرتبہ سابقہ گفتگو کے بعینہ الفاظ دہرائے
جاتے ہیں (جسے انگریزی میں **Direct Narration** کہتے ہیں)

اور بعض اوقات الفاظ بعینہ وہی نہیں ہوتے صرف سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو

دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے (جسے انگریزی میں **Indirect Narration**

کہا جاتا ہے) ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال

ہوتی ہے، یعنی ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جس سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جا رہا ہو اس کے پورے پورے الفاظ دہرائے جاتیں، اس کے بجائے ادبی محاورات میں زیادہ تر دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے، یعنی اس گفتگو کے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا جاتا ہے، سورۃ نساء میں بھی یہی دوسری صورت اختیار کی گئی ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ بسا اوقات اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جداگانہ اُسلوب رکھتی ہے، لہذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسری سورت کا جملہ بعینہ جوڑ دیا جائے تو آیتوں کے تسلسل (Sequence) میں فرق پڑ جاتا ہے، اور جملوں کی وہ روانی (Flow) برقرار نہیں رہتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلم ہے، چنانچہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق کا کچھ حسہ ملا ہو وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر سورۃ نساء کی مذکورہ آیت میں سورۃ انعام کے بعینہ الفاظ نقل کر دیئے جائیں تو عبار کا زور اور تسلسل ٹوٹ جائے گا،

اس کے علاوہ سورۃ انعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مارگو کیونٹھ کا دعویٰ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہیں تھی، پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی ہے، اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے :-

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقٌ لِّلَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ

(انعام: ۹۲)

”اور یہ (قرآن) بھی ایسی ہی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، جو بڑی برکت والی ہے اور اپنے سے پہلے (نازل شدہ) کتابوں (تورات و انجیل وغیرہ) کی تصدیق کرنے والی ہے“

اس میں قرآن کے لئے لفظ ”کتاب“ استعمال کیا گیا ہے، اگر سورۃ انعام کے نزول کے وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہیں تھا تو اسے ”کتاب“ کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا؟

غرض جس پہلو سے دیکھتے، مار گولیو تھ کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد، لغو اور محض تعصبی
عناد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے،

امام بخاریؒ پر مار گولیو تھ کا ایک بہتان
چوتھا اعتراض
پر ایک چوتھا اعتراض ان الفاظ
میں کیا ہے:-

”بخاریؒ کا کہنا ہے کہ ایک جملہ اَلَا اَنْ تَقِيْلُوْا مَا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ
مِنْ الْقُرْآنِ (مگر یہ کہ تم اس رشتہ داری کا پاس کر دو میرے اور تمہارے
درمیان موجود ہے) بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، لیکن شراح کا کہنا ہے کہ یہ جملہ
قرآن میں نہیں ملتا، اس لئے وہ اس جملہ کو سورۃ ۷۷ آیت ۲۷ یعنی اَلَا
اَتْمُوْذِقُوْا فِي الْقُرْبٰی کی تشریح قرار دیتے ہیں۔“

لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ مار گولیو تھ جیسے
عالمی شہرت کے مستشرق نے امام بخاریؒ پر ایسا شرمناک بہتان باندھا ہے جس کی متعصبانہ
بددیانتی یا افسوسناک چہالت کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اس عبارت مار گولیو تھ
نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امام بخاریؒ ایک ایسے جملے کو قرآن کریم کا جزء مانتے ہیں
جو اس وقت قرآن میں موجود نہیں ہے، حالانکہ ہر شخص صحیح بخاری اٹھا کر دیکھ سکتا ہے
کہ امام بخاریؒ نے آیت کے الفاظ بعینہ وہی نقل کئے ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں،
اور اَلَا اَنْ تَقِيْلُوْا اَنْهٗ وَالْاَجْمَلُ اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے، امام بخاریؒ کی پوری
عبارت یہ ہے:-

باب قوله اَلَا الْمَوَدَّةُ فِي الْقُرْبٰی حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ
عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ
فَقَالَ سَعِيدُ بْنُ جَبْرِ قُرْبٰی اَلَمْ يَحْمَدِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فقال ابن عباس عجلت، ان النبي صلى الله عليه وسلم
لم يكن بطن من قریش الا كان له فيهم قرابة فقال الا
ان تصلوا ما بيني وبينكم من القرابة

ملاحظہ فرمائیے، یہاں امام بخاریؒ نے باب کے عنوان میں آیت کا وہی جملہ
نقل کیا ہے، جو قرآن کریم میں موجود ہے، پھر اس کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ سے
آیت اَلَا الْوَدَّاعَةُ فِي الْقُرْبَىٰ کی تفسیر پوچھی گئی تھی جس کے جواب میں آپؓ نے یہ جملہ
ارشاد فرمایا کہ اَلَا ان تصلوا ما بيني وبينكم من القرابة، لیکن مارگوئیو تھ ص ۱۰۰
پوری ڈھٹائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس جملہ کو بذریعہ وحی نازل شدہ
مانتے ہیں، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحقیق و انصاف کے یہ دعویدار قرآن کریم
کے خلاف تعصب کے کس ادنیٰ روگ میں مبتلا ہیں، اور اسلام کے خلاف بغض و
عناد نے انھیں کس بُری طرح جکڑا ہوا ہے، فی ثَمُوْهُمْ مَرَضٌ فَرَّادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا
حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہو گئی تھیں | مارگوئیو تھ نے پانچواں اعتراض
یہ کیا ہے کہ مسند احمدؒ کی ایک
روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے

کہ حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہو گئی تھیں؟

یہاں مارگوئیو تھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے :-
عن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم قالت لقد
انزلت آية الرجم ورضعات الكبير عشر فكانت في
ورقة تحت سرير في بيتي فامساها اشتكى رسول الله صلى الله عليه وسلم

لہ صحیح بخاریؒ، کتاب التفسیر سورہ حم عسق، ص ۱۳، ج ۲، طبع کراچی، دفعہ الباری
ص ۲۵۷، ج ۸ و عمدة القاری، ص ۱۵۷، ج ۱۹،
لہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایٹھکس، ص ۵۲۳، ج ۱۰،

علیہ وسلم تشاغلنا بامرہ ودخلت دویۃ لنا فاکلتھا، لہ
حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ رحم کی آیت اور بڑے آدمی کے دہلی رضع
کی آیت نازل ہوئی تھیں، یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے کاغذ
پر لکھی ہوئی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (مرضِ وفات کی)
تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے، ہمارا
ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا ہے
یہ باجماع امت وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی، خود حضرت عائشہ
بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوة ہونے کی قائل ہیں، لہذا اگر انھوں نے یہ آیات
کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشاء سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے
کچھ نہ تھا، ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہ رضی کے نزدیک قرآن کریم کا جزء ہوتیں تو
وہ کم از کم ان کو تو یاد رکھیں، وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں، لیکن
انھوں نے ساری عمر ایسی کوشش نہیں کی، اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت
عائشہ رضی کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں اور قرآن کریم
کی دوسری آیات کی طرح اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر
بھی نہیں تھا، لہذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرج نہیں آتا،
بعض حضرات کو حفاظت قرآن سے
متعلق حضرت قتادہ کی ایک اور روایت
سے شبہ ہوتا ہے، یہ روایت صحیح

عبدالرسالت میں حفاظ کی تعداد
چھٹا اعتراض

بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے :-

سألت انس بن مالك رضي الله عنه من جمع القرآن علي

عهد المتبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال اربعة کلہم من
الانصار، ابی بن کعبؓ ومعاذ بن جبلؓ وزید بن ثابتؓ
وابوزیدؓ،

”میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
زمانے میں قرآن کریم کس نے جمع کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا چار افراد نے
جن میں سے ہر ایک انصار میں سے تھا، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ
ابن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم“

اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک
میں قرآن کریم کے حافظ بس یہی چار حضرات تھے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں،
ہم سمجھیں ان حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی شمار کراچے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانے میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، لہذا حضرت انسؓ کی مذکورہ
بالا روایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحابہؓ کی پوری جماعت میں ان چار حضرات
کے سوا کوئی اور قرآن کریم کا حافظ نہیں تھا، بلکہ مذکورہ بالا حدیث میں ”قرآن کریم
کو جمع کرنے“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور اس لفظ کا صحیح مفہوم قرآن کریم کو لکھنا
ہے، اور حضرت انسؓ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چار حضرات وہ ہیں جن کے پاس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں قرآن کریم کا پورا پورا لکھا ہوا موجود تھا۔
اس کے علاوہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبری کی ایک روایت کے حوالے
سے حضرت انسؓ کے اس ارشاد کا پورا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اوس اور خزرج
کے قبیلوں میں باہمی مفاخرت کا سلسلہ چلا، قبیلہ اوس کے حضرات نے اپنے قبیلے
کے اُن افراد کے نام شمار کرائے جنھیں ہلالہ میں خصوصی مقام حاصل ہوا، اس
کے جواب میں قبیلہ خزرج کے حضرات (جن میں حضرت انسؓ بھی شامل تھے) یہ فرمایا
کہ ہم میں چار حضرات ایسے ہیں جنھوں نے پورا قرآن کریم جمع کیا تھا، لہذا اس ارشاد
کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اوس اور خزرج کے قبیلوں میں قرآن کریم کو جمع

کرنے والے یہی چار حضرات تھے ۛ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوذتین
ساتواں اعتراض

بعض لوگ مسند احمدؒ کی اُس روایت کو
بہت اُچھالتے ہیں جس میں یہ بیان
کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

رضی اللہ عنہ معوذتین (سورۃ فلق اور سورۃ ناس) کو قرآن کریم کا جز نہیں مانتے تھے،
حالانکہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ
تعالیٰ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح معوذتین کو قرآن کریم کا جز قرار دیتے تھے، اور جن
روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان دو سورتوں کے قرآن ہونے کے قائل نہ تھے وہ
درست نہیں ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی
جو متواتر قراتیں منقول ہیں اُن میں معوذتین شامل ہیں، قراتِ عشرہ میں سے
حضرت عاصمؓ کی قرات حضرت ابو عبد الرحمنؓ، حضرت زربن حبیشؓ اور حضرت
ابو عمرو الشیبانیؓ سے منقول ہے، اور یہ تینوں حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
سے روایت کرتے ہیں، اسی طرح حضرت حمزہؓ کی قرات علقمہؓ، اسودؓ، ابن وہبؓ
مسروقؓ، عاصم بن صخرہؓ اور عمارؓ سے منقول ہے، اور یہ تمام حضرات اسے حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ قراتِ عشرہ میں سے کسائیؓ،
اور خلفؓ کی قراتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم ہوتی ہیں، کیونکہ
کسائیؓ حمزہؓ کے شاگرد ہیں، اور خلفؓ اُن کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۳۱ و ۳۲ ج ۹ باب القراءۃ من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ۛ Watt : W. Montgomery ; Bell's Introduction to
the Quran PP. 46

ۛ التشریفی القراءات العشر، لابن الجوزیؒ، ص ۵۶ ج ۱،

ۛ التشریفی القراءات العشر، لابن المحب زریؒ، ص ۱۶۶ ج ۱،

پر اُمت کا اجماع ہے کہ قرآن عشرہ کی ساری اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسل تو اسے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، اس لئے اگر کوئی خبر واحد ان متواتر فتراء توں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرد ہے، اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا،

اسی بنا پر محقق علماء اور محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع یا کم از کم ناقابل قبول بتایا ہے، جو حضرت ابن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، ان علماء میں شیخ الاسلام علامہ نوویؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام رازیؒ، قاضی ابوبکر بن عربیؒ، علامہ بحر العلومؒ اور آخری دور کے مشہور محقق عالم علامہ زاہد کوثریؒ رحمہم اللہ شامل ہیں،

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ نور الدین، بیہقیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں، پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہو؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہو کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے، تمام محدثین نے ”حدیث صحیح“ کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو، چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا، حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ اپنی مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

لہ فیض الباری، ص ۲۶۲ ج ۱،

لہ دیکھئے علی الترتیب الثانی، ص ۸۱ ج ۲، المحلی، لابن حزمؒ، ص ۱۳ ج ۱، فوائذ الرحموت شرح مسلم الثبوت از بحر العلومؒ، ص ۱۲ ج ۲، مقالات الکواثریؒ، ص ۱۶، تفصیلی عبارتوں کیلئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون ”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوذتین“ ماہنامہ البلاغ شعبان ۱۳۹۳ھ لہ فتح الباری، ص ۳۷۳ ج ۸ و مجمع الزوائد للبیہقیؒ، ص ۱۷۹ ج ۲،

”پس حدیث معقل وہ حدیث ہے جس میں کوئی علت معلوم ہوتی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو، باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو، اور یہ ”علت“ اس سند میں بھی واقع ہو جاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں، اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرآن بھی مل جاتے ہیں۔“

اسی طرح حدیث کی ایک قسم ”شاذ“ ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے اُن کی حدیث قبول نہیں کی جاتی، لہذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء نہیں مانتے تھے علامہ نوویؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ نے اُن کو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابل قبول نہیں سمجھا:۔

- (۱) یہ روایتیں معلول ہیں، اور ان کی سبب بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اُن قراءتوں کے خلاف ہیں جو اُن سے بطریق تواتر منقول ہیں
- (۲) مسند احمدؒ کی وہ روایت جس میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ اَتَمُّ مَا كَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ (معوذتین اللہ کی کتاب کا جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے، اور کسی نے صراحۃً اُن کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اصول کے مطابق حدیث شاذ مقبول نہیں ہوتی،

۱۔ مقدمۃ فتح الملہم ص ۵۴ ج ۱ ۲۔ دیکھئے مجمع الزوائد، للہیثمی، ص ۴۹ ج ۱، والفتح الرئی ص ۵۳ و ۵۲ ج ۱، ۸

۳۔ اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی بہر حال یہ اخبار احاد ہیں، اور اس بات پر ائمہ کا اجماع ہے کہ جو خبر واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں اُن کی صحت قطعی ہے، لہذا ان کے مقابلے میں یہ اخبار احاد یقیناً واجب الرد ہیں،

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیوں کر روایت کر دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء مانتے ہیں، لیکن کسی وجہ سے انھوں نے اپنے مصحف میں اُن کو لکھا نہ ہو، اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا، اور اس نے اسے اس طرح روایت کر دیا، گویا وہ انھیں سکرے جزء قرآن ہی نہ مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ معوذتین کو جزء قرآن ماننے کے باوجود انھوں نے اپنے مصحف میں اُن کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجہ بہت سی ہو سکتی ہیں، مثلاً علامہ زاحد کوثری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے معوذتین کو اس لئے نہیں لکھا کہ اُن کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں،

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ اُن سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: اگر میں سورۃ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا، امام ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا، اور مسلمانوں کے حافظے پر اعتماد کیا،

بہر کیف! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ اور معوذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت معقول توجہات ہو سکتی ہیں، اور اُن سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اُن کو قرآن کریم کا جزو ہی نہیں مانتے تھے، جبکہ اُن سے تو اتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے، جس میں معوذتین بھی شامل ہیں،

خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت پر مستشرقین کا اٹھواں اعتراض | حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کریم کو جمع کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا گیا، اس کی تفصیل ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں، بعض مستشرقین نے اس واقعے ہی کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرکاری سطح پر قرآن کریم کی جمع و ترتیب کی کوشش نہیں ہوئی، بلکہ سرکاری سطح پر اس نوعیت کا پہلا کارنامہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے جس نسخے سے استفادہ کیا تھا وہ حضرت حفصہؓ کا ذاتی نسخہ تھا، کوئی سرکاری طور پر تیار کیا ہوا نسخہ نہیں تھا، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے صحیح بخاریؒ کی اُس روایت پر متعدد اعتراضات کئے ہیں جو حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے، اور جس میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمع قرآن کا واقعہ بیان کیا ہے، ان تمام اعتراضات کا خلاصہ پروفیسر منٹگمری واط نے بیان کیا ہے، یہاں اُن تمام اعتراضات کو بیان کر کے جواب دینا اس لئے غیر ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات ایسے ہیں جن کا جواب ایک معمولی واقفیت کا انسان خود سمجھ سکتا ہے، البتہ اُن میں سے چند اہم اعتراضات کا جواب یہاں پیش خدمت ہے،

۱۔ یہ روایت پیچھے صفحہ پر گزر چکی ہے،

Watt : Bell's Introduction to the Quran 40, 42
Edinburgh 1970

۲۔

مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہو کہ صحیح بخاریؒ کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں حج قرآن کا محرک یہ تھا کہ پیامہ کی جنگ میں حفاظ و قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی، حالانکہ تاریخی طور پر یہ محرک صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ جنگ یمامہ کے شہداء کی فہرست میں ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، جو قرآن کے حافظ ہوں کیونکہ شہداء زیادہ تر نو مسلم تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض قطعی بے بنیاد اور لغوی اسے سب سے پہلے فریڈرک شالے (Fredrich Schwally) نے کیا تھا۔

اس کے بعد کے مستشرقین بھی آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کرتے چلے گئے، اور کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی، کہ پیامہ کے شہداء کی فہرست دیکھ کر اس بات کی تحقیق کرتا، کہ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پیامہ کی جنگ میں مدینہ طیبہ کے رہنے والے ہاجرین و انصار کی تعداد تین سو ساٹھ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے رہنے والے ہاجرین کی تعداد تین سو تھی، ظاہر ہے کہ ان چھ سو ساٹھ افراد کے پورے نام تو تاریخ میں محفوظ نہیں رہے، البتہ ان میں سے اٹھارہ ہاجرین و انصار کے نام حافظ ابن کثیرؒ نے نقل فرمائے ہیں:

ان اٹھارہ افراد میں سے ایک حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ ہیں، جو حافظ اور قاری ہونے کے اعتبار سے صحابہؓ میں ممتاز ترین مقام کے حامل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار حضرات سے بطور خاص قرآن کریم سیکھنے کا حکم دیا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھے، آپؐ کی ہجرت سے پہلے مسجد قبا میں امام ہی تھے، اور حضرت عمرؓ بھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، سفر میں بھی اکثر صحابہؓ کی امامت ہی فرماتے، کیونکہ انھیں اقراء (قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم) سمجھا جاتا تھا۔

۱۔ ایضاً، ص ۱۹۲، ۲۔ تاریخ الطبری، ص ۵۱۶، ج ۲، ۳۔ البراہین والہدایہ ص ۳۴۰ ج ۱
۴۔ دیکھئے الاستیعاب، لابن عبد البر، علی ہامش الاصابہ ص ۶۸ و ۶۹ ج ۲،

دوسرے بزرگ حضرت ابو حذیفہؓ میں جو حضرت سالمؓ کے مولیٰ تھے، اور تاریخ اسلام میں جو الیسویں مسلمان ہیں، آٹھ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت کے علاوہ حضرت سالمؓ سے خصوصی تعلق کی بنا پر علم قرآن کریم کے معاملہ میں ان کے مقام بلند کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،

تیسرے بزرگ حضرت زید بن الخطابؓ ہیں، جو حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی ہیں اور بالکل ابتداء میں اسلام لے آئے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہوا کا جو بھی جھونکا چلتا ہے وہ مجھے زید بن الخطابؓ کی یاد دلاتا ہے،

چوتھے بزرگ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے بارے میں پیچھے گزر چکا ہے کہ وہ کاتبین وحی میں سے تھے، قرآن کریم سے ان کا خصوصی تعلق بالکل ظاہر اور واضح ہے،

ایک اور بزرگ حضرت عباد بن بشرؓ ہیں، جو بدری صحابی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ انصاری صحابہ میں تین حضرات ایسے تھے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے تمام دوسرے صحابہؓ پر فائق تھے، ان تین حضرات میں سے ایک حضرت عباد بن بشرؓ بھی تھے،

نیز حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ بھی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے، جو مشہور صحابی ہیں، اور قرآن کریم کی تعلیم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسے اقرائے صحابہؓ کے شاگرد ہیں، حضرت زید بن ثابتؓ کے بھائی حضرت یزید بن ثابتؓ، حضرت برار بن عازبؓ کے چچا حضرت قیس بن الحارثؓ، حضرت معاذؓ

۱۔ الاصابہ، للحافظ ابن حجر، ص ۳۳ ج ۴،

۲۔ البدایہ والنہایہ، لابن کثیر، ص ۳۳۶ ج ۶، مطبعة السعادة مصر،

۳۔ زاد المعاد، لابن القيم، ص ۳۰ ج ۱، معینہ مصر،

۴۔ الاصابہ، ص ۲۵۵ ج ۲، والا استیعاب علی ہامش الصحابہ ص ۴۴ تا ۴۶ ج ۲،

۵۔ الاصابہ ص ۲۱۴ ج ۲،

کے بھائی عائد بن ماعصیؓ، حضرت زبیرؓ کے بھائی سائب بن عوامؓ اور حضرت عثمان بن
منظونؓ کے صاحبزادے حضرت سائب بن عثمانؓ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں،

پھر مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اٹھارہ مہاجرین تھے، اور انصار میں سے تقریباً
بیس حضرات ایسے تھے جو غزوہ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے، اور ان کے علاوہ تقریباً
ایسے تھے جو غزوہ احد میں شریک تھے، اور یہ تفصیل صرف ان شہداء کی ہی، جن کے نام تاریخ
میں محفوظ رہ سکے ہیں، باقی سینکڑوں نامعلوم افراد میں سے کتنے حافظ قاری ہوں گے؟ اس
کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن فریڈرک شالے (Schwally) (جارج
بیل اور منٹگمری واٹ) ہیں کہ انھیں اس فہرست میں نہ صرف یہ کہ کوئی قاری نظر
نہیں آتا بلکہ وہ ان سب کو "نو مسلم" (Recently Converts)

قرار دے کر دنیا پر اپنی تحقیق کا رعب جمانا چاہتے ہیں، غور فرمائیے کہ جس جنگ میں
مہاجرین و انصار کی اتنی بڑی جماعت شہید ہو گئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس
میں سب نو مسلم شہید ہوئے تھے لہذا صحیح بخاریؒ کی جمع قرآن والی روایت غلط ہی علم
تحقیق پر کتنا بڑا ظلم ہے، اور انصاف و دیانت کے ساتھ کتنا بڑا فریب ہے؟ پھر بات
یہ نہیں ہے کہ جنگ یمامہ میں تمام حفاظ صحابہؓ شہید ہو گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ
جنگ یمامہ تو صرف ایک لڑائی تھی، یہ زمانہ وہ تھا جبکہ اس طرح کی جنگوں کا ایک طویل
سلسلہ شروع ہو رہا تھا، اور علماء صحابہؓ میں سے کتنے جانباز ایسے تھے جو یمامہ سے کہیں
زیادہ خون ریز معرکوں میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے بے چین تھے، اس ماحول میں
اگر حضرت عمرؓ کے دل میں قرآن کریم جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہو گیا تو اس میں کوئی
ایسی غیر معقول بات ہی جس کی بنا پر صحیح بخاریؒ کی ایسی قوی روایت کو غلط قرار
دیدیا جائے؟

منٹگمری واٹ نے اس روایت پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اگر حضرت ابو بکرؓ

نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار کیا ہوتا تو اسے ایک ”حجت“ کی حیثیت حاصل ہوتی، حالانکہ اس زمانے کی روایتوں میں اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا، کہ حضرت ابو بکرؓ کے اس سرکاری نسخے کے حوالے دیے جاتے ہوں — لیکن اس اعتراض کی لغویت بھی محتاج بیان نہیں کیونکہ اس نسخے کو ”حجت“ قرار دینے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جب حضرت عثمانؓ نے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں قرآن کریم کے نسخے نقل کرا کر بھیجے کا ارادہ کیا تو سب پہلے حضرت حفصہؓ سے وہی نسخہ طلب فرمایا جو حضرت ابو بکرؓ نے تیار فرمایا تھا، واٹ نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اگر یہ کوئی سرکاری نسخہ تھا تو حضرت عمرؓ کے بعد یہ نسخہ خلیفہ وقت کے بجائے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں رہا؟ اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت کوئی خلیفہ معین نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کے دوسرے سامان کے ساتھ یہ نسخہ بھی حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہو گیا، کون ایسا صاحب عقل انسان ہو سکتا ہے جو محض اتنی سی بات کی وجہ سے ایسی مستند روایت ہی کو دریا برد کر ڈالے،

خلافت صدیقی تک پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا؛ تو ان اعتراض

پچھے بتایا جا چکا ہے کہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کا تبیین وحی کو بلا کر اُس کو لکھوا دیتی تھے، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک پورا قرآن لکھا تو جچکا تھا، لیکن وہ کثافی شکل میں مرتب نہیں تھا، بلکہ مختلف آیتیں مختلف چیزوں پر لکھی ہوتی موجود تھیں، حضرت ابو بکرؓ نے ان مختلف اشیاء کو جمع کر کے آیات قرآنی کو یکجا صحیفوں کی شکل میں لکھوایا،

اس کے برخلاف مستشرقین میں سے نو لڈ کی اور آرتھر جیفرے وغیرہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کے صرف کچھ حصے لکھ گئے تھے، انھوں نے صحیح بخاری کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمرؓ نے جمع قرآن کا مشورہ

دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر حفاظ صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کے بہت سے حصوں سے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے، آرتھر جیفرے لکھتا ہے :-
 ”اس سے واضح ہے کہ اندیشے کی وجہ ان حفاظ کا قتل ہو جانا تھا جنہوں نے
 قرآن کریم یاد کر رکھا تھا، اگر قرآن کریم پورا کا پورا عہد رسالت میں لکھا
 جا چکا تھا تو اس اندیشے کے کوئی معنی نہ تھے۔“

لیکن اول تو یہ بات انتہائی حیرت انگیز اور افسوسناک ہے کہ بعض دوسرے مستشرقین
 کی طرح آرتھر جیفرے نے بھی صحیح بخاریؒ کی اس روایت کو درست ماننے سے انکار کیا
 ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار
 فرمایا تھا، اب اس دو علی کو انصاف اور دیانت کے کون سے خانے میں فٹ کیا جائے
 کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت میں وہ ساری باتیں تو جیفرے صاحب کی نگاہ
 میں جھوٹی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں سرکاری سطح
 پر قرآن کریم کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن اسی روایت کا وہ حصہ ان کی نظر
 میں بالکل صحیح ہے جن میں حضرت عمرؓ کا وہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ ”اگر صحابہؓ اسی طرح
 شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں قرآن کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے، ایک
 طرف تو وہ یہ پوری روایت نقل کر کے اسے من گھڑت (fictitious) بتا رہے ہیں
 اور دوسری طرف اسی روایت سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال بھی
 فرماتے ہیں، اُس کے باوجود ان کا دعوئی یہ ہے کہ ”مستشرقین کا انصاف، نیک نیتی،
 اور غیر جانب داری بالکل واضح ہے، ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوا حقیقت
 کی نقاب کشائی کے کچھ اور نہیں چاہتے۔“

بہر کیف! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن کریم کو جمع

۱۳۵۵
 لہ عربی مقدر، کتاب المصاحف لابن ابی داؤد؛ آرتھر جیفرے، ص ۵ مطبعہ رحمانیہ مصر
 Arthur Jeffery ; Materials for the History of the text
 of the Quran, Leiden 1937 P. 6

کرنے کا جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا، اور جسے ہم پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، اگر اُسے ذہن میں رکھا جائے تو حضرت عمرؓ کے اس جملے سے جیفرے کا یہ استدلال خود بخود باطل ہو جاتا ہے، ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں صحیح قرآن کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں یادداشت اور کتابت دونوں ذرائع سے بیک وقت کام لیا جاتا تھا، اسی لئے کوئی آیت اُس وقت تک نہیں لکھی جاتی تھی جب تک تمام موجود ذرائع سے اس کا جزو قرآن ہونا ثابت نہ ہو جائے، یہ محتاط طریق کار اسی وقت ممکن ہوا جب آیات قرآنی کے مکتوب شکل میں محفوظ ہونے کے علاوہ حفاظ کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی، اس کے برخلاف اگر حفاظ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس وقت موجود نہ ہوتی تو صحیح قرآن کا یہ کارنامہ اس بمثل احتیاط کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا تھا، جس کا وہ مستحق تھا،

اس کے علاوہ قرآن کریم کے ثبوت کے لئے تواتر کی ضرورت تھی، اور محض دو چار نسخے اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے صحیح قرآن کے وقت حفاظ قرآن کی ایک بڑی جماعت ناگزیر تھی، لہذا حضرت عمرؓ کے اندیشے کی وجہ یہی تھی کہ اگر حفاظ قرآن شہید ہوتے گئے اور صحیح قرآن کا کام مؤخر ہوتا رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم کا تواتر منقطع ہو جائے اور لکھے ہوئے مواد کی تصدیق صحابہؓ کے متواتر حافظوں سے نہ کی جاسکے، لہذا حضرت عمرؓ کے اس اندیشے سے یہ استدلال بالکل باطل ہے کہ اُس وقت تک پورا قرآن کہیں بھی لکھا ہوا موجود نہیں تھا،

قرآن کریم کی مختلف قراءتوں کی حقیقت ہم مختلف قراءتیں کس طرح وجود میں آئیں؛ دسواں شبہ

مستشرقین کی ایک بڑی جماعت نے اس معاملے میں ایک دوسرا گمراہ کن نظریہ پیش کیا ہے، نوآدمی، گولڈزبرگر اور آرتھر جیفری وغیرہ نے لکھا ہے کہ قراءتوں کا اختلاف درحقیقت سماعی نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے جو نسخے تیار کرائے تھے اُن پر نقطے اور حرکات نہیں تھے،

اس لئے اسے مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا تھا، چنانچہ جس شخص نے جس طرح چاہا اپنے اجتہاد سے پڑھ لیا، اور وہ اس کی قرأت بن گئی تھی

مستشرقین کے اس دعوے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراتیں معروف ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ مصاحف عثمانی کو پڑھنے میں لوگوں کا جو اختلاف ہوا اس کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ صراحۃً بے بنیاد اور بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانی کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا قراتوں کے وجود میں آنے کا سبب نہیں بنا، بلکہ ان مصاحف عثمانی کو نقطوں اور حرکات سے جان بوجھ کر اسی لئے خالی رکھا گیا تھا کہ قرآن کریم کی جتنی قراتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں وہ سب اس رسم الخط میں سما سکیں،

ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ ہر دور میں قرآن کریم کی کسی قرات کو قبول کرنے کے لئے تین شرائط کو لازمی سمجھا گیا ہے، ایک یہ کہ مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو، اور تیسرے یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، لہذا کوئی قرات اُس وقت تک صحیح تسلیم نہیں کی گئی، جب تک صحیح سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں مل گیا، اگر قراتوں کے وجود میں آنے کا سبب محض عثمانی رسم الخط ہوتا تو ہر اُس قرات کو درست مان لیا جاتا جو رسم الخط میں سما جاتی، اور اسے قبول کرنے کے لئے یہ تیسری شرط عائد نہ کی جاتی، چنانچہ جو شخص بھی قرآن کریم کی مختلف قراتوں پر غور کرے گا اسے کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ عثمانی رسم الخط میں ایک لفظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ وہ طریقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھے اس لئے انھیں اختیار نہیں کیا گیا، یہ بات دو مثالوں سے واضح ہوگی۔

۱۔ دیکھئے "مذہب التفسیر الاسلامی"، گولڈزیہر، ترجمہ عربی ڈاکٹر عبد الحلیم نجار، ص ۸، مکتبۃ النبی، قاہرہ
۲۔ ام اور مقدمہ کتاب المصاحف، آرتھر جفرے، ص ۷، المطبعة الرحمانیہ، مصر ۱۳۵۵ھ

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے: ”وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَقَاعَةٌ وَلَا تُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ“ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔ ”یہاں ایک قرأت میں لَا يُقْبَلُ (یا کے ساتھ) ہے، اور ایک قرأت میں لَا تُقْبَلُ (تار کے ساتھ) ہے، لیکن اسی قسم کی ایک آیت سورۃ بقرہ میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے وَلَا تَنْفَعُهَا شَقَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ، یہاں لَا تَنْفَعُهَا صرف تار کے ساتھ آیا ہے، لَا يَنْفَعُهَا (یار کے ساتھ) کوئی قرأت نہیں ہے، حالانکہ رسم عثمانی میں لَا يَنْفَعُهَا کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عثمانی مصاحف میں یہ جملہ اس طرح لکھا ہوا تھا: ”لا سفعها“ اور عربی زبان کے قواعد میں بھی یار اور تار دونوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ یہ قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھی، اس لئے اس کو کسی نے بھی ختم یا نہیں کیا، اسی طرح سورۃ یس میں ارشاد ہے: ”اِنَّمَا اَمْرٌ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ یہاں ایک قرأت میں فَيَكُونُ (نون پر پیش کے ساتھ) آیا ہے، اور دوسری قرأت میں فَيَكُونُ (نون پر زبر کے ساتھ)، لیکن اسی طرح کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ہے: ”اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ یہاں صرف ایک ہی قرأت ہے (یعنی نون پر پیش) دوسری قرأت رسم الخط کی گنجائش کے باوجود کسی نے ختم یا نہیں کیا؟

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں قرأت کے مجموعوں میں موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ قرأتیں رسم الخط سے وجود میں نہیں آئیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اُن کو محفوظ رکھنے کے لئے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا تھا، یہی وجہ ہو کہ پوری اُمت میں صرف ایک صاحب (یعنی ابو بکر بن مقسمؓ) ایسے

۱۔ یہ دونوں مثالیں علامہ طاہر کردیؒ کی تاریخ القرآن، ص ۱۲۸ و ۱۲۹ سے ماخوذ ہیں،
 ۲۔ ان کا پورا نام محمد بن الحسن بن یعقوب بن مقسمؓ ہی، ولادت ۲۶۵ھ اور وفات ۳۵۲ھ،

گزرے ہیں جنہوں نے یہ مسلک اختیار کیا تھا کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قرأتیں ایجاد کی جاسکتی ہیں، اور ان کا سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونا ضروری نہیں، لیکن جس وقت انہوں نے اپنا یہ گمراہانہ نظریہ پیش کیا، تو پورے عالم اسلام نے اُن پر شدید نیکر کی، خلیفہ وقت نے انہیں سزا اور فقہاء کی ایک مجلس میں طلب کر کے اُن سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ انہوں نے توبہ کی، اور اپنے نظریے سے رجوع کا تحریری اعلان لکھ کر دیا،^۱

اس واقعہ سے صاف واضح ہے کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قرأتیں مستنبط کرنے کو اُمتِ مسلمہ میں ہمیشہ ایک گمراہی سمجھا گیا ہے، اور اس بات پر ہر دور میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہی قرأت معتبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر قرأتوں کا وجود محض عثمانی رسم الخط کے پڑھنے میں اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ہوا ہوتا تو ابن مقسم پر اتنی شدید نیکر کیوں کی جاتی؟ لہذا مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے کہ قرأتیں عثمانی مصاحف میں نقطوں اور حرکات کی غیر موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قرأتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقے پر ثابت ہیں، اور اُن کو محفوظ کرنے کے لئے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا، تاکہ یہ تمام قرأتیں اُن کے رسم الخط میں سما سکیں،

قرآن کریم کی شاذ قرأتیں اور انکی حقیقت | بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی شاذ
قرأتوں کو بنیاد بنا کر غلط مفروضات
کا ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے، اور رائی کا
گیا رہواں شبہ

۱۵ تفصیلات کے لئے دیکھئے تاریخ بغداد، الخطیب، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸ ج ۲ طبع بیروت، خطیب بغدادی
نے اُن کا یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے، کہ ان کی وفات کے بعد ابو احمد الفرضی نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ قبلہ
کی طرف پشت کر کے نماز پڑھ رہے ہیں، فرضی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی یہ تعبیر لی کہ انہوں نے قرأت
قرآن میں ائمہ کی مخالفت کی ہے،

پہاڑ اور سوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی ہے، خاص طور سے گولڈزبرہ اور آرٹھر جیفری نے ان قراءتوں کی بہت سی مثالیں پیش کر کے اُن سے من مانے نتائج نکلے ہیں، یہاں اُن تمام مثالوں کو پیش کر کے اُن کی حقیقت واضح کرنا تو مشکل ہو، اس لئے کہ اس کام کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہوگی، اس کے علاوہ ہماری رائے میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن ہم یہاں شاذ قراءتوں کے بارے میں چند اصولی باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں، امید ہے کہ ان اصولی حقائق کو مد نظر رکھنے کے بعد مستشرقین کے اُن تمام باطل نظریات کی تردید اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی جو انھوں نے شاذ قراءتوں کی بنیاد پر قائم کئے ہیں،

جیسا کہ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں پوری اُمت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہ قراءتیں معتبر ہیں جن میں تین شرائط پائی جاتیں :-
(۱) وہ قراءت عثمانی مصاحف کے رسم الخط میں سما سکتی ہو،

(۲) عربی قواعد کے مطابق ہو،

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا پڑھنا متواتر طریقے سے ثابت ہو، یا کم از کم علماء قراءت میں مشہور و معروف ہو،

جس قراءت میں ان تین شرائط میں سے کوئی ایک مفقود ہو، وہ شاذ قراءت کہلاتی ہے، اور پوری اُمت میں سے کسی نے اسے معتبر نہیں مانا، ان شاذ قراءتوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی ایک بات پائی جاتی ہے :-

لے دیکھئے مذاہب التفسیر الاسلامی: گولڈزبرہ، ترجمہ عربی ڈاکٹر عبدالحلیم التجار، اور:-
Arthur Jeffery ; Materials for the History of the text
of the Quran, Leiden 1937 P. 6
۷۵ گولڈزبرہ کے نظریات پر ڈاکٹر عبدالحلیم التجار نے بھی مذاہب التفسیر الاسلامی کے حاشیہ پر مختصر مگر اچھا تبصرہ کیا ہے،

۱۔ بعض اوقات وہ قرأت بالکل موضوع ہوتی ہے، جیسے کہ ابو الفضل محمد بن جعفر خراسانی کی قرأتیں، جنکو انھوں نے امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب کیا ہے، امام دارقطنیؒ اور تمام علماء نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام قرأتیں موضوع ہیں^۱۔
 ۲۔ بعض اوقات اُن کی سند ضعیف ہوتی ہے، جیسے ابن تیمیہؒ اور ابوالستمال کی قرأتیں^۲، یا بہت سی وہ قرأتیں جو ابن ابی داؤدؒ نے کتاب المصاحف میں مختلف صحابہؓ و تابعینؓ سے منسوب کی ہیں،

۳۔ بعض اوقات سند صحیح ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ قرآن کریم کی قرأت نہیں ہوتی، بلکہ کوئی صحابی یا تابعی عام گفتگو میں قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح کے لئے اس کے ساتھ دو ایک لفظ بڑھا دیتے تھے، قرآن کریم چونکہ پورا کا پورا متواتر تھا، اور ہر دور میں اس کے ہزاروں حفاظ موجود تھے، اس لئے ان الفاظ کے اضافہ سے قرآن کریم کے متن میں اضافے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، لہذا اس قسم کی تشریحات میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے وَلَئِنَّ آخِ أَوْ أُخْتُ مِنْ أُمِّمِ پڑھا، اس میں مِنْ أُمِّمِ کا لفظ تفسیری اضافہ تھا، اسی طرح حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک آیت اس طرح پڑھی وَتَمَتُّنْ مِنْكُمْ أُمَّتٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ^۳ اس میں وَيَسْتَعِينُونَ اللَّهُ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ، بلاشبہ تفسیری اضافہ ہے، کیونکہ اگر یہ جملہ حضرت عثمانؓ کی قرأت

^۱ الشرح في القراءات العشر لابن الجزري، ص ۱۶ ج ۱ والاعتقان، ص ۴۸، ۴۹ ج ۱،

^۲ الشرح، ص ۱۶ ج ۱ الشرح لابن الجزري، ص ۳۱ و ۳۲ ج ۱، والاعتقان، ص ۴۹ ج ۱
 نوع ۲۲ تا ۲۷ و شرح الموطأ، للزرقاني، ص ۲۵۵ ج ۱،

^۳ كنز العمال لعلی المتقی، ص ۲۸۶ ج ۱، بحوالہ عبید بن حمید وابن جریر وغیرہ،

میں واقعہ قرآن کا جزد، ہوتا تو ان کے مرتب کردہ مصحف میں ضرور موجود ہوتا، حالانکہ ان کے مرتب فرمائے ہوئے سات مصاحف میں سے کسی میں یہ جملہ منقول نہیں، شاذ قراتوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں،

۴۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ تشرآن کریم کی بعض قراتیں آخر میں منسوخ ہو گئیں، لیکن کسی صحابی کو ان کے منسوخ ہونے کا علم نہ ہو سکا، اس لئے وہ قدیم قرات کے مطابق پڑھتے رہے، لیکن چونکہ دوسرے تمام صحابہؓ جانتے تھے تھے کہ یہ قرات منسوخ ہو چکی ہے اس لئے وہ نہ اُسے پڑھتے تھے، اور نہ قرآن کریم کی صحیح قراتوں میں شمار کرتے تھے،

۵۔ بعض شاذ قراتوں کو دیکھ کر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی تابعیؒ وغیرہ سے قرآن کریم کی تلاوت میں کوئی بھول چوک ہو گئی، جیسا کہ اکثر بڑے بڑے حافظوں سے ہو جاتی ہے، اُس وقت کسی سننے والے نے سُکر اسے روتا کر دیا؛

قرآن کریم کی جتنی شاذ قراتیں منقول ہیں وہ زیادہ تر اپنی پانچ صورتوں میں دائر ہیں، ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں ان قراتوں کو معتبر قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ امت نے کسی بھی رد میں انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، اولہ اسی لئے یہ قراتیں متواتر تو کیا ہوتیں مشہور بھی نہ ہو سکیں، لہذا ان کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے جو یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متن میں کچھ اختلافات پائے جاتے تھے یہ ایسا بے بنیاد اور لغو خیال ہے جو علم و تحقیق کے اعتبار سے قابل غور بھی نہیں ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ۛ

۱۔ مشکل الآثار، للطحاویؒ، ص ۱۹۶ تا ۲۰۲ ج ۴،

۲۔ النشر لابن الجزریؒ، ص ۱۶ ج ۱، والمبانی فی نظم المعانی: مقدمتان فی علوم القرآن ص ۷۰، المكتبة الخبجي، مصر، ۱۹۵۴ء،

حقانیت قرآن

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی حیرت انگیز تاثیر رکھی ہے کہ ہرٹ دھرمی اور عناد کی بات تو اور ہے، لیکن جو شخص بھی غیر جانبداری اور اخلاص کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ بیساختہ پکار اُٹھے گا کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن کریم بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کی صداقت و حقانیت دل میں اُترتی چلی جاتی ہے، لہذا قرآن کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا، لیکن ذیل میں ہم مختصر چند وہ باتیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے ایک غیر مسلم کے لئے بھی قرآن کریم کی حقانیت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت | سب سے پہلے اُس بات کو ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے جو ہم نے ”وحی“ کی ضرورت“ کے عنوان کے تحت پیچھے لکھی ہے، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”وحی“ انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، جس کے بغیر انسان کے لئے دنیا میں ایک اچھی زندگی گزارنا ممکن نہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی

درسات کے موضوع پر بات کرنا ہی فضول ہے، اُن سے پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے..... مسئلہ پر گفتگو کی ضرورت ہے، لیکن جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کہ ”جی“ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کا ایسا ناگزیر تقاضا ہے جس پر ایمان لائے بغیر ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی، جس ذات نے انسان کو پیدا کیا اور اُس کے لئے یہ کائنات بنائی اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ انسان کو شر و فساد کے تقاضوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی رہنمائی کے لئے کوئی ہدایت نامہ نہ بھیجے،

ہدایت کے اسی سلسلے کا نام ”وحی“ اور ”رسالت“ ہے، اور یہ سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع نہیں ہوا، بلکہ آپ پر اس کی تکمیل ہوئی ہے، آپ سے پہلے ہزاروں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام ہدایت لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ بشارت دی تھی کہ آخری دور میں ایک ایسے پیغمبر تشریف لائیں گے جن پر نبوت کے مقدس سلسلے کی تکمیل ہو جائے گی، بعض انبیاء علیہم السلام نے آپ کی متعدد علامتیں بھی پہلے سے بیان کر دی تھیں، بلکہ بعض نے تو صراحتاً آپ کا نام نامی بھی بتا دیا تھا، پچھلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اگرچہ آج بہت کچھ تحریف و ترمیم ہو چکی ہے، لیکن آج بھی اُن میں آپ کی تشریف آوری کی بہت سی بشارتیں اور بہت سی علامتیں محفوظ ہیں،

کتاب مقدس میں آپ کی بشارتیں | مثلاً بائبل کی کتاب ہستنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے :-

”اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے تو میں ان کا حساب اُس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے

کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیونکر پہچانیں؟ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقعہ یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا۔

(استثناء ۱۸: ۲۲ تا ۲۴)

اس عبارت میں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے یہ صراحت کی گئی ہے کہ جس نبی کی بشارت دی گئی ہے، وہ ان میں سے نہیں بلکہ اُن کے بھائیوں یعنی بنی اسمعیل میں مبعوث ہوگا، اور حضرت شعیا علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجودہ بائبل میں منقول ہے کہ :-

”دیکھو! میرا خادم جسکو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے، میں نے اپنی رُوح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی، وہ مسلے ہونے سے سرکندے کو نہ توڑے گا، اور ٹمٹاتی ہتی کو نہ بچھائے گا، وہ راستی سے عدالت کرے گا، اور ماندہ نہ ہوگا، اور بہت نہ ہارے گا، جب تک عدالت یورین پر قائم نہ کر لے، ہمزیرہ اس کی شریعت کا انتظار کریں گے،..... میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا، اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا، کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے، اور اُن کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑائے، یہوداہ میں ہی ہوں، یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دوسرے کے لئے اور اپنی حمد کھودی ہوئی صورتوں کے لئے روانہ رکھوں گا،..... اے سمندر پر گزرنے والو! اور اس میں بسنے والو! اے جزیرہ! اور ان کے باشندو! خداوند کے لئے نیا گیت گادو، زمین پر سر تا سر اس کی ستائش

کرد، بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد گاہوں اپنی آوازیں بلند کریں،
 تسلیح کے بننے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے لٹکاریں، وہ خداوند
 کا جلال ظاہر کریں، اور جسریروں میں اس کی تثار خوانی کریں، خداوند پہاڑ کی
 مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، جو کھودی ہوئی
 مورقوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود
 ہو وہ پیچھے ہٹیں گے، اور بہت شرمندہ ہوں گے، (یسعیاہ ۴۲: ۱ تا ۱۱)

اس عبارت میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہے وہ حضرت
 اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا، (کیونکہ قیدار اپنی کے صاحبزادے کا نام ہے)
 اور تسلیح (مدینہ طیبہ کے مشہور پہاڑ) کے بننے والے اس کی آمد پر خوشیاں منائیں گے،
 اس کا خاص مقابلہ بت پرستوں سے ہوگا، اور وہ اپنے حلقہ اثر میں بت پرستی کا خاتمہ
 کر دے گا، اُسے متحدہ اقوام سے جنگیں بھی پیش آئیں گی، اور بالآخر وہ غالب آکر
 اُن اقوام میں عدالت نافذ کرے گا،

لہٰذا اس بشارت کا ایک ایک لفظ صرف اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے،
 اس کی پوری تفصیل تو احقر نے ”بائبل سے قرآن تک“ ص ۲۸۱ ج ۳ کے مفصل حواشی میں بیان کی ہے
 یہاں مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ قیدار خود بائبل کی تصریح کے مطابق حضرت اسمعیل علیہ السلام کے
 صاحبزادے کا نام تھا، (۱۔ تواریخ ۱: ۳) اور اُن کی اولاد عرب کے بیابان میں آباد تھی، جیسا کہ
 بائبل ہی کی کتاب یسعیاہ (۲۱: ۱۳ تا ۱۷) سے واضح ہے، لہٰذا اس عبارت میں قیدار کا نام لیکر
 صاف طور سے یہ کہا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہے وہ اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا،
 اور عرب میں مبعوث ہوگا، اس کے علاوہ اس عبارت میں ”تسلح“ کے بننے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ
 گیت گائیں، تسلیح مدینہ طیبہ کا مشہور پہاڑ ہے، اور اسی کے ایک حصّہ میں ”ثنیات الوداع“ واقع
 ہیں، جن پر کھڑے ہو کر مدینہ کی بچیوں نے ”طَلَحَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا“ کے گیت گاتے ہوئے آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا،

موجودہ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں اس قسم کی اور بھی بہت سی بشارتیں اب تک موجود ہیں، اور انہی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت تک لوگوں میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور عظیم الشان نبی دنیا میں تشریف لانے والے ہیں، چنانچہ انجیل یوحنا میں مذکور ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے تو لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ وہی نبی ہیں جن کی بشارت پچھلے انبیاء علیہم السلام دیتے آ رہے ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کا انکار کیا، انجیل یوحنا کی عبارت یہ ہے :-

”اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور اس نے انکار نہ کیا، بلکہ یہ اصرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، الخ“

(دیکھئے انجیل یوحنا ۱: ۱۹ تا ۲۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے، اور وہ نبی اُن کے درمیان اس قدر مشہور و معروف تھے کہ اُن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ ”وہ نبی“ کہنا کافی ہوتا تھا،

پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح اسم گرامی لوگوں کو بتا کر آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی، انجیل یوحنا میں مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ :-

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ (فارقلیط) تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے

الذی معی کلام اللہ ہے

لہ انجیل کے یونانی نسخوں میں یہ لفظ ”پیرکلوٹوس“ تھا، جو ”محمد“ کا ترجمہ ہے، یہاں ہم نے صرف نمونہ کے لئے چند بشارتیں ذکر کی ہیں، اس موضوع پر مبسوط مباحث کے لئے دیکھئے ”بائبل سے قرآن تک“ جلد سوم :-

تھارے پاس پیچیدوں کا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور رہتبازی اور عدالت

کے بارے میں تصور دار پھرائے گا (یوحنا ۱۶: ۷)

ان بشارتوں کو ذہن میں رکھ کر اُس زمانے کا تصور کیجئے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، یہ وہ زمانہ تھا جب سینکڑوں سال سے یہ دنیا کسی نبی کے وجود سے محروم تھی، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات مٹ رہی تھیں، تحریف و ترمیم کرنے والوں نے پھیلی شریعتوں کو بڑی طرح مسخ کر ڈالا تھا، شرک کی بار عالمگیر ہو چکی تھی، ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا، اور گزشتہ آسمانی کتابوں کا..... علم رکھنے والے نبی آخر الزماں کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان حالات میں آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور چالیس سال تک اس چھوٹی سی بستی میں اس طرح رہتے ہیں کہ اس کا بچہ بچہ آپ کی سچائی، آپ کی دیانتداری، آپ کے عدل و انصاف اور آپ کے حسنِ حنلاق کا معترف ہے، مکہ مکرمہ آجکل کے شہروں کی طرح کوئی بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی بستی تھی جس میں ہر شخص کی زندگی دوسروں کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے، اس بستی میں آپ چالیس سال بسر کرتے ہیں، مکہ کے باشندے آپ کے بچپن اور آپ کی جوانی کا اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس پورے عرصہ میں کسی شخص کو آپ کے ذاتی کردار پر کوئی اُنکلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، کوئی متنفس ایسا نہیں پایا جاتا جو کبھی ساری عمر آپ کی کسی ادنیٰ غلط بیانی کی مثال پیش کر سکے اس کی بجائے پوری بستی میں آپ "صادق" اور "امین" کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں ایسا بھی نہیں ہو کہ آپ نے یہ چالیس سالہ زندگی لوگوں سے الگ تھک لے کر گزاری ہو، بلکہ آپ اُن کے تمام امور زندگی میں قوم کے ایک باشعور اور مدبر فرد کی طرح دخیل رہتے ہیں، آپ اُن کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، اُجرت پر کام کرتے ہیں، اُن کے باہمی جھگڑے نیٹاتے ہیں، اُن کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ازدواجی زندگی گزارتے ہیں، غرض زندگی کے جتنے مراحل کا اُس دور میں تصور کیا جاسکتا ہے اُن سب سے گزرتے ہیں اور پوری قوم ان تمام مراحل میں آپ کے بلند کردار کا اعتراف کرتی ہے،

پھر چالیس سال کی اس طویل مدت میں آپ کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کرتے، اہل کتاب کے علاوہ آپ کا کوئی میل جول نہیں رہتا، کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھتے، عام اہل عرب کے برخلاف کبھی کوئی شعر نہیں کہتے، نہ مشاعروں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، کبھی کسی کا ہن، جادو گر یا نجومی کی صحبت میں نہیں بیٹھتے، اس کے بعد اچانک آپ کی زبان مبارک ایک ایسا کلام جاری ہوتا ہے جس کے آگے عرب کے بڑے بڑے ادباء و شعراء گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایسے ایسے علوم و معارف بیان فرماتے ہیں، جس کے سامنے دنیا بھر کے حکماء کی گردنیں حشم ہو جاتی ہیں، ایسی ایسی پیشگی خبریں سناتے ہیں جو کبھی کسی کا ہن یا نجومی کے تصور میں بھی نہیں آئیں، اور پھر یہ خبریں سو فی صد درست ثابت ہوتی ہیں، آپ کے دست مبارک پر بہت سے ایسے معجزات ظاہر ہوتے ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جادو گر عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں، اور پھر تیس سال کی مختصر مدت میں آپ پورے جزیرہ عرب میں ایسا معجزہ العقول انقلاب برپا کر دیتے ہیں کہ صحرائے عرب کے جو وحشی علم و معرفت اور تہذیب و تمدن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم و حکمت اور تہذیب و شائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل و غارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن و آشتی کے گلاب کھل اُٹھتے ہیں، جہاں ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا، وہاں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے، اور بالآخر عرب کے یہ صحراء نشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل و خوار تھے، ایران اور روم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں، اور ساری دنیا اُن کے عدل و انصاف، اُن کی رحم دلی، اور ان کی شرافت نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے،

ان حقائق پر جو شخص بھی ٹھنڈے دل و دماغ اور خلوص و غیر جانبداری سے غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے پیچھے رسول تھے، آپ ”وہی نبی“ تھے جن کی بشارت صدیوں پہلے سے دی جا رہی تھی اور جن کا انسانیت کو انتظار تھا، لہذا آپ کا یہ ارشاد کہ ”قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے“ سو فی صدر برحق اور بلا خوف تردید درست ہے،

اعجازِ قرآن

قرآن کریم کی حقانیت کی ایک اور واضح دلیل اس کا اعجاز ہے، یعنی ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے، یہاں ہم مختصراً قرآن کریم کی اُن وجوہِ اعجاز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، اور کسی بشری ذہن کا اس میں کوئی دخل نہیں،

آگے بڑھنے سے پہلے بنیادی طور پر دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ فصاحت و بلاغت اور کلام کی سحرانگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے، اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، آپ تلاشِ جستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد معترف فرما سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول و قواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی، کسی کلام کے حسن و قبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کرتا ہے، جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی، جس طرح ایک خوش رنگ پھول کی رعنائیوں کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جاسکتا، جس طرح جھکتی ہوئی مُشک کی پوری کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں، جس طرح ایک خوش ذائقہ پھل کی لذت و حلاوت الفاظ میں نہیں سما سکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو تمام کمال بیان کر دینا بھی ممکن نہیں، لیکن جب کوئی صاحبِ ذوق انسان اسے سُنے گا، تو اس کے محاسن و اوصاف کا خود بخود پتہ چل جائے گا،

دوسرے یہ کہ فصاحت و بلاغت کے معاملے میں ذوق بھی صرف اہل زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غیر زبان میں خواہ کتنی مہارت حاصل کر لے، لیکن ذوقِ سلیم کے معاملے میں وہ اہل زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہو سکتا،

اب ذرا زمانہ جاہلیت کے اہل عرب کا تصور کیجئے، خطابت اور شاعری اُن کے معاشرے کی رُوحِ رواں تھی، عربی شعر و ادب کا فطری ذوق اُن کے بچے بچے میں سمایا ہوا تھا، فصاحت و بلاغت اُن کی رگوں میں خونِ حیات بن کر دوڑتی تھی، ان کی مجلسوں کی رونق، اُن کے میلوں کی رنگینی، اُن کے فخر و ناز کا سرمایہ اور ان کی نشر و اشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعر و ادب تھا، اور انھیں اس پر اتنا غور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام قوموں کو ”عجم“ یعنی گونگا کہا کرتے تھے،

ایسے ماحول میں ایک اُمّی (جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کلام پیش کیا، اور اعلان فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کیونکہ:-

لَئِنْ أَجْتَمَعَتِ الرُّسُ وَالْجِبُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا
الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوا بِمِثْلِهِ وَكَذَلِكَ نَبْعُضُهُمْ بَعْضًا ظَهِيرًا (الاسراء: ۸۸)

”اگر تمام انسان اور جتات مل کر اس قرآن جیسا (کلام) پیش کرنا چاہیں تو اس جیسا پیش نہیں کر سکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کی کتنی مدد کریں“

یہ اعلان کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ دعویٰ اُس ذات کی طرف سے تھا جس نے کبھی وقت کے مشہور اُدباء اور شعراء سے کوئی علم حاصل نہ کیا تھا، کبھی مشاعرے کی محفلوں میں کوئی ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا، اور کبھی کاہنوں کی صحبت بھی نہ اٹھائی تھی، خود شعر کہنا تو درکنار آپ کو دوسرے شعراء کے اشعار تک یاد نہیں تھے، پھر یہی وہ ذات تھی جسے میدانِ فصاحت کے یہ سُورما ایک نئے دین کا بانی کہا کرتے تھے، اگر یہ اعلان سچا ثابت ہو جائے تو ان کے آبائی دین کی ساری عمارت مٹنے کے بل گر پڑتی، اور اُن کی صدیوں پرانی رسوم و روایات کا سارا پلندہ پیوندِ زمین ہو جاتا تھا، اس لئے یہ اعلان نہایت اُن کی ادبی صلاحیتوں کو ایک زبردست چیلنج تھا، یہ اُن کے دین و مذہب پر

ایک کاری دار تھا، یہ اُن کی قومی حیثیت کے نام مبارزت کا ایک پیغام تھا، یہ اُن کی غیرت کو ایک للکار تھی، جس کا جواب دیئے بغیر کسی غیور عرب کے لئے عین سے بیٹھنا ممکن نہیں تھا، لیکن ہوا کیا؟ — اس اعلان کے بعد اُن آتش بیان خطیبوں اور شعلہ نوا شاعروں کی محفل میں سناٹا چھا گیا، کوئی شخص اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہ بڑھا، کچھ عرصہ کے بعد قرآن کریم نے پھر اعلان فرمایا کہ :-

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى الْعَبْدِ نَأْتُوا بِنُصْرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ
وَمِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ۚ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي
وُفِّدَ عَلَيْهَا النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ ۚ أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۚ (البقرہ: ۲۳)

”اور اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی ایک (ہی) سورت بنا لاؤ، اگر سچے ہو، اور اللہ کے سوا تمہارے جتنے حمایتی ہیں اُن سب کو بلاؤ، پھر بھی اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور یقین ہے کہ ہرگز نہ کر سکو گے، تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پھر ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

اس پر بھی بدستور سکوت طاری رہا، اور کوئی شخص اس کلام کے مقابلے میں چند جملے بھی بنا کر نہ لاسکا، سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کی کیفیت بقول علامہ حبیب الرحمنؒ یہ ہو کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری سرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بلاغت پر غیر معمولی گھمنڈ رکھتا ہے، تو وہ اس پر تنقید کرنے اور اپنے اشعار میں اس پر چوٹیں کسنے سے باز نہ رہ سکتی تھی، اس بات کا کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کے ان مکرر سکرترا اعلانات کے بعد بھی فحشکی بیٹھی رہے، اور اُسے دم مارنے کی

جرات نہ ہو! اس بات کی کوئی تاویل اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فصاحت و بلاغت کے سوا قرآن کریم کا مقابلہ کر نیسے عاجز آچکے تھے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رک پہنچا نیکے لئے ظلم و ستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا، آپ کو ستایا، مجنون کہا، جادوگر کہا، شاعر اور کاہن کہا، لیکن ان سے اتنا نہیں ہو سکا کہ قرآن کے مقابلے میں چند جملے پیش کر دیتے، پھر صرف یہی نہیں کہ یہ شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا شاعر قرآن کریم کا مقابلہ نہیں کر سکے، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کلام کی حیرت انگیز تاثیر کا کھل کر اعتراف کیا، امام حاکمؒ اور بیہقیؒ نے قرآن کریم کے بارے میں ولید بن مغیرہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

والله ان لقوله الذي يقول خلاوة وان عليه
لطلاوة... و آتته ليعلاو ما لعلی،

”خدا کی قسم! جو یہ کلام بولتے ہیں اس میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے
یہ کلام غالب ہی رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا“

یہ ولید بن مغیرہ ابو جہل کا بھتیجا تھا، ابو جہل کو جب یہ پتہ چلا کہ میرا بھتیجا اس کلام سے متاثر ہو رہا ہے تو وہ اسے تنبیہ کرنے کے لئے اس کے پاس آیا، اُس پر ولید نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! تم میں کوئی شخص شعر کے حسن و قبح کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں، خدا کی قسم! محمدؐ جو کہتے ہیں شعر کو اس کے ساتھ کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے، اسی ولید بن مغیرہ کا واقعہ حضرت ابن عباسؓ نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب موسم حج آیا تو اس نے قریش کو جمع کر کے کہا کہ موسم حج میں عرب کے مختلف قبائل یہاں آئیں گے، اس لئے محمدؐ کے بارے میں کوئی ایسی بات طے کر لو کہ پھر باہم کوئی اختلاف نہ ہو، قریش نے کہا کہ ہم لوگوں سے یہ کہیں گے کہ محمدؐ کاہن ہیں،

۱۔ الخصائص الکبریٰ، للسيوطیؒ، ص ۱۱۳ ج ۱ والاتقان، ص ۱۱۷ ج ۲،
۲۔ اخرجہ الحاکمؒ والبیہقیؒ عن ابن عباسؓ رخصائص الکبریٰ (۱۳/۱)

دلید نے کہا، خدا کی قسم: ان کا کلام کا ہنوں جیسا نہیں ہو، قریش نے کہا کہ پھر ہم انہیں
 مجنون کہیں گے، دلید بولا کہ ان میں جنوں کا شائبہ تک نہیں، قریش کہنے لگے کہ پھر ہم کہیں گے
 کہ وہ شاعر ہیں، دلید نے کہا کہ شعر کی تمام اصناف سے میں واقف ہوں، یہ کلام شعر
 ہرگز نہیں ہے، قریش نے کہا کہ ”پھر ہم انہیں جادوگر کہیں؟“ دلید نے پہلے اس کا بھی انکار
 کیا، مگر عاجز آکر اسی پر فیصلہ ہوا، کہ جادوگر کہا جائے، کیونکہ یہ ایسا جادو ہے جو باپ
 بیٹے اور بھائی بھائی میں تفریق کر دیتا ہے؛

اسی طرح عتبہ بن ربیعہ قریش کے سربراہ اور وہ لوگوں میں سے تھا، وہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصاحبت کی گفتگو کرنے آیا، آپ نے سورہ الحکم السجدہ کی ابتدائی
 آیات اس کے سامنے تلاوت فرمائیں، وہ ہمہ تن گوش سنتا رہا، یہاں تک کہ آپ نے آیت
 سجدہ پڑ سجدہ کیا، تو وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر سیدھا گھر چلا گیا، لوگ اس کے پاس
 گفتگو کا نتیجہ معلوم کرنے آئے، تو اس نے کہا ”خدا کی قسم! محمدؐ نے مجھ کو ایسا کلام سنایا
 کہ میرے کانوں نے تمام عمر ایسا کلام نہیں سنا، میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ میں کیا جواب
 دوں؟“

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا
 ہے کہ عرب کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ اُدباء و شعراء نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کا معارضہ
 نہیں کر سکے، بلکہ قرآن کریم کی اثر انگیزی کا قوی یا عملی طور سے اعتراف کرنے پر
 مجبور ہوئے،

بعض غیر مسلم مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کسی نے قرآن کریم کے
 مقابلے پر کوئی کلام پیش کیا ہو، لیکن ہم تک اس کا کلام نہ پہنچ سکا ہو، عسلا

۱۔ اخرجہ البیہقیؒ وابن اسحقؒ (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۳ ج ۱)

۲۔ اخرجہ البیہقیؒ وابن اسحقؒ عن محمد بن کعبؒ (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۵ ج ۱) و

ابو یعلیٰؒ عن جابرؒ (رجح الفوائد، ص ۲۶ ج ۲)

ابوسلیمان خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) نے جو بڑے پایہ کے محدث ہونے کے علاوہ لغت اور ادب کے بھی امام ہیں، اس خیال پر تبصرہ کرنے ہوئے بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ :-

”یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ ابتداء سے عام اور خاص لوگوں کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ وہ اہم واقعات کو ضرور نقل کر کے آئندہ نسلوں کے لئے بیان کر جاتے ہیں، بالخصوص وہ واقعات جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہوں یہ معاملہ (قرآن کریم کا چیلنج) تو اس وقت چار دانگ عالم میں شہرت پا چکا تھا، اگر اس کا کوئی مقابلہ کیا گیا ہوتا تو اس کا ہم تک نہ پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، اگر یہ بات ممکن ہو سکتی ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور نبی یا بے شمار انبیاء مبعوث ہوئے ہوں، اُن پر کتابیں اُتری ہوں، اور ان میں شریعتِ محمدی کے علاوہ کوئی اور شریعت بیان کی گئی ہو، اور یہ واقعات ہم تک نہ پہنچے ہوں، — اگر یہ بات ناقابلِ تصور ہے تو قرآن کریم کے معارضہ کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔“

البتہ چند مسخرہ درں نے قرآن کریم کے مقابلے میں کچھ مضحکہ خیز جملے بنائے تھے وہ تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں، اور اہل عرب ہمیشہ اُن کی ہنسی اڑاتے آئے ہیں مثلاً کسی نے ”سورۃ القارۃ“ اور ”سورۃ الفیل“ کے انداز پر یہ جملے کہے تھے، کہ ”اَلْفِیْلُ مَا الْفِیْلُ وَمَا اَدْرٰیكَ مَا الْفِیْلُ، لَنْ مَشْفٰی طَوِیْلٌ وَذَنْبٌ اَفِیْلٌ، وَمَا اَدْرٰیكَ مَنْ خَلَقَ رَبَّنَا بِاَلْفِیْلٍ —“ یا کسی نے قرآن کے مقابلے پر یہ جملے بنائے تھے :- ”اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ فَعَلَ بِالْحَبْلِی، اَخْرَجَ مِنْهُمْ نَسَمَةً تَسْعٰی، بِلٰی شَرِّ سَیْفٍ وَحَشٰی —“ یا مسیلہ کذاب نے ان جملوں کو قرآن کے مقابلے میں اپنی دجی شرا دیاتھا کہ یا ضفدع نفی کہ تنفقین

لا الماء تكدرين ولا الوارد تنفريين“ پھر نزولِ قرآن کے کافی عرصے کے بعد عربی کے مشہور ادیب اور انشا پرداز عبداللہ بن المقفع مترجم کلیلہ و منہ (متوفی ۳۰۰ھ) نے قرآن کریم کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسی دوران کسی بچے کو یہ آیت پڑھتے سنا کہ وَقِيلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ اَقْلَعِي“ تو پکارا ٹھاکہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا معارف ناممکن ہے، اور یہ ہرگز انسانی کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

اب ہم مختصراً ان اہم خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن کی بنا پر قرآن کریم کا کلام معجز ہے، ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

(۱) الفاظ کا اعجاز (۲) ترکیب کا اعجاز (۳) اسلوب کا اعجاز (۴) اور نظم کا اعجاز،

الفاظ کا اعجاز | کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا، کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن

پورے قرآن کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ناممکن ہی نہیں ہے، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اُس میں ایک مفہوم کے لئے معمولی

لہ بیان اعجاز القرآن، الخطابی ج، (المطبوع فی ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن، ص ۵۰ و ۵۱،

لہ اعجاز القرآن، الباقلائی ج، ص ۵۰ ج ۱ عاشق الاقنان،

معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے جو عبارت کے سیاق، معنی کی ادائیگی اور اسلوب کے بہار کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی،

(۱) زمانۂ جاہلیت میں ”موت“ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے، مثلاً موت، ہلاکت، فنا، حتف، قعوب، جہام، منون، سام، قاضیہ، یمن، نبط، فود، مقدار، جبار، قنم، حلاق، طلائل، طلاطلہ، عول، زام، کفت، جدارع، حزرۃ خارج، لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہل عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتے ہیں، اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، چونکہ وہ لوگ معاد و آخرت اور حساب و کتاب کے قائل نہیں تھے، اس لئے انھوں نے موت کے لئے جتنے نام تجویز کئے اُن سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے، اگر قرآن کریم اہل عرب کی اپنی قدیم تعبیرات پر اکتفا کرتا تو موت کے بارے میں اُن کے باطل نظریہ سے کسی درجہ میں موافقت کا شبہ ہو سکتا تھا، چنانچہ جس جگہ موت کی حقیقت بیان کرنی تھی، وہاں موت کے مفہوم کے لئے قرآن نے مذکورہ جو بیس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا، جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، اور وہ لفظ ”تَوَفَّی“ جس کے لغوی معنی ہیں ”کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا“ اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے اُن میں دوبارہ روح کو لوٹا سکتا ہے، ”موت“ کے لئے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا، چنانچہ ابن سیرۃؒ نے ”المختص“ میں ”موت“ کے دوسرے الفاظ کے لئے تو اہل عرب

لے ابن سیرۃؒ اندلسیؒ نے یہ تمام نام شمار کرائے ہیں، اور اہل اعرب کے اشعار سے اس کی مثالیں

پیش کی ہیں، (المختص، لابن سیرۃ، ص ۱۱۵ ج ۶)

کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں، لیکن ”توتی“ کے لئے قرآن کریم کے سوا کوئی استشہاد پیش نہیں کیا ہے۔

(۲) ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن چونکہ ان کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لئے اہل زبان انھیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوق سلیم و جگر اٹھتا ہے، مثلاً عربی میں تعمیر مکان کے لئے بچی ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل، مبتذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اَجْرٌ، قَرْمٌ اور مَطْوِیٌّ، اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں بچاؤ، اس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہو گیا، اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قیاحت بھی پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ ارشاد فرمایا:-

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ عَزِيزٍ
فَأَوْقِنِّي يَا هَامَانَ عَلَى الطِّينِ فَأَجْعَلْ لِي صَرْحًا ۖ لَقَدْ نَقَصْتُكَ
”اور فرعون نے کہا کہ اے سردارانِ قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم
نہیں، پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے ایک محل
تعمیر کرو۔“

(۳) عربی میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو مفرد ہونے کی حالت میں تو سبک اور فصیح ہیں، لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے، مثلاً زمین کے معنی میں لفظ ”أَرْضٌ“ ایک سبک لفظ

۱۔ یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، للشیخ البنوری حفظہ اللہ، ص ۵۴، مجلس علمی بحیل
۲۔ ایضاً بحوالہ المشائل لابن الاثیر، ص ۱۱،

ہے، اس کی دو جمعیں عربی میں مستعمل ہیں، اَرْضُون اور اَرْضِی، یہ دونوں ثقیل سمجھی جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے کلام کی سلاست میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن چل جمع کا مفہوم ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، وہاں ادبائے عرب انہی کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اس کے برخلاف قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر سَمَیَات کو بصیغہ جمع اور اس کے ساتھ اَرْض کو مصدر استعمال کیا ہے، اور کہیں اَرْض کو بصیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا البتہ ایک جگہ سات زمینوں کا ذکر کرنا تھا، جس کے لئے جمع کا صیغہ لازماً ضروری تھا، لیکن قرآن نے اس صیغہ جمع سے احتراز کر کے ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کی کہ مفہوم بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہو گیا، اور نہ صرف یہ کہ کلام میں کوئی ثقل پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کے حسن میں چند در چند اضافہ ہو گیا، ارشاد ہے :-

اِنَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَمٰوٰتٍ وَّ اَرْضٍ مِّثْلَهُنَّ (الطلاق: ۱۲)

”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور زمین میں سے بھی اتنی ہی“
دیکھئے: یہاں سَمَآءُ (آسمان) کی جمع تولائی گئی، لیکن قرآن نے اَرْض کی جمع لانے کے بجائے اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وَ مِّنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تعبیر اختیار فرمائی جس کے اسرار و نکات پر جس قدر غور کیجئے معجزانہ بلاغت کا دریا موجزن نظر آتا ہے،
(۴) قرآن کریم کے بعض الفاظ پر بعض ملحدوں نے ثقیل ہونے کا اعتراض کیا ہے، مثلاً لفظ ”ضَیْرٰی“ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ذات میں ثقیل ہوتے ہیں لیکن ادیب انھیں ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اس جگہ اس سے بہتر لفظ نہیں لایا جاسکتا، اردو میں اس کی مثال یہ ہے کہ ”دھول دھپا“ ایک مبتذل لفظ سمجھا جاتا ہے، جسے فصیح و بلیغ عبارتوں میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا، لیکن غالب کا یہ شعر دیکھئے

دھول دھپا اُس سرِ ایا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہاں یہ لفظ ایسے سلیقے کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے

تو حسن بیان پر پانی پھر جائے گا، عربی میں اس کی مثال یہ ہے کہ گردن کی ایک رگ کا نام "اخذع" ہے، عربی کے دو شاعروں نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے لیکن دونوں میں حسن و سلامت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، ابو تمام کہتا ہے:

يَا دَهْرَ قَوْمٍ عَنْ أَخَذِ عَيْكَ فَعْتَن

أَصْجَجْتَ هَذَا الْإِنَامَ عَنْ خَرَقِكَ

یہاں یہ لفظ بڑا ثقیل اور بوجھل معلوم ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد حماسہ کے ایک شاعر عبداللہ بن الصمہ کا یہ شعر پڑھتے رہے:

تَلَقَّتْ نَحْوَالِحِي حَتَّى وَجَدْتُ ثَنِي

وَجَعْتُ مِنَ الْأَصْغَاءِ لَيْتًا وَأَخْدَعَا

اس میں وہی ثقیل لفظ اتنی روانی اور خوبصورتی سے آیا ہے کہ ذوق سلیم پر کوئی گرائی نہیں ہوتی، بلکہ شعر میں مجموعی طور پر جو سوز و گداز پایا جا رہا ہے یہ ثقیل لفظ اس میں بھی پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں لفظ "ضِئْزِي" بھی ایسے محسن کے ساتھ آیا ہے کہ اس کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا،

أَلَا كُمُ الذِّكْرُ وَلَهُ الْكُفْتَى، بَلْكَ إِذَا قَسَمْتُ ضِئْزِي

اگر انفرادی طور سے دیکھا جائے تو قِسْمَةُ "جائزۃ" یا قِسْمَةُ ظَالِمَةٍ کے الفاظ ضِئْزِي کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوتے ہیں، لیکن جس سیاق میں لفظ ضِئْزِي قرآن میں آیا ہے وہاں اگر "جائزۃ" یا "ظالِمۃ" کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کلام کی ساری روانی ختم ہو جائے گی!

لے یہ چاروں مثالیں بنیادی طور پر مولانا محمد یوسف صاحب بٹوری صاحب ظلم کی کتاب "یتیمۃ البیان" سے ماخوذ ہیں، جو حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مشکلات القرآن" کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوئی ہے، موصوف نے یہ مثالیں حضرت شاہ صاحب اور علامہ ابن اثیر کی "المثل السائر فی ادب الکاتبین" کے حوالے سے پیش کیں ہیں،

ترکیب کا اعجاز الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اور بچ کمال پر ہے، قرآن کریم کے جملوں کے درو بست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:-

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی، اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لئے عربی میں کئی مقبولے مشہور تھے، مثلاً **أَقْتُلْ إِخْيَاءَ لِلْعَجِيبِ** (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور **أَقْتُلْ أَلْفًا لِلْقَتْلِ** (قتل قتل کی روک تھام ہوتی ہے) اور **أَكْثَرُوا الْقَتْلَ لِيَقِلَّ الْقَتْلُ** (قتل زیادہ کرو تاکہ قتل کم ہو جائے)۔ ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد عام تھے، اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے:-

وَلَا تَكُونُوا فِي الْقِصَاصِ حِيلُونَ

”اور تمھارے لئے قصاص میں زندگی ہے“

اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت، اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھتے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے، اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں،

اسلوب کا اعجاز قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ کرنے والے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد و ضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے، جو شعر سے کہیں زیادہ حلاوت اور لطافت کا حامل ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک ایسی لذت اور حلاوت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوتی، اگر آپ اس

لذت اور ملاوت کے سبب پر غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا راز درحقیقت لفظوں کی اس ترتیب میں مضمر ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، عربی، فارسی اور اردو کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جب ایک ہی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑتے ہیں تو اس سے ذوقِ سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے، اور پھر جب وزن کے ساتھ قافیہ بھی مل جاتا ہے تو اس کی لذت دوچند ہو جاتی ہے، اور جب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل ہو جاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور اگر مصرعوں کے بیچ بیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرفی اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہو جائے (جیسا کہ مرصع اشعار میں ہوتا ہے) تو یہ لذت اور بڑھ جاتی ہے،

لیکن اوزان اور قوافی کے اصول ہر خطے اور ہر زبان میں یکساں نہیں ہوتے، ہر زبان کے لوگ اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اس کے لئے مختلف قواعد معتبر کرتے ہیں، مثلاً اہل عرب نے اپنی شاعری کو وزن اور قافیہ کے اُن ساچوں تک محدود رکھا ہے، جو خلیل بن احمد وغیرہ نے وضع کئے ہیں، فارسی شاعری میں اوزان کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا گیا، اور نئی نئی بحرین اختیار کی گئیں، لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی میں زیادہ کڑی شرائط عائد کر دی گئیں، چنانچہ عربی شاعری میں قبور اور کبر کو ہم قافیہ سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایک شعر میں ثبوت اور دوسرے میں کبر آ رہا ہو تو اُسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، جبکہ فارسی میں یہ ممکن نہیں، اسی طرح عربی میں اگر ایک ہی کلمہ کا آدھا حصہ پہلے مصرعہ میں اور آدھا دوسرے میں ہو تو اُسے معیوب نہیں سمجھتے جبکہ فارسی میں یہ زبردست عیب ہے، بلکہ ایسا شعر شعر ہی نہیں سمجھا جاتا، نیز عربی شاعری میں زحافات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اصلی بحر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جبکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا، اسی طرح عربی شاعری میں ردیف کا کوئی تصور نہیں جبکہ فارسی میں ردیف کے بغیر غزل پھینکی سمجھی جاتی ہے، مزید یہ کہ اصلی عربی شاعری میں فارسی کی طرح مثنوی، مستزاد، مخمس، مسلاس، رباعی اور قطع بنظر جیسی

اصناف کا وجود نہیں تھا، جبکہ فارسی ان اصناف سے مالا مال رہی ہے، اور پھر اسی کے اثر سے اندکس وغیرہ میں موثحات اور ازجال وغیرہ کی اصناف رائج ہوئیں، عربی اور فارسی میں ان اختلافات کے باوجود اوزان میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، لیکن قدیم ہندی شاعری کو دیکھتے تو اس میں معروف عروضی اوزان کے بجائے صرف حروف کی تعداد کا لحاظ ہوتا ہے، اور اگر دونوں نظموں کے حروف کی تعداد ایک ہو تو انھیں ہم وزن سمجھا جاتا ہے، خواہ ان کی حرکات و سکنات میں بڑا فرق ہو، بلکہ بعض اوقات ہندی دو ہونہیں عروضی اوزان و قوافی قائم یا ردیف کے قواعد، بلکہ تعداد حروف تک میں بڑا فرق ہوتا ہے، اس کے باوجود انھیں بڑے لطف کے ساتھ پڑھا اور گایا جاتا ہے، اور ان کی تاثیر ناقابل انکار ہوتی ہے اور اس معاملے میں انگریزی شاعری کا مزاج شاید سہی سے زیادہ آزاد واقع ہوا، کہ اُس میں عروضی اوزان تو کجا مصرعوں کے طول و عرض میں بھی بسا اوقات زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اکثر قافیے کی بھی کوئی خاص رعایت نہیں ہوتی، بلکہ صرف تلفظ کے کھٹکوں (Syllables) سے ایک خاص آہنگ (rhythm) پیدا کیا جاتا ہے، اور وہی آہنگ اہل زبان کے لئے ایک خاص لذت و کیف کا سبب بن جاتا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کی لذت و حلاوت میں افلا و قوافی کے لگے بندھے قواعد کوئی عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ یہ قواعد مختلف زبانوں اور خطوں میں بدلتے رہتے ہیں، لیکن ایک چیز ہر زبان سب زبانوں اور تمام قوموں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ ہے ایک متوازن صوتی آہنگ یعنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ اُن کے تلفظ سے اور انھیں سنکر انسان کا جمالیاتی ذوق حظ محسوس کرے، لیکن انسان چونکہ اس قدر مشترک کو اوزان و قوافی کے معروف سانچوں سے الگ کرنے پر قادر نہیں، اس لئے جب وہ شاعری کا لطف پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے لازماً اپنے ماحول کے

بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے، یہ صرف قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کئے ہوئے شعری قواعد میں سے کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی، بلکہ صرف ”متوازن صوتی آہنگ“ کی اس قدر مشترک کو اختیار کر لیا جو ان سارے قواعد کا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نثر ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے، اور صرف اہل عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اسے سن کر غیر معمولی لذت اور تاثیر محسوس کرتے ہیں،

یہیں سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض کفار و خب نے قرآن کریم کو کس بنا پر شعر قرار دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ شعر کی معرفت، تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی، اور کفار و عرب اپنی ہزار گراہیوں کے باوجود اتنی جس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں امتیاز کر سکیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لئے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے، جو قرآن کریم میں مفقود ہے، اس کے باوجود انھوں نے قرآن کریم کو شعر اس بنا پر قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انھوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی، اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وزن اور قافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجدان کے لئے وہ جمالیاتی لذت بدرجہ اتم موجود ہے، جو اوزان و قوافی کی جکڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی،

قرآن کریم نے ”متوازن صوتی آہنگ“ کی یہ تاثیر پیدا کرنے کے لئے کونسے نئے اصولوں کی رعایت رکھی ہے؟ اس بات کو بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ مرد جبہ الفاظ و مصطلحات اس کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے جو قرآنی اسلوب میں رواں دواں نظر آتی ہے، ہاں جس شخص کو ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کا کچھ حصہ ملا ہو وہ ہمارے مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو تلاوت قرآن کے دوران خود بخود محسوس کر سکتا ہے،

۱۵۔ یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الفیہ الکبیر“ سے تشریحی اضافوں کے ساتھ ماخوذ ہے، اس کی مزید تفصیل کیلئے اس کے باب ”فصل ما کا مطالعہ کیا جائے“

(۲) علمِ بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں، خطابی، ادبی، علمی، ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں، اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن نہیں ہے، آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے، اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زورِ ادب کی شگفتگی اور علم کی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی،

(۳) قرآن کریم کے مخاطب اٹھ دہائی بھی ہیں، بڑھے لکھے لوگ بھی اور اعلیٰ درجے کے علماء اور ماہرینِ فنون بھی، لیکن اس کا ایک اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو متاثر کرتا ہے، ایک طرف اُن پڑھ آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لئے اُتر ہے، لیکن دوسری طرف علماء اور محققین جب اُسے گہری نظر سے پڑھتے ہیں تو انھیں قرآن کریم میں علمی نکات نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب علم و فن کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے کہ معمولی واقفیت کا آدمی انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا،

ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریق استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہد کی دلیلوں پر مبنی ہے، توحید، رسالت، آخرت، آفرینش، حیات، اور جدو جہاد جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اور مظاہرِ فطرت کی طرف اشارہ کر کے وہ حقائق بیان فرمائے ہیں، جو آسانی کے ساتھ ایک ادنیٰ ذہنی معیار کے آدمی کی سمجھ میں آسکیں، لیکن انہی سادہ حقائق کی تہ میں اُتر کر دیکھتے تو اس میں خالص عقلی اور منطقی دلائل بھی ملیں گے، جو فلسفیانہ موشگافیوں کے مریض کو بھی شفا بخشتے ہیں، باتوں باتوں میں اس نے فلسفہ اور سائنس کے وہ دقیق مسائل بھی حل کر دیئے ہیں جن کی تحقیق کے لئے بڑے بڑے

فلسفی آخر تک پیچ و تاب کھاتے رہے،

(۴) اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے تو کھنڈ والا ادب و انشاء میں خواہ کتنا بلند پایہ مقام رکھتا ہو ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اکتا جاتے ہیں، کلام کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے، لیکن فترآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہوا ہے، لیکن ہر مرتبہ نیا کیفیت، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے،

(۵) کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت و شیرینی دو متضاد صفتیں ہیں، دونوں کے لئے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے، لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں یہ دونوں اوصاف بدرجہ کمال یکجا پائے جاتے ہیں،

(۶) قرآن کریم نے بعض اُن مضامین میں بلاغت کو اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کر سکتا، مثلاً قانونِ وراثت کو لیجئے، یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب و شاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن اس کے بعد سورۃ نساء میں یُؤْتِیْکُمُ اللّٰهُ مِنْ فِیْ اَوْ لَادِکُمْ الْخَیْرَ والے رکوع کی تلاوت کیجئے، آپ بیساختہ پکارا اٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے، اس پورے رکوع میں قانونِ وراثت بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حسن و جمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوقِ سلیم دھج کر رہا ہے،

(۷) ہر شاعر اور ادیب کی فصاحت و بلاغت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے جس سے جڑ کر اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے، عربی میں امرؤ القیس نسیب و غزل کا امام ہے، نابغہ، خوف و ہیبت کے بیان میں، اعشى، حسن طلب اور وصف میں اور زہیر رغبت و امید میں بے نظیر ہے، یہی حال ہر زبان کا ہے، لیکن قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مضامین بیان کئے گئے ہیں کہ اُن کا احاطہ دشوار ہے،

لیکن ترغیب ہو یا ترہیب، وعدہ ہو یا وعید، وعظ و نصیحت ہو یا امثال و قصص، عقائد کا بیان ہو یا احکام کا، ہر جگہ اس کا بیان بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے،

(۸) اختصار اور ایجازِ قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی دستِ بزر اور اس دست میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے ہر زمانے کی رہنمائی کے لئے آئلبے، اس لئے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامین سمیٹ دیئے ہیں کہ ہر در و در ہر زمانے میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں، چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اس کے مضامین پر لٹنے نہیں ہوتے، اس عرصے میں انسانی زندگی نے کتنے پلٹے کھائے، کیسے کیسے عظیم انقلابات رونما ہوئے، لیکن قرآن کریم سدا بہار رہا اور رہے گا، وہ تاریخ کی کتاب نہیں، مگر تاریخ کا مستند ترین مآخذ ہے، وہ سیاست و قانون کی کتاب نہیں، لیکن اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرما دیئے ہیں، جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں، لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقیدے کھول دیئے ہیں، وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں مہربانوں پر اس نے اختلاف کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دیدی ہیں کہ دنیا کے علوم و فنون سینکڑوں ٹکڑوں میں کھلنے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں،

نظم کا اعجاز | قرآن کریم کا ایک دقیق اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط و تعلق، اور نظم و ترتیب میں ہے، آپ سرسری نظر سے قرآن کریم کی تلاوت فرمائیں تو بظاہر یہ محسوس ہوگا کہ اس کی ہر آیت جدا مضمون کی حامل ہے، اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے، اسی وجہ سے نظم قرآن کے بارے میں مفسرین کے دو گروہ ہو گئے ہیں، بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس لئے اس میں کوئی ربط و ترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے، اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے، وہ شروع سے آخر

تک با ہم مربوط ہو، اور اسی نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ ضروری ہے، اس دوسرے
 گروہ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کتاب کا بے ربط ہونا اس کے نقص کی دلیل ہوتی ہے، اور اللہ
 تعالیٰ کا کلام لازماً اس نقص سے بری ہے، مگر پہلا گروہ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے
 کہ جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی بلکہ اُن کا حسن ہی اس
 بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بل کھاتا ہوا دریا ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے، کہیں اونچی
 نیچی وادیاں ہیں، اسی طرح قرآن کریم کا حسن بھی اس کی اس مستقل حیثیت میں ہے
 غزل کے ہر شعر کا موضوع جدا ہوتا ہے اور اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتا، بس ربط تشبیہ
 اسی طرح قرآن کریم میں بھی بے ترتیبی کوئی عیب نہیں

لیکن حقیقت یہ ہو کہ مفسران کریم کی آیات کے درمیان نہایت لطیف ربط پایا جاتا
 ہے، اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اگر کوئی ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو ترتیب نزول
 اور ترتیب کتابت میں فرق رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جس ترتیب سے قرآن کریم
 نازل ہوا تھا، اُسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا، یہ جو کتابت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 نے ایک الگ ترتیب قائم فرمائی وہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآنی آیات
 میں ربط موجود ہے، البتہ یہ ربط قدرے دقیق ہوتا ہے، اور اس تک پہنچنے کے لیے بڑے
 غور و فکر کی ضرورت ہے،

اس ربط کو اتنا دقیق اور غامض رکھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم)
 کہ ہر آیت کی ایک مستقل حیثیت باقی رہے، اور اس کے الفاظ کا عموم ختم نہ ہونے پائے
 تاکہ العبرة بعموم اللفظ پر عمل کرنا آسان ہو، اس کے علاوہ اُس زمانے میں اہل عرب
 کے خطبات و قصائد کا اسلوب عموماً یہی ہوتا تھا کہ اُن کے مضامین مرتب اور مربوط ہونے
 کے بجائے مستقل حیثیت رکھتے تھے، لہذا یہ طریقہ اُس دور کے ادبی ذوق کے عین
 مطابق تھا، چنانچہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے، قرآن کریم کی ہر آیت مستقل معلوم
 ہوگی، لیکن جب آپ ذرا غور کی نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا کلام مسلسل
 اور مربوط ہے،

اس طرح قرآن کریم نے اپنے نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے، اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے، بہت سے علماء نے قرآن کریم کے نظم کی توضیح کے لئے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں کے ضمن میں اسے بیان کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اس معاملے میں امام فخر الدین ازنکلی کی تفسیر کبیر شاید سب سے زیادہ قابل تعریف کاوش ہے، انھیں اللہ نے نظم قرآن کی تشریح کا خاص سلیقہ اور خاص توفیق عطا فرمائی ہے، ان کے بعد قاضی ابوالستود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نظم قرآن کی خصوصیات کو بیان فرماتے ہوئے کا خاص اہتمام فرمایا ہے، بعد کے بیشتر مفسرین اس معاملے میں انہی دو حضرات کے خوش چیں ہیں، نظم قرآن کی ایک ہلکی سی جھلک اس مثال میں دیکھی جاسکتی ہے، سورہ یحییٰ میں ایک جگہ ارشاد ہے :-

يٰۤيٰٓعِبَادِىۤ اِنِّىۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنْتَ عَذٰلٍیۡ
هُوَ اَلْعَذَابُ اَلْاَلِيْمُ (الحجر: ۴۹ و ۵۰)

”میرے بندوں کو خبر دید کہ میں غفور اور رحیم ہوں، اور میرا عذاب (بھی) بڑا دردناک ہے“

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے :-

وَيَنْتَعِظُ عَنْ ضَعْفِ اِبْرٰهٖمَ (الحجر: ۵۱)

اور انھیں ابراہیمؑ کے ہمانوں کی خبر دے دو۔

اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے، اس لئے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے، انھوں نے دو کام کئے، ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام جیسے صالح بیٹے کی خوش خبری دی، دوسرے انہی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر

جا کر غائب نازل کیا، پہلا کام ”أَنَا الْغَوْرُ الرَّحِيمُ“ کا مظاہرہ تھا اور دوسرا کام ”عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ“ کا، اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن الگ الگ دیکھنے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے؛

فترآن کریم کی پیشگی خبریں

یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب وہ کسی کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے، اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے تو لوگوں پر اس کا کلام اللہ ہونا ثابت کرنے کے لئے اس میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی کچھ پیشگی خبریں دی جاتی ہیں، اگرچہ پیشینگوئیاں بخوبی کی طرف سے بھی کی جاتی ہیں، لیکن اول تو وہ یقینی نہیں ہوتیں، چنانچہ بڑے سے بڑا بخومی کبھی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس کی ہر پیشینگوئی درست نکلی ہے، اور کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹے دعویٰ نبوت کے ساتھ کوئی پیشینگوئی کر رہا ہے تو اسے پورا نہیں ہونے دیا جاتا، قرآن کریم نے کلام اللہ ہونے کے ساتھ بیسیوں پیشگی خبریں دی ہیں اور وہ سب کی سب بلا استثناء صحیح ثابت ہوئیں، جس کا انکار اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکا، یہاں ان تمام پیشگی خبروں کو بالتفصیل بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چند اہم خبریں مثال کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں :-

رومیوں کی فتح | جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت ہوئے کے بعد مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے اور مشرکین مکہ کی طرف سے آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی تھیں، ٹھیک اُسی وقت دنیا کی دُرِ عظیم طاقتوں روم اور ایران کے درمیان شدید جنگ برپا تھی، اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آتی جا رہی تھیں، لہٰذا یہاں ہم نے اعجازِ قرآن کی صرف چند اہم وجوہ بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے "بائبل سے قرآن تک" از حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مرتبہ احقر ص ۳۵، ج ۲، نیز علامہ شیر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ "اعجازِ قرآن"۔

رومیوں کے پاؤں ہر جگہ سے اکٹھے رہے تھے، اور ایرانی لشکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو
 تاخت و تاراج کرتا ہوا طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا، رومی حکومت پہلے درپے ناکامیوں،
 متواتر شکست اور جان و مال کے بے پناہ نقصان کے باعث اس قدر نڈھال ہو چکی تھی
 کہ اس کا کسی مقام پر قدم جمانا ہی مشکل تھا، یہ جانتے کہ وہ پلٹ کر کوئی حملہ کر سکے، صورت
 حال کفار عرب کے لئے باعث مسرت تھی، کیونکہ وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی
 بنا پر اپنے مشابہ اور روم کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشابہ سمجھتے تھے،
 اور ایرانیوں کا غلبہ اُن کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شگون تھا، ان
 حالات میں سورۃ روم کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں،

الْمَلَّةُ عَلَى رُومٍ فِي آدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ
 سَيِّئَاتُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ بِضَمِّ سَيْنَيْنِ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ
 وَيَوْمَئِذٍ يَفْعَلُ اللَّهُ بِتَضَرُّعِ الْمُؤْمِنِينَ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَ
 هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَعَدَ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنَّ
 أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الروم: ۱-۶)

۱۔ الف، لام، میم، روم (ولے) قریب ترین زمین (یعنی اردن) میں مغلوب
 ہو گئے، اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں غالب آجائیں گے،
 اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کام پہلے بھی اور بعد بھی، اور اُس روز مسلمان اللہ کی
 مدد کی وجہ سے خوش ہوں گے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، اور وہ زبردست
 اور جہاں ہی یہ اللہ کا وعدہ ہے، اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا،
 لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۝

جو لوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے اُن کیلئے یہ پیشین گوئی قطعی طور
 پر ناقابل یقین تھی، چنانچہ قریش کے ایک ممتاز سردار ابی بن خلف نے حضرت ابو بکرؓ
 سے شرط لگائی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب آ گئے تو میں تمہیں دس اونٹ
 دوں گا، اور اگر غالب نہ آئے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے، اُس وقت اس طرح کی

شرط جائز تھی، اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے اُسے منظور فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع کی، آپؐ نے فرمایا کہ قرآن نے ”بضع سنین“ (چند سالوں میں) فرمایا ہے، اور عربی میں لفظ ”بضع“ چند کا اطلاق تین سے لے کر نو سال تک ہوتا ہے، لہذا تم اُبی بن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدت نو سال تک مقرر کر لو، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اُبی بن خلف سے نو سال کی مدت مقرر کر کے نواونٹوں کی شرط لگائی، اگرچہ اس پیشینگوئی کے وقت اسکے پورے ہونے کی کوئی آثار نہ تھی، بلکہ اسکے بعد بھی ایرانی فوج آگے ہی بڑھتی چلی گئیں، یہاں تک کہ رومیوں کے دار الحکومت قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچیں مشہور مورخ ایڈورڈ گیلن اس پیشینگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس وقت جبکہ یہ پیشینگوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از قیاس نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہر قتل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے ۱۱

(سقوط زوال سلطنت روم، ج ۵ ص ۷۳ و ۷۴)

لیکن اپنی پہلی شکست کے ٹھیک سات سال بعد قیصر روم بالکل خلاف توقع قسطنطنیہ سے باہر نکلا اور اس کی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملے کر کے انہیں متعدد مقامات پر شکست فاش دی اور اس کے بعد رومی لشکر ہر جگہ غالب ہی آتا چلا گیا،

اُدھر اس خصوصہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا چکی تھی اور کفار مکہ کے ساتھ ان کی جنگیں شروع ہو گئی تھیں، اور جس وقت بدر کے میدان میں تین سو تیرہ نہتے مسلمان ایک ہزار مسلح سواروں کا منہ پھیر رہے تھے ٹھیک اُسی وقت یہ خبر ملی کہ رومیوں نے اپنی ایران کو شکست دیدی ہے، اُس وقت یہ واضح ہوا کہ قرآن کریم نے رومیوں کی فتح کی خبر دینے کے ساتھ جو فرمایا تھا کہ **يَوْمَئِذٍ يَفْضَحُ الْمُؤْمِنُونَ** يَنْصَرُّ الَّذِينَ رَأَوْا مَسْئِلَ اللَّهِ رَأْسَ دُرٍّ مَسْئِلَ اللَّهِ کی مدد سے خوش ہوں گے) (اس سے مسلمانوں کی دوسری خوشی کی طرف اشارہ تھا، ایک دوسری بدست کے میدان میں خود اپنی فتح کی،

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ | **فتح مکہ کی خبر** آ کر ہجرت کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے، اور غارتوں میں تین روز قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پرمحفہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ مکرمہ جانے والی

ہرگز نظر آئی، اور طبعی طور سے آپ کو وطن کی یاد آئی، اور اُسے مستقلاً چھوڑ دینے کے خیال سے افسوس ہوا، اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:-

إِنَّ الْإِنْسَانَ قَرِصٌ عَلَيْكَ الْقُرْآنُ أَنْ كَرَّادُ لَكَ إِلَى مَعَادٍ ،

”بلاشبہ جس ذات نے قرآن (کے احکام) آپ پر فرض کئے ہیں وہ آپ کو دوبارہ لوٹائے گا“

اُس وقت آپ جس بے سرد سامانی کے عالم میں مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اُس کے پیشِ نظر ظاہری اعتبار سے اس پیشینگوئی کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی، لیکن چند ہی سال بعد آپ اسی شہرِ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہ پیشینگوئی پوری ہو کر رہی۔

یہودیوں کی تمنا سے موت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودی کہا کرتے تھے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی صرف یہودیوں کا حق ہے، اور ہم ضرور جنت میں جائیں گے، اس کے جواب میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:-

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ وَكَوْنِ

يَتَمَنَّوُوهَ أَبَدًا أَيْ مَا قَدَّ مَاتَ أَيْدِيَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۚ

”آپ فرمادیجئے کہ (اے یہودیو!) اگر اللہ کے پاس صرف تمہارے لئے خالص

طور پر دُعا آخرت ہی، دوسرے لوگوں کے لئے نہیں تو تم موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے

ہو، اور یہ لوگ اپنے کرتوت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے، اور اللہ تعالیٰ

ظالموں کو خوب جانتا ہے۔“

یہ چیلنج اور یہ پیشینگوئی مدینہ طیبہ کے اس ماحول میں کی جا رہی ہے جہاں یہودیوں کی بستیوں کی بستیاں آباد ہیں، اور مسلمانوں کو دن رات ان سے بحث و مناظرہ کا اتفاق پیش آتا رہتا ہے، اگر یہ چیلنج بذریعہ وحی نہ دیا گیا ہوتا تو جو یہودی آپ کی تکذیب

کا کوئی موقع فرو گذاشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ بڑی آسانی سے علی الاعلان موت کی تمنا کر کے دکھا سکتے تھے، اور اس طرح جو مناظرے شب و روز جاری تھے ان کا فیصلہ ایک ہی لمحے میں ہو سکتا تھا، لیکن اس آیت کے نزول کے بعد یہودیوں کو سانپ سونگھ گیا، اور کوئی ایک متنفس بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے بارے میں غیر مسلموں کا نظریہ خواہ کچھ ہو، لیکن اس بات سے آپ کے کسی دشمن نے بھی انکار نہیں کیا کہ آپ عقل و حکمت تدبر اور فہم و فراست کے اعتبار سے بلند ترین مقام کے حامل تھے، اب یہ بات ایک معمولی سمجھنے والے انسان سے بھی متوقع نہیں کہ وہ پورے یقین و اعتماد کے بغیر ایک ایسا چیلنج یا ایسی پیشین گوئی کر گزرے جسے اس کے مخالفین ایک لمحے میں توڑ سکتے ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل حکیم اور مدبر کی طرف سے یہ چیلنج وحی الہی کی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا،

قرآن کریم کی حفاظت قرآن کریم سے پہلے جو آسمانی کتابیں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں ان کی حفاظت کا کوئی وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکیں، مسلمانوں کا توخیر عقیدہ ہے ہی کہ آج جن کتابوں کو تورات، زبور یا انجیل کے نام دیئے جاتے ہیں وہ ہرگز بعینہ وہ کتابیں نہیں ہیں جو آسمان سے اُتری تھیں، بلکہ ان میں بہت کچھ تحریف و ترمیم ہو چکی ہے، لیکن خود اہل کتاب بھی اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہیں، اور کوئی کمرٹے کمریم ہودی یا عیسائی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں میں ہر ہر لفظ الہامی ہے، اور ان میں کہیں کوئی غلطی یا تبدیلی نہیں ہوئی، اس کے برخلاف قرآن کریم نے اپنے بارے میں یہ پیشگی خبر دیدی تھی کہ:-

لے اس کے مفقصل اور ناقابل انکار دلائل کے لئے ملاحظہ ہو ”بائبل سے قرآن تک“ مصنف مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، و مرتبہ احقر،

إِنَّا نَحْنُ حَزَنُ لِّمَا لَكَ كَرُوا نَالَهُ لِحَاظُ عُنُونٍ

”ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت

کرنے والے ہیں“

چنانچہ یہ وعدہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا، اور چودہ سو سال کے اس طویل عرصے میں قرآن کریم کا کوئی نقطہ یا کوئی شوشہ تک نہ ضائع ہو سکا، اور نہ اس میں تحریف و ترمیم کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکی، اسلام ہمیشہ مخالفوں اور عداوتوں کے نرغہ میں رہا ہے، اور اس کے دشمنوں نے اسے مغلوب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن کوئی دشمن قرآن کریم کو اُس دور میں بھی مٹانے، ضائع کرنے یا بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ قرآن کریم کے نسخے نہایت محدود تھے، اور نشر و اشاعت کے وسائل نایاب، تورات کو دیکھئے کہ کس طرح بائبل کا بادشاہ بخت نصر اٹھتا ہے، اور بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق سوائے حضرت عزیر علیہ السلام کے کسی شخص کو تورات یاد نہیں تھی، اس لئے تمام نسخے ضائع ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے حافظے سے اُسے دوبارہ لکھوایا، پھر روم کا بادشاہ اینتوکس ایسی فائیس (

اٹھتا ہے، اور خود بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تورات کا ایک ایک نسخہ پھاڑ کر جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ کوئی نسخہ باقی نہیں رہتا،^۱

اسی طرح انجیل کو دیکھئے کہ کس طرح طیطوس رومی، شاہ یرون، ڈیٹیشین اور ڈیوکلشین کے حملوں میں اس کے اصل نسخے نابود ہو جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا حال یہ ہے کہ اس کا سینکڑوں حملہ آوروں سے سابقہ پڑتا ہے، بہت سے مواقع پر مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے، اُن کے کتب خانے جلائے جاتے ہیں، قدیم کتابوں کے

۱۔ دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۰۱ ج ۳ مطبوعہ ۱۹۵۷ء مقالہ: بائبل، بحث چہم قدیم، فرست سلسلہ، بحوالہ السیڈرین دوم ۱۲: ۱۹ تا ۲۸، ۱۷ دیکھئے بائبل، ناکس ورژن میکن لندن ۱۹۶۳ء، مکابہوں کی پہلی کتاب ا: ۵۹،

بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہا دیے جاتے ہیں، قرآن مطہر کا سیلاب عظیم پورے عالم اسلام پر ٹوٹتا ہے اور قرآن کریم کی تحریف کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، لیکن یہ کتاب مبین اللہ کے وعدے کے مطابق کسی ادنیٰ تغیر کے بغیر نہ صرف محفوظ رہتی ہے بلکہ مشرق و مغرب میں اس کی نشر و اشاعت کی رفتار بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، آج بھی اگر بالفرض (خدا بخواستہ) قرآن کریم کے تمام مکتوب نسخے ناپید ہو جائیں تو لاکھوں فرزند ان توحید کے سینے اس کے سچے امانت دار ہیں، اور اگر کوئی شخص قرآن کریم کا ایک لفظ بھی تبدیل کرنا چاہے تو مسلمانوں کے کم سن بچے بھی اُسے پکڑ سکتے ہیں،

پھر قرآن کریم کے صرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ معانی کی حفاظت کا جو انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ بجائے خود ایک مستقبل تایخ ہے، مثلاً دریا یا مہر زبان کے الفاظ میں معانی کے اعتبار سے فرق واقع ہوتا رہتا ہے، چنانچہ عبرانی، سریانی، اور کلدانی زبانیں جن میں پچھلی آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں رفتہ رفتہ دنیا سے ناپید ہو گئیں، یا ان میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو گیا کہ وہ بالکل نئی زبانیں بن گئیں لیکن قرآن کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ ہزار ہا تغیرات اور انقلابات کے باوجود پوری طرح محفوظ ہیں، اور اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کا فلاں لفظ اس دور میں کس معنی میں سہتمال ہوتا تھا تو وہ نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے،

عربی زبان کو کس غیر معمولی طریقے پر محفوظ رکھا گیا ہے؟ اس کا ایک معمولی سا انداز اس واقعے سے ہو گا کہ یمن کے شہر زرائب کے اوپر عکا دنامی دو پہاڑ تھے، ان پہاڑوں کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی بستی کے باہر کسی بھی شخص سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کریں گے نہ دوستی کا، اور نہ خود کہیں باہر جائیں گے، یہاں تک کہ باہر کا کوئی آدمی ان کے یہاں تین دن سے زیادہ قیام بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر باہر کے لوگوں سے ہمارا میل جول بڑھا تو ہماری عربی زبان بگڑ جائے گی، یہ لوگ اپنے ان اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے، اور مؤرخین نے لکھا ہے

کہ یہ وہ واحد گروہ ہے جس کی عربی زبان ٹھیکہ زمانہ جاہلیت کی زبان ہے، اور اس میں ہر مٹو فرق نہیں آیا؛

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ اللہ کی یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی، اور خود اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا، اس کی صداقت روز بروز روشن ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ پیشگی خبر سو فی صد درست ثابت ہوئی ہے،

یہاں قرآن کریم کی تمام پیشگی خبروں کا استیعاب کرنا نہیں، بلکہ صرف چند مثالیں پیش کرنا مقصود تھا، اور ان چند مثالوں ہی سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو پیشگی خبریں دی تھیں وہ ایسے معجزانہ طریقے پر پوری ہوئی ہیں جس میں کسی انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں،

قرآن کریم کے انکشافات

پیشگی خبروں کے علاوہ قرآن کریم نے بہت سے ایسے علمی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی فرمائی ہے جو اُس زمانے میں نہ صرف یہ کہ نامعلوم تھے، بلکہ اُس وقت اُن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کو جمع کر کے اگر ان کی مفصل تفسیر بیان کی جائے تو بلاشبہ ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، یہاں اُن سب آیات کا استیعاب تو ممکن نہیں، البتہ چند مختصر مثالیں درج ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا، تو اس نے جان بچانے کے لئے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا، جس کے جواب میں بار تعالیٰ نے فرمایا:

”اَلْاَنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝

”اَلْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنُ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً“ (یونس: ۹۱ و ۹۲)

لہ معجم البلدان لیا قوت الحموی، ص ۱۴۳ ج ۴، جزو ۱۴، دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ
ماڈہ ”مکتوبات“ و تاج العروس، للزبیدی، ماڈہ ”عکۃ“۔

آب (ایمان لانا ہے) حالانکہ پہلے مافسرمائی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں سے
تھا! پس آج ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے
عزت بن جلتے»

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو معلوم
نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے، لیکن اب سے کچھ عرصہ پہلے
یہ لاش دریافت ہوئی، اور آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے،
(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُونَ

”اور ہم نے ایک چیز کے دو جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم
نصیحت حاصل کرو،“

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت عالم تصور یہ تھا کہ نر اور مادہ کے جوڑے
صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں، یا پھر چند نباتات میں، لیکن سائنس کی ترقی
کے ساتھ ساتھ یہ فتر آئی حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ نر و مادہ ہر چیز میں موجود
ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں ان جوڑوں کا نام نر اور مادہ رکھ لیا جائے، کہیں مثبت
(Positive) اور منفی (Negative) اور کہیں الیکٹرک
اور پروٹون اور کہیں نیوٹرون اور پوزیٹرون، بلکہ ایک آیت میں قرآن کریم نے صراحتاً یہ
یہ بھی واضح فرمادیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں،

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ
الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ

”پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا، نباتات
زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں سے اور ان چیزوں میں
بھی جنہیں یہ لوگ نہیں جانتے»“

خفائیت قرآن اور مغرب کے غیر مسلم مصنفین

ایک زمانہ تھا جب مغربی مصنفین عیسائیت کے شدید تعصب میں مبتلا ہو کر کھلم کھلا یہ کہا کرتے تھے کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانی بوجھی تصنیف ہے، اور (معاذ اللہ) آپ کا دعوائے نبوت خود ساختہ تھا، لیکن اب خود مغرب کے غیر مسلم مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے اہل مغرب کا یہ نظریہ محض ایک معاشرانہ دعویٰ تھا، جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس کی تکذیب کرتی ہے، عہدِ حاضر کے معروف مستشرق پروفیسر منٹگمری وائٹ لکھتے ہیں:-

”قرنِ وسطیٰ کے یورپ میں یہ تصور عام کیا گیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک (معاذ اللہ) جھوٹے پیغمبر تھے، جو غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، لیکن قرنِ وسطیٰ کے یہ تصورات جو دراصل جنگی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتے تھے، اب آہستہ آہستہ یورپ اور عیسائی دنیا کے ذہنوں سے اتر رہے ہیں۔“

پروفیسر وائٹ نے بالکل درست کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تکذیب کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں تھی، بلکہ یہ اُس پروپیگنڈے کا ایک جز تھا، جسے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ضروری سمجھا جا رہا تھا، انھوں نے خاصی تفصیل کے ساتھ اُن قدیم اہل یورپ کی تردید کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) جھوٹے دعویٰ یا جُنون یا کسی بیماری کا الزام عائد کرتے تھے، اور بتایا ہے کہ عہدِ حاضر کے مغربی اسکالر روشن دلائل کی وجہ سے ان الزامات کو تسلیم نہیں کرتے، آخر میں وہ لکھتے ہیں:-

”لہذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قرنِ وسطیٰ کے اس تصور کو تو

اب خارج از بحث قرار دیدن چاہیے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک ایسا انسان سمجھنا چاہیے جو پورے خلوص اور نیک نیتی سے وہ بیانات سناتے تھے، جن کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ اُنکے پاس خدا کی طرف سے آئے ہیں۔

اس اعتراف کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صاف الفاظ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اقرار کر لیا جاتا، لیکن صدیوں سے ذہنوں میں ججے ہوئی تصورات آسانی سے نہیں مٹتے، چنانچہ منظم گری و آث اور ان کی طرح کے عہدِ حاضر کے دیگر مصنفین ایک طرف تو یہ اعتراف کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوائے نبوت میں مخلص تھے، دوسری طرف اپنے مذہب کو علی الاعلان چھوڑ کر اسلام کو اختیار کر لینا اُن کے لئے مشکل ہے، لہذا انھوں نے ایک ہیچ کی راہ تلاش کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی ایک عجیب غریب توجیہ پیش کی ہے،

اُن کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی درحقیقت کوئی خارجی چیز نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جو آپ کے طویل غور و فکر اور مشاہدات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، اور جسے آپ نے پوری دیانتداری سے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھا، آپ اپنی عمر کے ابتدائی دور ہی سے اپنی قوم کے مذہب اور اُن کے طور طریقوں سے بیزار تھے، اسی لئے آپ اُن کے طرزِ عبادت کی تقلید کرنے کے بجائے تنہائی میں غور و فکر فرماتے تھے، آپ کا دل اپنی قوم کی گمراہیوں پر کڑھتا تھا اور آپ اُن کو اس گمراہی سے نکالنے کے طریقے سوچتے تھے، اسی مقصد کے لئے آپ نے غارِ حراء کی تنہائیوں میں کئی کئی دن گزارنے شروع کئے، دیں پر طویل غور و فکر کے نتیجے میں عقیدہ توحید پر آپ کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا، اور ساتھ ہی یہ داعیہ بھی کہ اس قوم کو بت پرستی کی گمراہی سے نکال کر توحید کی طرف دعوت دینی چاہیے، غارِ حراء کی اُن تنہائیوں میں جہاں کوئی بات کرنے والا نہیں تھا، یہ تصور آپ کے دل و دماغ پر

اس قدر محیط ہو گیا کہ آپ کو اپنے دل کی یہ آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی، اور اسے آپ نے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص و دیانت سے نبوت کا دعویٰ کر دیا،

یہ ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی وہ توجیہ جسے آجکل ”دانشورانِ مغرب“ میں قبولِ عام حاصل ہے، مستشرقین میں سے ایک دو نہیں، بلکہ بیسیوں ”محققین“ اس کے قائل ہیں، یہاں تک کہ بعض مسلمان کہلانے والے افراد بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمائیے کہ اس توجیہ کے پیچھے اس کے سوا اور کیا ذہنیت کا قریب ہے کہ ان ”دانشوروں“ نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق اُن کے لئے ممکن نہیں، خواہ اُس پر کتنے روشن دلائل قائم ہو جائیں، اور خواہ اس نبوت کی تردید کے لئے کتنی دور از کار، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین تاویلات کو اختیار کرنا پڑے، واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر وائٹ اور عصیر حاضر کے دوسرے مستشرقین آپ پر نازل ہونے والی وحی کی جو توجیہ کرتے ہیں اس کا کوئی علمی اور عقلی جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، تاہم مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمائیے:-

(۱) کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، جن کے بارے میں خود اُن کا اعتراف یہ ہے کہ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالا مال تینیس سال تک مسلسل اپنی ایک اندرونی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے رہیں اور آخر وقت تک یہ پتہ نہ لگا سکیں کہ اس غیر معمولی کیفیت کی حقیقت کیا ہے، وحی کا نزول آپ پر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ تینیس سال تک سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مرتبہ ہوتا رہا ہے، کیا اس پورے عرصہ میں (معاذ اللہ) آپ اسی مغالطے میں مبتلا رہے؟

(۲) پھر اگر آپ پر یہ نام نہاد ”اندرونی کیفیت“ اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی، تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سب سے پہلے تجربے میں انکی گراہیوں

کی تردید اور عقیدہ توحید کا بیان ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں نہ کفر و شرک کی تردید ہو، نہ عقیدہ توحید کا ذکر ہے، اور نہ آپ کی بنیادی تعلیمات میں سے کسی تعلیم کا بیان ہے، اس کے بجائے اُس کے الفاظ یہ ہیں:-

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق: ۱ تا ۴)

”پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے تمہیں پیدا کیا، انسان کو دم بستہ سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار کریم ترین ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا“

۳۔ پھر یہ عجیب بات ہو کہ یہ کیفیت ”ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد فوراً ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اور تین سال تک آپ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، اس عرصے میں آپ وحی کے انقطاع سے پریشان بھی رہتے ہیں، لیکن تین سال تک محفل سکوت طاری رہتا ہے، اس کے بعد پھر وحی نازل ہوتی ہے تو اس میں بھی شرک کی واضح تردید نہیں کی جاتی اور نہ اہل عرب کی عملی گمراہیوں کا کوئی ذکر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کیفیت آپ پر اپنی قوم کی گمراہیوں پر سوچ بچار اور تصور توحید کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی تو وحی کے بالکل ابتدائی واقعات میں یہ تصورات کہاں گئے تھے؟ اور تین سال تک ان تصورات کے غلبے نے کوئی آواز کیوں نہیں سنائی؟

۴۔ اگر یہ کوئی ”اندر دنی کیفیت“ تھی تو پوری طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آپؐ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہدایتیں دی گئیں، بلکہ بعض مقامات پر آپؐ کی ذاتی رائے کی تردید اور اس پر ایک لطیف عتاب بھی موجود ہے، مثلاً لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ (آل عمران: ۱۲۸) اور مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ

کہ اَسْرٰی حَتّٰی یُنْجِنَ فِی الْاَسْرِ عَنِ (الانفال : ۶۷) اور عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذْنَبْتَ
لَهُمْ حَتّٰی یَتَّبِعُنَّ لَكَ الَّذِیْنَ مَدَّحُوْا وَتَعْلَمَ اَنْتَ الْکٰیْنِ بَیْنَ (التوبہ : ۲۲) وغیرہ
(۵) اگر بالفرض مان لیا جائے کہ کسی تصور کا شدید غلبہ اللسان کو ایک خارجی
آواز کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہو کہ یہ خارجی آواز جو پیشینگوئی
کرتے وہ ہمیشہ سچ نکلتے، جو حکم دیدے وہ انجام کار درست ثابت ہو، جو الفاظ
بول دے وہ ایسے پتھر کی لکیر بن جائیں کہ دنیا بھر کے ادیب و خطیب اس کے مقابلہ
سے عاجز ہو کر بیٹھ جائیں، یہاں تک کہ اسی کلام کی بنیاد پر پورے جزیرہ عرب میں
ایسا انقلاب عظیم برپا ہو جائے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے،
(۶) اگر تسلیم کر لیا جائے کہ تصورات کے غلبے سے محسوس ہونے والی آواز کوئی
حقیقت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی شخص کے علم و تصور کا ایک عکس ہو سکتی ہے جسے
وہ سنائی دے رہی ہے، اور جو بات پہلے سے اُس کے علم و تصور میں نہ ہو وہ اس آواز
سے معلوم نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم کی تلاوت کر کے دیکھئے اس میں کتنی بے شمار
باتیں ایسی ہیں جو وحی سے پہلے آپ کو معلوم نہیں تھیں، وحی کے اس کلام نے پہلی بار
آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً آیت ذیل پر غور فرمائیے :-

مَا كُنْتُ دَاعٍ رِّیْ مَا اَلْکُتُبُ وَلَا اَلِیْسَانُ وَلٰكِنْ
جَعَلْنٰهُ نُوْرًا مَّهْدٰیۨۨ یَّہِ مِنْ نَّشَآءٍۨ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ)؛

”آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے؟ اور نہ ایمان سے واقف
تھے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو روشنی بنایا جس کے ذریعے ہم اپنے

بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔“

(۷) بالخصوص پچھلی امتوں کے اکثر واقعات وہ ہیں جن کے بارے میں خود قرآن کریم
نے بھی تصریح کی ہے، اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ امر ناقابل انکار ہے کہ آپ نزول وحی
سے قبل اُن سے واقف نہیں تھے، قرآن کریم نے پہلی بار آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً
سورہ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کا

ارشاد ہے :-

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا
أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا (رہود: ۳۹)

”غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف بذریعہ وحی نازل کرتے
ہیں، ان خبروں کو نہ آپ اس سے پہلے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم“
اور سورہ یوسف کے آخر میں ارشاد ہے :-

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ
لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۝
(یوسف: ۱۰۲)

”غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور
جس وقت یہ لوگ اپنے معاملے میں متفق ہو رہے تھے، اور تدبیریں
کر رہے تھے، اُس وقت آپ اُن کے پاس نہیں تھے“
منگنمری واٹ، اور اُن کے دوسرے ہم نوا یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی جھوٹ
نہیں بولا اور :-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دیانت و اخلاق پر کوئی اعتراض
نہیں کیا جاسکتا“

لہذا قرآن کریم کی کسی آیت میں اُن کے نزدیک بھی غلط بیانی ممکن نہیں، اب سوال
یہ ہے کہ اگر یہ ”وحی“ کوئی خارجی ذریعہ علم نہیں تھا تو اس کے ذریعے آپ کو کچھ
انبیاء علیہم السلام کے وہ واقعات کیسے معلوم ہو گئے جو پہلے معلوم نہیں تھے؟
(۸) اوپر ہم نے صرف وہ باتیں پیش کی ہیں جو ایک عام آدمی بھی معمولی غور
فکر سے سمجھ سکتا ہے اور جو قرآن کریم کی سرسری تلاوت سے بھی واضح ہو جاتی ہیں،

اور اگر حدیث کی ان روایات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں نزول وحی کی کیفیات اور اس کے ابتدائی واقعات بیان کئے گئے ہیں تو منطقی واط وغیرہ کی یہ خیالی تاویلات خود بخود پادر ہوا ہو جاتی ہیں، اُن میں سے کچھ روایات پیچھے ”تایخ نزول قرآن“ کے تحت بیان ہو چکی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل کتاب؛

بعض مغربی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپؐ پر نازل ہونے والی ”وحی“ درحقیقت آپؐ ہی کی ایک ”اندرونی کیفیت“ تھی، جو تصورات کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی، یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ آپؐ نزول وحی کے آغاز سے پہلے پچھلی اُمتوں کے واقعات سے واقف تھے، اور وہی واقعات اُس ”خاص کیفیت“ کے وقت آپؐ کی زبان پر آگئے،

اُن کا کہنا یہ ہے کہ آپؐ نے پچھلی اُمتوں کے یہ واقعات (معاذ اللہ) عرب کے یہود و نصاریٰ سے سُنے تھے، اس سلسلے میں خاص طور پر یحیرا اور نسطور اراہب کے نام لئے جاتے ہیں، جن سے سفرِ شام کے وقت آپؐ کی ملاقات کا قصہ سیرت و تالیخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے، بعض مغربی مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ راہب آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، جو توحید کا قائل تھا، انہی راہبوں سے آپؐ نے (معاذ اللہ) توحید کا قصہ اخذ کیا، انہی سے پچھلی کتابوں کا علم حاصل کیا، اور انہی سے پچھلی اُمتوں کے واقعات سیکھے،

لیکن اگر انصاف و دیانت دنیا سے بالکل اٹھ ہی نہیں گئی تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ سفرِ شام کے دوران اس مختصر سی ملاقات

۱۔ مثلاً دیکھئے جے، ایم، راڈویل (Rodwell) کا انگریزی ترجمہ قرآن، مقدمہ، ص ۸ مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء،

یہ ان راہبوں نے اپنے سینے کی تمام معلومات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
اندھیل دی ہوں گی، اور آپؐ نے ان سب کو راتوں رات جذب کر کے ایک انقلاب فیس
دین کی بنیاد ڈال دی ہوگی، ازل تو یہ دعویٰ ہی سرے سے بلا دلیل بلکہ بے بنیاد ہے کہ
بحیرا اور نسطورا آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی
اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، اور مل بھی کیسے سکتی ہے جبکہ آریوسی فرقے کو تو چوتھی صدی
عیسوی ہی میں بدعتی اور ملحد (Heretic) قرار دے دیا گیا تھا، اور اس کے
آریوسی کا نام لینا بھی قابل تعزیر جرم قرار پا گیا تھا، اٹھاناسیوس (Athanasius)
اور اس کے ہم نواؤں نے اُس فرقے کا بیج مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس سبب
فرقے میں اتنی سخت کہاں تھی کہ وہ ساتویں صدی عیسوی تک سانس لے سکتا؟ اور اگر
کوئی بچا کچھ فرد باقی ہوتا بھی تو اس کو یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ بصری جیسے شہر
میں ایک خانقاہ کا سربراہ بن بیٹھتا؟

دوسرے جن روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ سفر شام کے دوران آپؐ کی ملاقات
ان راہبوں سے ہوئی تھی، اپنی روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ انتہائی مختصر
سرسری اور ضمنی ملاقات تھی جس میں کسی تعلیم و تعلم کی گنجائش ممکن ہی نہیں، حیرت
ہے اُن لوگوں کی عقلوں پر جو ایسی مضحکہ خیز باتوں پر ایمان لاسکتے ہیں، لیکن آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کو تسلیم کرنا اُن کے لئے مشکل ہے،
یہاں ہم بحیرا راہب سے آپؐ کی ملاقات کی مفصل ترین روایت نقل کرتے ہیں
جس سے حقیقت حال واضح ہو سکے گی؛

جامع ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ
ابو طالب قریش کے کچھ مشائخ کے ساتھ شام کے لئے روانہ ہوئے، شام میں جس جگہ
جا کر اترے وہاں ایک راہب ہوتا تھا، اس سے پہلے بھی اس راہب کے پاس سے گزر رہا تھا
لیکن وہ کبھی ملتفت نہیں ہوتا تھا، اس مرتبہ جب یہ تجارتی قافلہ وہاں جا کر اترتا تو
راہب خلاف معمول اپنی خانقاہ سے نکل کر آیا، اور متحسنانہ نظروں سے ایک ایک کو

دیکھنے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا:
 هَذَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ، هَذَا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ،
 يَبْعَثُ اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ،

”یہی ہے تمام جہانوں کا سردار، یہی ہے پروردگار عالم کا رسول“،

حکمران اللہ تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گا۔

سردارانِ قریش نے اس راہب سے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ راہب نے کہا جس وقت
 آپ سب گھاٹی سے نکلے تو کوئی شجر و حجر ایسا نہیں تھا جس نے اس کو سجدہ نہ کیا ہو،
 اور شجر و حجر نبی ہی کے لئے سجدہ کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ میں آپ کو مہرِ نبوت سے بھی
 پہچانتا ہوں جو سب کے مشابہ آپ کے شانے کے نیچے واقع ہے،

راہب یہ کہہ کر واپس ہو گیا، اور پورے قافلے کے لئے کھانا تیار کر لیا، جب کھانے
 کے لئے سب حاضر ہوئے تو آپ موجود نہ تھے، راہب نے دریافت کیا کہ آپ کہاں ہیں؟
 معلوم ہوا کہ اونٹ پھرانے گئے ہوئے ہیں، آدمی بھیج کر آپ کو بلایا، جس وقت آپ تشریف
 لائے تو ایک ابر آپ پر سایہ کئے ہوئے تھا، جب آپ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ
 لوگ آپ سے پہلے درخت کے سائے میں جگہ لے چکے ہیں، اب کوئی جگہ سایہ کی باقی نہیں
 رہی، آپ ایک جانب کو بیٹھ گئے، بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپ تک جھک گیا، راہب نے
 کہا کہ درخت کے سائے کو دیکھو، وہ کس طرح آپ کی طرف جھکا ہوا ہے، اور پھر کھڑے
 ہو کر قریش کے لوگوں سے کہا کہ آپ ان کو روم کی طرف نہ لے جائیں، رومی اگر ان کو
 دیکھ لیں گے تو آپ کی صفات اور علامات سے آپ کو پہچان کر قتل کر ڈالیں گے، اثنائِ کلام
 میں راہب کی نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ روم کے سات آدمی کسی تلاش میں اسی طرف آرہے ہیں
 راہب نے پوچھا، تم کس لئے نکلے ہو؟ رومیوں نے کہا کہ ہم اُس نبی کی تلاش میں نکلے ہیں
 (جس کی توریت و انجیل میں بشارت مذکور ہے) جو اس مہینے میں سفر کے لئے نکلے والا ہے،
 ہم نے اپنے آدمی ہر طرف بھیجے ہیں..... راہب نے کہا اچھا یہ تو بتلاؤ کہ جس شے کا اللہ
 نے ارادہ فرمایا ہو، کیا اس کو کوئی طلا سکتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں، اس کے بعد

رومیوں نے تھیرا راہب سے عہد کیا کہ وہ اب اس نبی کے درپے نہیں ہوں گے، اور وہیں راہب کے پاس ٹھہر گئے، راہب نے پھر قریش سے قسم دے کر پوچھا کہ تم میں سے اُن کا ولی کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابوطالب ہیں، اس کے بعد راہب مسلسل ابوطالب کو قسمیں دیتا رہا، کہ تم ان کو ضرور واپس بھیج دو، یہاں تک کہ ابوطالب نے آپ کو واپس بھیج دیا، بعض علماء کو اس روایت کی صحت میں بھی کلام ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تب بھی اس میں غور دین لگا کر بھی اس بات کی کوئی گنجائش نہیں نظر آتی کہ آپ نے تھیرا راہب سے کچھ واقعات سیکھے ہوں گے، یہ ایک انتہائی مختصر ملاقات تھی، جو چند گھنٹوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھی، اور یہ ملاقات بھی اُس وقت ہوئی جبکہ آپ کی عمر کل بارہ تیرہ سال تھی، کیا یہ بات کوئی صحیح بعقل انسان باور کر سکتا ہے کہ اس کم سنی میں چند گھنٹوں کی اس مختصر ملاقات نے پچھلی امتوں کا ایسا گہرا علم آپ کو عطا کر دیا ہو کہ آپ اہل کتاب کو چیلنج کر کر کے اُن کی کتابوں میں تحریف کی وضاحت فرمائیں، اور اُن کی غلطیاں واضح کریں؟

اور نسطور راہب سے ملاقات کا قصہ تو تھیرا کے قصہ سے بھی زیادہ مختصر ہے،

۱۔ جامع ترمذی ابواب المناقب باب ماجاء فی بدۃ نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۲۲۵ ج ۲، طبع قرآن محل کراچی، ۱۵۰۰ چنانچہ حافظ ذہبی نے اسے ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے لکھا اظنہ موضوعاً فبعضہ باطل (تلخیص المستدرک کتاب التاریخ، دلائل النبوة، ص ۶۱۵ ج ۲ مطبوعہ کن ۱۳۴۴ھ)۔ لیکن حافظ ابن حجر وغیرہ نے اسے درست قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ”رجالاً ثقات“ (بحوالہ زرقاتی شرح المواہب ص ۱۹۶ ج ۱ طبع ازہریہ مصر، ۱۳۲۵ھ)۔ ۲۔ اس سفر کے بارے میں تین روایتیں ملتی ہیں، ایک میں آپ کی عمر کل نو سال بیان کی گئی ہے، اور علامہ حلبی نے اسی کو ترجیح دی ہے، (السیرۃ الحلبیۃ ص ۱۱۳ ج ۱ مصطفیٰ البانی ۱۳۸۴ھ) اور حافظ ابن عبد البر نے تیرہ سال کی روایت کو اختیار کیا ہے، لیکن علامہ زرقاتی فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس وقت آپ کی عمر کل بارہ سال تھی (زرقاتی ۲: شرح المواہب ص ۱۹۳ ج ۱)۔

اور اگر کوئی شخص اُس کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے معلومات حاصل کی تھیں تو سوائے تعصب اور اسلام دشمنی کے اس کی کوئی توجیہ ممکن ہی نہیں،

پھر سوچنے کی بات ہو کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اہل کتاب سے یہ واقعات سُن رکھے تھے، تو وہ کفار مکہ جو آپ کی تردید کے لئے ہر رانی کا پہاڑ بنانے کے لئے تیار تھے، اس موقع پر کیوں خاموش رہے؟ انھوں نے یہ دعویٰ کیوں نہیں کیا کہ آپ کو یہ باتیں فلاں فلاں اہل کتاب نے سکھائی ہیں، انتہا یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی مکہ مکرمہ کے ایک لوہار کے پاس کھڑے ہو جایا کرتے تھے، محض اتنی سی بات سے کفار مکہ نے یہ شہرت دیدی کہ یہ لوہار آپ کا معلم ہے، جس کی تردید قرآن کریم نے اس طرح فرمائی کہ:-

وَلَقَدْ تَعَلَّمَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ
لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجِبُكُمْ وَهَذَا لِسَانُ
عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ (النحل: ۱۰۳)

لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے یہ علم بحیرار، نسطورایا ورقہ بن نوفل سے حاصل کیا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ایسا بے ٹکا اعتراض تھا جسے آپ کے کٹر مخالف ہم عصروں نے بھی زبان سے نکالنا پسند نہیں کیا،

قرآن کریم پر چند اعتراضات

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کے بیان کئے ہوئے بعض واقعات پر اعتراضات کئے ہیں، اور اُن سے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعات اہل کتاب کے کسی عالم سے زبانی سُنے تھے جنھیں بیان کرنے میں مغالطہ ہو گیا، مثلاً:-

حضرت مرثم کے والد کا نام | مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ایک اعتراض یہ کیا گیا

ہے کہ:۔ مریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا بھی، اور اول الذکر عمران کی بیٹی تھیں، قرآن میں (معاذ اللہ) مغالطے کی بنا پر مؤخر الذکر کو بھی ”بنت عمران“ قرار دیا،

مقام افسوس ہے کہ یہ بے سرو پا اعتراض برٹانیکا جیسی عالمی شہرت کی کتاب میں درج کرتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی گئی، اگر ”برٹانیکا“ کا مقالہ نگار کسی یقینی دلیل سے یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام ”عمران“ نہیں تھا، تب تو یہ اعتراض کسی درجے میں قابل لحاظ ہو سکتا تھا، لیکن حالت یہ ہے کہ اگر خود انہی سے پلٹ کر یہ پوچھ لیا جائے کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران کے سوا اور کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوگا، انتہا یہ ہے کہ بائبل میں بھی اُن کے والد کا کوئی نام مذکور نہیں، اور خود برٹانیکا کے مقالہ ”مریم“ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ:-

”حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی

تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔“

ایک طرف یہ لاعلمی اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام (معاذ اللہ) مغالطے پر مبنی ہے، کیا ”برٹانیکا“ کے مقالہ نگار یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ کسی شخص کا نام ”عمران“ رکھا جا چکا ہو، تو اب دنیا میں کوئی شخص اس کا ہم نام پیدا نہیں ہو سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے کہ وہ اُن تاریخی حقائق کی علی الاعلان نقاب کشائی کر رہا ہے جو سات سو سال سے نامعلوم تھے، اور اس خود اعتمادی اور دھڑلے کے ساتھ کر رہا ہے کہ چودہ سو سال سے اس کے بدترین دشمن بھی اسے غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے،

لہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۸۳ ج ۱۳ مطبوعہ ۱۹۵۷ء ”مقالہ ”قرآن“

لہ برٹانیکا، ص ۹۹۹ ج ۱۳ مقالہ ”مریم“

بھری بات صرف حضرت مریمؑ کے والد کے نام ہی تک محدود نہیں، بلکہ حضرت مریمؑ کی پیدائش، اُن کی تربیت، اُن کے بچپن اور اُن کی ابتدائی زندگی کے تمام حالات کے بارے میں تمام ”مستند“ عیسائی مآخذ بالکل خاموش تھے، یہاں تک کہ چاروں معتبر اناجیل میں بھی ان حالات کا تذکرہ موجود نہیں ہے، یہ قرآن کریم ہی تھا جو پہلی بار ان واقعات کو منظرِ عام پر لایا، شروع شروع میں عیسائی دنیا ان ”انکشافات“ پر بھی اعتراضات کرتی رہی، مگر اب خود عیسائیت کی ایسی قدیم کتابیں دریافت ہو رہی ہیں، جن میں قسماً قرآن کریم کے بیان کردہ یہی واقعات بیان کئے گئے ہیں، حیرت ہے کہ قرآن کریم کے ان واضح معجزات کو دیکھ کر بھی ان ”دانشوروں“ کو قرآن کریم پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام کسی عیسائی مآخذ میں نہیں ملتا؟

فرعون کا وزیر ہامان | ”برٹانیکا“ کے مقالہ ”قرآن“ ہی میں ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ایک وزیر کا نام ہامان ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامہ قدیم میں نہیں ملتا، مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان شاہ اسویرس کا وزیر تھا، جس کا ذکر بائبل میں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ یہ واقعات زبانی سیکھے تھے، اس لئے آپؐ نے (معاذ اللہ) مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انتہائی بے سرو پا بات ہے، اور اسی طفلانہ مفروضے پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو انسان نہیں پائے جاسکتے، پھر واقعہ یہ ہے کہ اسویرس کے جس نام ہناد وزیر کا ذکر ”برٹانیکا“ کے مقالہ نگار نے کیا ہے اس کا

۱۔ ملاحظہ ہو ڈکشنری آف دی بائبل از ہیٹنگز، ص ۲۸۸ ج ۳،

۲۔ برٹانیکا، ص ۴۸۳ ج ۱۳ مقالہ ”قرآن“۔

قصہ صرف بائبل کی ایک مشتبه کتاب ر Apocryphal book ، آستر میں مذکور ہے، اس کتاب کو پرونٹسٹنٹ فرقہ معتبر نہیں مانتا، چنانچہ مردود جہ پرونٹ انجیلوں میں یہ کتاب موجود نہیں ہے، البتہ کیتھولک فرقہ اسے مستند مانتا ہے، اس مشکوک کتاب میں جس ہامان یا آمان کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ شاہ اسویرس کا وزیر نہیں بلکہ صدر دربار تھا، اور اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے قرآنی واقعے سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کے لئے ایک اونچا محل تعمیر کراے، تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰ کے خدا کو جھانک سکے، نیز قرآن کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت تک فرعون کا منہ چڑھا وزیر رہا، اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا، اس کے برعکس کتاب آستر میں ہامان (یا آمان) کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منسوخ نہیں کیا گیا، کتاب آستر کا ہامان بخت نصر کے واقعے کے بعد کا ہے، اور اس کا قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک اتفاقی واقعہ کی بنا پر صرف مختصر عرصہ کے لئے بادشاہ اسویرس کا قرب حاصل کرتا ہے، لیکن اسی دوران وہ یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروادیتا ہے جس سے بادشاہ کی یہودی ملکہ آستر اس کی دشمن ہو جاتی ہے، اور انجام کار بادشاہ اسے سولی پر لٹکا کر اس کی جگہ ایک یہودی مرد کے کوٹنا مزدور دیتا ہے،

جس شخص نے آستر کی کتاب کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ آستر کے اس قصے کو ہامان کے قرآنی واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہیں، اگر واقعہ ہامان کے تذکرے میں آستر والے ہامان سے اشتباہ لگا ہوتا تو دونوں قصوں میں کہیں تو کوئی اتفاق ہونا چاہئے تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں مطابقت کی کوئی ادنیٰ

لے کتاب آستر کے بعض نسخوں میں اس کا نام ہامان اور بعض میں آمان یا ایمان (Aman) مذکور ہے۔
 ۵۲ دیکھئے آستر ۱: ۱، ۵۳ ملاحظہ ہو آستر ۳: ۸ اور ۴: ۶-۱۰ اور ۸: ۲ (ناکسٹن رٹن
 مطبوعہ میکملن لندن ۱۹۶۳ء)

جھلک بھی نہیں پائی باقی، ہامان کا جو واقعہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ آستر یا
بائبل کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، اور آستر میں جو قصہ منقول ہے وہ نہ صرف
قرآن کریم میں بلکہ لاکھوں احادیث کے ذخیرے میں بھی کہیں نہیں ملتا، جس سے یہ اندازہ
ہو سکے کہ وہ کبھی آپ کے علم میں آیا تھا،

پھر عجیب بات یہ ہو کہ دو ہمنام شخصوں کو دیکھ کر اشتباہ لگنے کا یہ فلسفہ عہدِ حاضر
کے عیسائی اور یہودی مستشرقین کو ہمیشہ صرف قرآن اور اسلام ہی کے معاملات میں
یاد آتا ہے، بائبل میں جو سینکڑوں ہم نام انسانوں کا ذکر ہے اُن کے بارے میں انھیں
بھی اس قسم کے خیالات نہیں سستاتے؟

بہترین نسخہ بہترین نسخہ بہترین نسخہ بہترین نسخہ بہترین نسخہ

مضامین قرآن

قرآن کریم کے مضامین پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تمام مضامین چار بڑے عنوانات پر منقسم ہیں، اور قرآن کریم کی ہر آیت ان میں سے کسی ایک عنوان کے تحت ضرور آتی ہے:-

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) قصص (۴) امثال،

عقائد (ایجابی پہلو)

قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین عقائد کو ثابت کیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت،

توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کائنات کے ذرے ذرے کو صرف ایک ذات کی

لے یہ مضمون احقر نے اس کتاب کی تالیف سے گیارہ سال پہلے ۱۳۸۳ھ میں لکھا تھا، اور اس وقت ماہنامہ ”بینات“ وغیرہ میں شائع بھی ہوا تھا، اب اسے معمولی حذوف و اضافہ کے بعد اس کتاب کا جُز بنارہا ہوں، م، ت، ع

خلیق سمجھے، اسی کو پڑھے، اُسی کو چلبے، اُسی سے ڈرے، اُسی سے مانگے، اور دل میں یہ یقین رکھے کہ اس بیکراں کائنات کا ہر ذرہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اور کوئی دھوکا اس کی توفیق کے بغیر اُسے اُدھر سے اُدھر بلا بھی نہیں سکتا،

رسالت کا مطلب یہ ہو کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے تمام پیش رو پیغمبروں کو خدا کا سچا رسول سمجھے جس بات کو وہ حق کہیں اسے حق سمجھے، اور جو بات اُن کے نزدیک باطل ہو اُسے باطل ٹھہرائے،

آخرت کا مطلب یہ ہو کہ انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی پر ایمان رکھے، جو ابدی ہوگی، اور اس میں ہر شخص کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہیں، اگر اس نے اچھے کام کئے ہوں گے تو وہ جنت کی سرمدی نعمتوں کا حق دار ہوگا، اور اگر اس نے بُرے کام کر کے اپنی دنیوی عمر کو ضائع کیا ہے تو وہ دوزخ کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا،

ان تین بنیادی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم نے انواع و اقسام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں، عقلی طور پر دلائل کی چار قسمیں ہیں، کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے یا تو انسان کسی ایسی اتھاریٹی کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے مخالف کے نزدیک بھی واجب التسليم ہو، یہ دلیل نقلی ہوتی ہے، یا پھر وہ منطقی انداز سے اپنے دعوے پر دلیل لاتا ہے یہ منطقی دلیل ہے، یا وہ اپنے مخالف کو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جس سے ہر انسان اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے جہاں مدعی پہنچا ہے، یہ مشاہداتی دلیل ہوتی ہے، یا پھر وہ اپنے نقطہ نظر کو درست ٹھہرانے کے لئے دنیا کے سابقہ واقعات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو ماضی میں میرے نظریے کے مطابق عمل کیا گیا تھا تو دنیا نے فلاح پائی تھی، اور فلاں قوم نے اس نظریے کے خلاف عمل کیا تھا تو وہ تباہ ہو گئی تھی، ایسی دلیل کو تجرباتی یا استقرانی دلیل کہا جاتا ہے،

قرآن کریم میں ان میں سے ہر ایک قسم کی دلیل موجود ہے، اُن کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

نقلی دلائل | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَأَن تَكْفِي زُجْرَ الْأَوَّلِينَ ه (دشعر)

اور بلاشبہ اس کی خبر پچھلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہو

اس آیت میں باری تعالیٰ نے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جو کتابیں تمہارے نزدیک معتبر ہیں یعنی تورات و انجیل، خود ان میں (تحریف ہو جانے کے باوجود) آج تک آپ کی رسالت کا ذکر موجود ہے،

یہ اُن پیشینگوئیوں اور خوش خبریوں کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ آسمانی کتابوں میں آپ سے متعلق دی گئی تھیں، مثلاً تورات کے سفر استثنا میں ہے:-

”خداوند سینا سے آیا اور شیعر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا

دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت

اُن کے لئے تھی“ (استثنا، ب ۳۳، دس ۲)

نابہر ہے کہ فاران اور شیعر کے پہاڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ (حضرت رسل کے بعد آنے والے پیغمبروں میں سے) کوئی اور پیغمبر جلوہ گر نہیں ہوا، اور دس ہزار قدسیوں سے صحابہ کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی اسی طرح انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:-

”جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی طرف

سے نہ کہو گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا“ (یوحنا ۱۵: ۱۲)

۱۔ مدینہ منورہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے، اور فاران مکہ معظمہ کا مشہور پہاڑ ہے، جس کے ایک حصہ پر

غار حراء ہے، اور اب وہ جبل النور کے نام سے معروف ہے،

۲۔ ۱۵۹۷ء کے ایڈیشن میں بائبل کے ”ارباب حل عقد“ نے ”دس ہزار“ کے لفظ کو ”لاکھوں“ سے

تبدیل کر دیا ہے،

منطقی دلائل

منطقی دلائل کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اور تقریباً ہر قسم قرآن کریم میں موجود ہے، منطقی دلائل کی سب سے پہلی اور سب سے کثیر الاستعمال

قسم وہ ہے جسے اصطلاح میں ”قیاس اقترانی“ کہا جاتا ہے، اس قیاس میں عام طور پر ایک کلیہ بیان کیا جاتا ہے، اور اپنے دعوے کو اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، سورہ طہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ کا جادوگر سے مقابلہ ہوا اور ان کی رستیاں اور لاشٹیاں سانپ بن کر چلنے لگیں تو حضرت موسیٰ کو کچھ خوف محسوس ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، آپ ہی سر بلند رہیں گے، یہ لوگ فلاح نہیں پاسکتے، اس لئے کہ:-

إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدًا سَاجِدًا وَلَا يَفْلَحُ السَّاجِدُ حَيْثُ
آتَىٰ (طہ: ۶۹)

”جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ایک جادوگر کی ترکیب ہے، اور جادوگر خواہ کہیں چلا جائے اُسے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی“

یہ قیاس اقترانی کی وہ مثال ہے جس میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں موجود ہیں، اور ایسی مثالیں تو بے شمار ہیں جن میں کوئی مقدمہ محذوف ہے، مثلاً، کفار کہا کرتے تھے کہ جب انسان کی ہڈیاں خاک بن کر ختم ہو جائیں گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بروز حشر انھیں از سر نو زندہ کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عین ممکن ہے، کیونکہ:-

بَلَىٰ قَدْ رَئَيْنَا آنُسُوسٍ بَيِّنَاتٍ رَقِیْمًا (۴۱)
”کیوں نہیں، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انسان کی انگلیوں کے

پوروں کو برابر کر دیں“

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوف ہے، کہ جو ذات پوروں کو برابر کرنے پر قدرت رکھتی ہو وہ یقیناً ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگی، (کیونکہ پوروں کا برابر کرنا ہڈیوں کو زندہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے) کیونکہ انگلیوں کے پوروں پر جو خطوط قدرت نے رکھے ہیں وہ اللہ جل شانہ کی قدرت کا مکمل اور حکمت بالغہ کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے کہ کروڑوں

بلکہ اربوں اور پدموں انسان جو اس دنیا میں آئے ان میں سے کسی کے یہ خطوط دوسرے سے نہیں ملتے، اس آدھ ارج کی جگہ میں قدرت نے کیا معجزہ رکھا ہے کہ ہر انسان کے خطوط دوسرے سے الگ ہیں، کبھی ایک کے نشانات دوسرے سے نہیں ملتے، اسی لئے قدیم زمانے سے نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام اس کی خصوصیت کا مظہر مانا گیا ہے، اور آج بھی تمام حکومتوں، عدالتوں میں نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے باقاعدہ محکمہ قائم ہے، اس لئے جو ہستی پوروں جیسی نازک اور دقیق چیزوں کے اعادہ پر قادر ہے وہ ہڈیوں کو زندہ کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے، لہذا یوم آخرت کو جھٹلانا بے دلیل بات ہے،

قیاس استثنائی | منطقی دلائل میں سے دوسری اہم قسم ”قیاس استثنائی“ ہے، یہ دلیل عام طور پر کسی چیز کی نفی کرنے کے لئے لائی جاتی ہے اور اس کے درجہ نہ ہوتے ہیں، پہلے جڑ، یعنی صغریٰ میں جس چیز کی نفی کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی دوسری چیز پر موقوف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے جڑ یعنی کبریٰ میں اُس چیز کی نفی کر دی جاتی ہے جس پر پہلی چیز کو موقوف کیا گیا تھا، مثلاً مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ اس وقت دن نہیں ہے، تو میں کہوں گا کہ ”اگر دن موجود ہوتا تو سورج موجود ہوتا لیکن سورج موجود نہیں ہے، لہذا معلوم ہوا کہ دن بھی نہیں ہے۔“ اس قسم کی دلیلیں بھی قرآن کریم میں بہت ہیں، مثلاً شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرتے کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

كُوْنًا فِيْهِمَا اِلٰهٌ ۙ اِلَّا اللّٰهُ فَسَدَّ ۙ اٰلَہُ (التوبہ: ۳۷)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ

دونوں چیزیں فاسد ہو جاتیں۔

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوث ہو، کہ ”لیکن زمین و آسمان فاسد نہیں ہوئے“ لہذا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود کبھی نہیں ہے،

لے اس لئے کہ ایک خدا ایک کام کو چاہتا دوسرا نہ چاہتا، لڑائی ہوتی اور فساد پھیل جاتا،

السببر والتقسیم | منطقی دلائل میں سے ایک اہم دلیل ”السببر والتقسیم“ بھی ہے، جس کے ذریعے مخالف کے دعوے کو رد کیا جاسکتا ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخالف سے یہ کہا جائے کہ تمھارے دعوے کے ثابت ہونے کے لئے اتنے احتمالات میں سے کوئی ایک احتمال پایا جانا ضروری ہے، اور کیونکہ یہاں اُن میں سے ایک بھی نہیں پایا جاتا رہا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمھارا دعویٰ غلط ہے، مثلاً آپ کے مخالف کا دعویٰ ہے کہ زید پاکستان کی اسمبلی کا ممبر ہے، آپ اس سے جواب میں کہیں کہ پاکستان اسمبلی کا ممبر کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ یا تو وہ نیشنل اسمبلی کا یا ممبر پاکستان اسمبلی کا یا مشرقی پاکستان اسمبلی کا، اور چونکہ وہ ان میں سے کسی کا بھی ممبر نہیں ہو لہذا اسے پاکستان اسمبلی کا ممبر نہیں کہا جاسکتا، یہ ہو ”السببر والتقسیم“۔

قرآن کریم میں اس کی بڑی واضح مثال موجود ہے، کفار حلال جانوروں میں سے بعض اوقات نرجانوردوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا کرتے تھے، اور بعض مرتبہ ماداؤں کو، اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تمھارے اس حرام قرار دینے کی علت کیا ہے؟ عقلاً صرف چار صورتیں ممکن ہیں جن کے سوا کوئی پانچویں بات نہیں ہو سکتی، یا تو انھیں اُن کے مذکور ہونے کی بنا پر قرار دیتے ہو، یا مؤنت ہونے کی بنا پر، یا اس لئے کہ وہ رحم جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اس میں کوئی ایسی بات ہے جو سبب حرمت بن سکتی ہے، یا پھر عقل کی رُو سے کوئی سبب حرمت سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ تم اسے اس لئے حرام سمجھتے ہو کہ خدا نے اسے حرام قرار دیدیا ہے، اور یہ چاروں باتیں ناممکن ہیں، نہ ہونے کو سبب حرمت اس لئے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ تم صرف نرجانورد کو حرام قرار نہیں دیتے، بلکہ بعض اوقات مادہ جانور بھی حرام کر لیتے ہو، دوسری بات یعنی مادہ ہونے کو بھی اسی لئے سبب حرمت نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ تم نر اور مادہ دونوں قسم کے جانوروں کو حرام کرتے ہو، تیسری صورت یعنی اس رحم کا سبب حرمت ہونا اس لئے ممکن نہیں کہ پھر تو بیک وقت نر اور مادہ دونوں حرام ہونے چاہئیں، حالانکہ تم ایک وقت میں یا نر کو حرام سمجھتے ہو یا مادہ کو، بیک وقت دونوں کو حرام نہیں کرتے

پرتھی صورت یعنی محض اللہ کی اطاعت کی بنا پر حرام سمجھنا بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نازل نہیں فرمایا،

وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آلَّذِي كَرِهَ حَرَّمَ آمَرَ
الْمُتَشَبِّهِينَ أَمَّا اسْتَمَلْتُ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثَيْنِ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ
إِذَا وَصَاكُمُ اللَّهُ بِهَذَا، (انعام)

”اور اللہ نے بید (کے) اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو آپ پر بھیجے کہ دونوں

نہ حرام کہے ہیں یا دونوں مادہ؟ یا ہر وہ بچہ جس پر دونوں مادہ کے رحم مشتمل ہیں یا تم

اس وقت حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا تھا؟

یہاں باری تعالیٰ نے بڑے دلنشیں انداز میں ”سبر و تسکین“ کے ذریعے ان کے مزاحمت کا رد فرمایا۔

منطقی استدلال کا چوتھا اہم طریقہ ”تسلیم“ ہوتا ہے، یعنی مخالفت کی کسی بات یا
ادعاء کو تسلیم کر کے یہ کہنا کہ اس تسلیم کرنے کے بعد بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا،
کفار کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کسی انسان کی بجائے کبوتر فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں
بھیجا گیا؟ اس کا جواب باری تعالیٰ نے کئی طریقوں سے دیا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:-

وَكُوْنُجَعْلُنَا مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا، (انعام)

”اور اگر ہم انہیں فرشتہ بناتے تو بھی اُسے مرد ہی کی شکل میں

مبعوث کرتے“

یعنی اوّل تو کسی پیغمبر کے لئے فرشتہ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ انسان کو اس
مقصد کے لئے بھیجا جائے، لیکن اگر بغرض محال تمھاری بات تسلیم کر کے فرشتہ بھیج بھی
دیا جائے تو بھی تمھارا مقصود اس سے حاصل نہ ہوتا، اس لئے کہ ہم فرشتے کو اس کی اصلی
شکل و صورت میں تو بھیج نہیں سکتے، کیونکہ تم میں اس کی اصلی شکل دیکھنے کی تاب ہی نہیں
ہے، لا محالہ اُسے مرد کی صورت میں بھیجا جاتا، اس وقت پھر تم اس پر ایمان نہ لاتے،

منطقی انداز کے مناظرہ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نے ایک
انتقال دلیل پیش کی، مخالفت نے کچھ فہمی کی بنا پر اس پر کوئی اعتراض کر دیا،

مدعی ایسے موقع پر اس کا جواب دینے کے بجائے دوسری دلیل پیش کر دیتا ہے، جس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ میری پہلی دلیل غلط تھی، بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اعتراض حماقت پر مبنی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ دلیل سمجھ نہیں سکتے، میں دوسری دلیل دیتا ہوں اسے ”انتقال“ کہا جاتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ میں اس کی واضح مثال ہے، آپ کا جب مزدور سے مناظرہ ہوا، آپ نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر ایک دلیل پیش کی کہ:-

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ ،

میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے؛

اس پر مزدور نے ایک بے گناہ کو پھر مکر قتل کروادیا، اور ایک ایسے شخص کو آزاد کر دیا جسے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا، اور کہا کہ:-

اَنَا اُحْیِیْ وَ اُمِیْتُ

میں بھی زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں؛

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ احمق زندہ کرنے اور مارنے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا اس لئے فوراً ایک اور جواب کر دینے والی دلیل پیش کی کہ:-

فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِیْهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ،

”اللہ تعالیٰ تو سورج مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر لا“

یہ ”انتقال“ تھا، جس پر غزوہ کی ساری چرب زبانی ختم ہو گئی،

فَبُهِتَ الَّذِیْ مَنِ كَفَرَ ، (بقرہ)

”چنانچہ اللہ کا انکار کر نیا لامبھوت رہ گیا“

مشاہداتی دلائل | دلائل کی تیسری قسم وہ ہے جو ”مشاہدہ“ سے تعلق رکھتی ہے قرآن کریم نے اس قسم کے دلائل زیادہ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ منطقی اور فلسفیانہ موشگافیاں انسان کو خاموش تو کر دیتی ہیں، مگر بسا اوقات اس سے بات

دن میں نہیں اترتی، اور ان سے شبہات کے مریض کا علاج نہیں ہو سکتا، اور قرآن حکیم کا مقصد کسی کو خاموش کرنا نہیں، حق باتوں کو دلوں میں اُتارنا ہے، دوسرے یہ کہ منطقی دلیلیں ایک خاص طبقہ کے لئے مفید ہوتی ہیں، ہر ان پڑھ اور جاہل کے لئے وہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اور ”مشاہدہ“ وہ مُنہ بولتی چیز ہے جس کی وجہ سے ایک الٹھ دیہاتی بھی بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ :-

أَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيرِ وَالْأَشْرُ عَلَى الْمَيْسِرِ فَسَمَاءُ
ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَآرَضٌ ذَاتُ فُجَاجٍ كَيْفَ لَا تَدُلُّ عَلَى
اللطيف العجيب

جب راستے میں پڑی ہوئی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، اور نشان قدم مسافروں کا، تو یہ بُرجوں والا آسمان اور یہ غاروں والی زمین لطیف و خیر خالق کا پتہ کیسے نہیں دے گی۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر مشاہداتی دلیلیں ہر مرتبہ نئی شان اور نئی اداسے پیش فرمائی ہیں، ایک مثال سنئے، توحید کے دلائل دیتے ہوئے ارشاد ہے :-

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ الْمُمْرِثِينَ السَّمَاءَ
مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ، مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ
تُنَبِّتُوا شَجَرَهَا، ءِإِلَهِ مَعَ اللَّهِ، بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعِدُونَ
أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا
رَوَاسِي وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، ءِإِلَهِ مَعَ اللَّهِ، بَلْ
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ؕ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ
يَكْشِفُ السُّوءَ، وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ءِإِلَهِ مَعَ اللَّهِ،
قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ؕ أَمَّنْ يَعْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ، ءِإِلَهِ مَعَ
اللَّهِ، تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ؕ (نمل؛ ۶۳)

”بلکہ وہ ذات بہتر ہی جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور تمھارے لئے آسمان سے بانی اتارا، پھر ہم نے اس سے بارونق باغ اُگائے، تمھارے بس کی بات ہمیں تھی کہ تم اُن کے درخت اُگاسکے، کیا اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقات سے اعراض کرتے ہیں، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جس نے زمین کو رہنے کی جگہ بنایا، اور اُس کے درمیان نہریں بنائیں، اور ان کے لئے جمانے والے پہاڑ بنائے، اور دو سمندر روں کے درمیان ایک حائل بنایا کیا اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر (صحیح بات) نہیں جانتے، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو مضطر انسان کی دعا قبول فرماتی ہے، اور بُرائی کو دور کرتی ہے، اور تم کو زمین کا خلیفہ بناتی ہے، کیا اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو تمہیں خلقی اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتی ہے، اور جو اپنی رحمت سے خوش کر دینے والی ہوائیں بھیجتی ہے، کیا اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تعالیٰ اُن تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے، جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔“

یعنی جو ذات اتنے اہم کام سرانجام دیتی ہے اور اس کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، تو لا محالہ اسی کو عبادت کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، اور دوسرے کو اس کا شریک بنانا بدترین حماقت ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جو ذات تہناتنے عظیم کام انجام دیتی ہے اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت کیوں ہو؟ ایک اور جگہ یوم آخرت کا اثبات کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔
 اَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا

لہ کفار عرب جانتے تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، زمین و آسمان اسی نے پیدا کئے ہیں، مگر وہ دنیوی بادشاہوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے تھے کہ اس نے ان کے انتظام کیلئے معاذ اللہ ایزیدگار رکھے ہوئے ہیں، ۱۲، م، ت،

وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ وَالْأَرْضُ مِنْ مَدَدِنَاهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَاسِيًا وَأَنْبَتْنَا
فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً وَذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ وَنَزَّلْنَا مِنْ
السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَبَّ وَنَبَاتٍ وَالْعِصْيَانَ وَالنَّخْلَ
بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيِّتَةً كَذَلِكَ
النُّجُوجُ (ق ۵ تا ۱۱)

”کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، ہم نے اسے کیسے بنایا ہے، اور اسے
زینت بخشی ہے، اور اس میں کوئی بھی تو شگاف نہیں، اور ہم نے زمین کو پھیلایا ہے،
اور اُس میں نہ ٹٹنے والے پہاڑ بنائے ہیں، اور اس میں ہر ایک بار دق جوڑا اُگایا ہے، تاکہ
ہر رجوع کرنے والا بندہ اُن سے بصیرت اور نصیحت حاصل کرے، اور ہم نے آسمان سے
برکت والا پانی اُتارا، پھر اُس کے ذریعے بندوں کو رزق دینے کے لئے باغات اور
کھیتوں کے بیج اُگاتے، اور اس کے ذریعے مُردہ (قحط زدہ) شہر کو زندہ کیا دیں، اسی
طرح حشر ہوگا“

قرآن کریم میں انسانی جسم و نفس، کائناتی حقائق، فلکیات، نباتات اور ارضیات سے
متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کے دلائل کے ضمن میں آئی ہیں، اور جہاں
جہاں آفاق و کائنات پر غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اُس
کائنات کے اسرار و عجائبات پر غور کر کے اس کے بنانے والے کی قدرت کا ملکہ کا استحضار پیدا
کرے، اور بالآخر اُسی کے آگے سجدہ ریز ہو جائے، اس ضمن میں قرآن کریم نے بہت سے مختلف
حقائق کی نقاب کشائی بھی فرمادی ہے، لیکن اس قسم کی تمام باتوں کو قرآن کے پورے سیاق
(Context) میں دیکھنا چاہئے، اُسے ایک مستقل سائنس کی کتاب سمجھنے سے بہت سی
غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں،

تجرباتی دلائل | قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے تجربات کی طرف توجہ دلائی ہے، چنانچہ
وہ جگہ جگہ ارشاد فرماتا ہے :-

أَوَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ فِي الْأَمْثَلِ قِيْنٌ يُنْظَرُ وَأَكَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ

قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَبَنَوْا مَعَارِصَ وَحَارَوْهَا وَجَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ يَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ (روم: ۹)

”کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا رہا جو ان سے پہلے گذرے ہیں، وہ ان سے قوت کے اعتبار سے زیادہ تھے، اور انھوں نے زمین کو ان کے بسنے سے زیادہ بسایا، اور بویا جو تھا، اور ان کے پاس ہمارے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے تھے، تو اللہ تو ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے“

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قُرْيَةٍ بِطَرَفِ مَعِيشَتِهَا قِتْلَكَ مَسَاكِينُ لَمْ تَسْكُنْ مِنْ بَعْدِ هُمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝ (قصص: ۵۸)

”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تکبر اختیار کیا، پھر (دیکھو) وہ ان کی بستیاں ہیں جو ان کے بعد آباد نہ ہو سکیں، مگر بہت کم، اور ہم ان کے وارث ہیں“

ان تجربات کو ذکر کر کے قرآن حکیم یہ بتلانا چاہتا ہے کہ جس جس قوم نے اپنی زندگی کو غلط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے، اور جس جس نے ہماری ہدایات کی روشنی سے منہ موڑا، ہی ہم نے ہمیشہ اُسے تباہی کے اُن گہرے غاروں میں ڈھکیل دیا ہے جہاں سے وہ پھر کبھی نہیں نکل سکے،

عقائد (سبلی پہلو)

مندرجہ بالا عقائد کو ثابت کرنے کے علاوہ قرآن کریم نے انسانوں کے عقائد و اعمال کی بہت سی گراہیوں کو زد کیا ہے، اور اُس میں پڑے ہوئے لوگوں کے مختلف شبہات کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس مضمون کی آیتوں کو اصول تفسیر کی اصطلاح میں ”آیاتِ خاصہ“ کہتے ہیں،

اس قسم کی آیتوں میں چار قسم کے گمراہ انسانوں کا ذکر کیا گیا ہے :-

(۱) بت پرست مشرکین (۲) نصرانی (۳) یہودی (۴) منافقین،

بت پرست مشرکین | بت پرست مشرکین کی گمراہیاں پانچ اقسام کی تھیں :-
(۱) ”شُرک“ وہ باری تعالیٰ کی مخصوص صفات میں بتوں

کو شریک بٹھراتے تھے، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے، مگر جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی حکومت کے مختلف انتظامات مختلف آدمیوں کو سونپ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حیثیت بھی (معاذ اللہ) ایک ایسے بادشاہ کی سی ہے جو کائنات پر کنٹرول کرتا ہے، مگر رزق وغیرہ جسزوی شعبے اس نے بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں، اور اب اُن میں اس کا کوئی دخل نہیں، لہذا ان شعبوں سے متعلق سوال بھی بتوں ہی سے کرنا چاہئے، اور ان کی عبادت کر کے انھیں خوش رکھنا چاہئے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سفارش کرتے رہیں، قرآن کریم نے اُن کا یہ عقیدہ اس طرح بیان فرمایا ہے :-

وَمَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (زمر: ۲۶)

ہم اُن کی صرف اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب

کر دیں ۝

بت پرستی کی یہ گمراہی اُن لوگوں میں سب سے پہلے عمر بن لُحی نامی ایک شخص نے پھیلانی تھی اور اس میں شبانہ روز ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کرتے تھے،

مترآن کریم نے اُن کی اس گمراہی کا مختلف طریقوں سے رد فرمایا ہے، کہیں ان کے دلیل کا مطالبہ کیا کہ آخر کس نے تمہارے کان میں آکر تم سے یہ باتیں کہہ دی ہیں کہ جن پر بے سوچے سمجھے عمل کئے جاتے ہو، اور انھیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتے، کہیں یہ ثابت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا ارادہ ہی بڑی سے بڑی چیز کو عدم کے پردوں سے نکال کر وجود کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دیتا ہے، پھر اُسے اپنی سلطنت

کے انتظام میں دوسروں کی مدد کی کیا حاجت ہے؟ (سورہ نمل کی جو آیت اوپر پیش کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے)، ہمیں انھیں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جو پتھر کل تک لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا تھا وہ آج ہتھوڑے کی ضرب کھا کر خدا کیسے بن گیا؟ صرف ”لات“ یا ”ہبل“ نام رکھ لینے سے اس میں رزق دینے اور مصیبتیں دور کرنے کی صلاحیت کہاں سے آگئی؟

إِنَّ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَتَمَّ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا
أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلُطٰنٍ، (النجم: ۲۳)

”بس یہ چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھا
ہیں، اللہ نے تو ان میں کوئی قوت و قدرت نہیں اتاری“

(۲) بُت پرستوں کی دوسری گمراہی ”تشبیہ“ تھی، یعنی وہ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر کیا کر کے مجسم اور (معاذ اللہ) بیوی بچوں والا سمجھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، و سرآن کریم نے اُن کی اس گمراہی کا رد و طرح فرمایا، ایک تو کلیۃ اللہ سے اولاد کی نفی کر کے:-

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ • (اخلاص: ۳)
”اُس نے کسی کو جنم نہ دیا نہ کسی کو جنم لیا“

دوسرے خاص طور سے لڑکیوں کی نفی کر کے، کہ ذرا اپنی عقل مندری تو ملاحظہ کرو کہ تم بیٹیوں کا وجود اپنے لئے تو باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہو، اور پھر جس ذات کو پوری کائنات کا پروردگار مانتے ہو اس کے لئے بیٹیوں کے وجود کے قائل ہو:-

أَلَمْ تَلِدْ وَلَكُمُ الْبَنٰتُ ۚ لَكُمْ الْبَنٰتُ ۖ هٰذَا كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ •
”کیا اس کیلئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے؟ تمہیں کیا ہو گیا؟“

کیسے کیسے فیصلہ کر لیتے ہو؟ (الطور: ۳۹ / القلم: ۳۶)

(۳) اُن کی تیسری گمراہی ”تحریف“ تھی، یعنی وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم ٹھیک اُن کے طریقے پر ہیں، مگر بہت سے جزئی

احکام و قوانین بھی انھوں نے اپنی طرف سے گھڑ لئے تھے، ننگے ہو کر طواف کرنا، نماز کی بجائے سیٹیاں اور تالیاں بجانا، مہینوں کو آگے پیچھے کر لینا، کہ جنگ کرتے کرتے کوئی ”شہر حرام“ آجاتا تو وہ کہتے کہ اب کے یہ مہینہ دو مہینے تک چلے گا، باری تعالیٰ نے جا بجا اُن کی لغویوں کو ظاہر کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسی داہیات باتوں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے؛

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ خُذْ وَاَزِيْنَتَكَمُ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

”اے ایمان والو! ہر مسجد کے پاس اپنا لباس ضرور پہنا کرو۔“
وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاوَاً وَتَصَدِيْقَةً
”اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے
سو اچھے نہ تھی۔“ (الانفال: ۳۵)

اِنَّمَا النَّسِيْعُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ، (التوبة: ۳۷)

”بلاشبہ مہینوں کو آگے پیچھے کرنا کفر میں اور زیادتی ہے۔“

(۴) اُن کی جو تھی مگر ابھی یہ تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ خدا تسلیم نہیں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہمارا جیسا چلنے پھرنے اور کھانے پینے والا انسان پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے جا بجا اُن کی اس گمراہی کا رد فرمایا، اور سمجھایا کہ بشریت نبوت کے منافی نہیں، اور ہمیشہ سے انبیاء انسانوں ہی میں سے آئے ہیں:-
وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ،

”اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مرد ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی نازل کر دیتے تھے۔“ (یوسف: ۱۰۹)

(۵) اُن کی پانچویں گمراہی ”انکارِ آخرت“ تھی کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے تھے، قرآن کریم نے اس کا مختلف دلنشین اسالیب کا رد فرمایا:-

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ

لَمْ يَعْ يَخْلُقْهُمْ يَقْدِرُ عَلٰى اَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتٰى (الاحقاف: ۳۳)

”کیا وہ ذات جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور اُن کے پیدا فرمانے سے بالکل تھکی بھی نہیں، وہ اس بات پر قادر نہیں کہ اس جیسی اور چیزیں پیدا فرمادے“

یہودی | قرآن کریم نے یہودیوں کا رد بھی فرمایا ہے، یہ لوگ اپنی گمراہیوں میں حد سے بڑھے ہوئے تھے، بت پرست مشرکین میں جو گمراہیاں تھیں وہ دسویں (انکارِ آخرت کے) سب ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، کہنے کو تو یہ لوگ اپنے آپکو ”تورات“ کا پیرو کہتے تھے، مگر درحقیقت یہ اُس کے پیرو نہ تھے، تورات تو خود ہی اُن کے رحم و کرم پر تھی، یہ اس میں جس طرح اُن کا دل چاہتا تھا تصرف کرتے تھے، تورات میں ان کا تھرتین قسم کا تھا،

(۱) تحریف لفظی؛ یعنی یہ لوگ تورات کی آیتوں کا غلط ترجمہ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے،

(۲) تحریف معنوی؛ یعنی تورات کی آیتوں کا اپنی طرف سے گھڑ کر مطلب بیان کرتے اور اسی پر دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے؛

ہر نبی کی امت میں یہ بات معروف و مشہور رہی ہے کہ کافر اور فاسق ایک چیز نہیں، بلکہ دونوں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی جدا ہیں اور دونوں کا انجام بھی مختلف ہے، کافر وہ جو دینِ فطرت کے بنیادی حقائق مثلاً توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان نہ رکھتا ہو، ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذابِ جہنم کا مستحق ہوتا ہے، اور فاسق وہ ہے جو ان بنیادی چیزوں پر ایمان رکھنے کے باوجود عمل اور کردار کے اعتبار سے اپنے آپ کو دینِ فطرت کے مطابق نہ بنا سکا ہو، اور ان چیزوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہو جو دینِ فطرت نے شدت کے ساتھ ممنوع قرار دی ہیں، ایسا شخص دائمی عذاب کا مستحق نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی سزا بھگتے کے بعد جنت میں چلا جائے گا، — تورات میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا تھا کہ جو شخص حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آیا ہے

وہ جنت کا مستحق مزدور ہے اور اگر دوزخ میں جائے گا بھی تو عارضی طور پر، اس کا مطلب یہی تھا کہ جو شخص دین فطرت کے بنیادی تصورات سے متفق ہوتے ہوئے اپنے زمانے کے رسول پر ایمان لے آئے گا وہ اس مرتبے کا مستحق ہوگا۔ یہودیوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ ہماری نجات کے لئے بھی بس حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا کافی ہے اور اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو کوئی حرج نہیں،

وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا آيَاتُ مَا مَعَكَ ذَاتِ ط (آل عمران: ۳۴)

”اور انھوں نے کہا کہ ہمیں آگ نہیں چھو سکے گی مگر تھوڑے دن“

قرآن کریم نے اس پر واضح انداز میں رد کرتے ہوئے فرمایا:-

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرة: ۸۱)

”کیوں نہیں جس شخص نے کوئی بُرا کام کیا اور اس کی بُرائی اُس پر چھ گئی“

تو ایسے لوگ آگ کے مستحق ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

(۳) یہودیوں کی تیسری گمراہی یہ تھی کہ وہ تورات کی بہت سی آیتوں کو چھپاتے تھے، تاکہ دنیا والوں میں اُن کا بلند مرتبہ برقرار رہے، انھیں خطرہ تھا کہ اگر اس قسم کے احکام لوگوں کو معلوم ہو گئے اور انھوں نے یہ دیکھا کہ ہمارے علماء اُن پر عمل نہیں کرتے تو وہ اُن سے بداعتقاد ہو جائیں گے، اور عزت و شرف کا جو مقام انھیں حاصل ہے، وہ جاتا رہے گا،

چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت والی آیتیں وہ آیتیں جنہیں ان کی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا چھپا رکھی تھیں اور آپس میں یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ دیکھو یہ باتیں کسی مسلمان کو نہ بتا دینا، قرآن کریم نے ان کی اس چہالت کا جگہ جگہ پردہ چاک کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں کہ:-

أَنَحْنُ نُؤْمِنُ بِمَا نَقُولُ اللَّهُ عَلَيْنَا لِيُحَاجُّكُمْ بِهِ عِنْدَ

رَبِّكُمْ (بقرہ: ۷۶)

”کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کر دی ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تم کو مغلوب کر دیں گے تمھارے پروردگار کے پاس“

نصاریٰ | یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا متبع کہتے تھے، اُن کی سب سے پہلی گمراہی اُن کا ”عقیدہ تثلیث“ تھا، یعنی یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) تین اجزاء (واقائیم) ہیں، جو بعض اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں، اور بعض اعتبار سے مختلف، پہلا جز ”باپ“ ہے، دوسرا جز ”بیٹا“ اور تیسرا جز ”روح القدس“ ہے، اور بیٹے کا جز، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روپ دھار کر دنیا میں آیا تھا،

اللہ تعالیٰ نے جہالت کے اس مضحکہ خیز نظریہ کو علم کی روشنی سے رد فرمایا، اور جا بجا یہ جتلا دیا کہ یہ تو ایسی بے سرو پایا بات ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے پناہ مانگتے ہیں،

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ كُنْتُ لِلنَّاسِ آيَةً فَقَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً فَقَالَ اللَّهُ مَا كُنْتُ لِي بِعَاجِلٍ إِنَّ كُنْتُ قُلُوبَهُمْ فَهَكَذَا عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ... إِنَّ تَعَذُّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَلَنْ تَغْفِرَ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (المائدہ: ۱۱۶)

”اور جب کہ اللہ نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے بجائے معبود بنالو؟ انھوں نے کہا کہ (پروردگار!) آپ پاک ہیں میرے لئے یہ شایاں نہیں کہ وہ باتیں کہوں جن کا مجھے حق نہیں پہنچتا، اگر میں نے ان سے کہا ہوتا تو آپ ضرور جانتے، آپ وہ تمام باتیں جانتے ہیں جو میرے دل میں ہیں، اور میں وہ باتیں نہیں جانتا جو آپ کے دل میں ہیں بلاشبہ آپ مجھے ہوتے بھیروں کے جلانے والے ہیں... اگر آپ انھیں

عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں ہی، اور اگر آپ اُن کو بخش دیں تو بھی کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ آپ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں،
 بہت پرست مشرکین کی طرح یہ بھی انکار رسالت، تشبیہ اور تحریف کے مرتکب تھے،
 جس پر بار بار تنبیہ فرمائی ہے،

مَنَافِقِینَ | یہ اُن شریر، بدطینت، بزدل اور کم حوصلہ انسانوں کا گروہ تھا، جن کا دل تو کفر و شرک کے اہنی ٹہنوں سے آباد تھا، جنہیں دوسرے کفار کھلم کھلا پوجا کرتے تھے، مگر یہ بچا بچے اتنا حوصلہ نہ رکھتے تھے کہ علی الاعلان اپنے عقائد کا اعلان کر سکیں، اس لئے زبان سے توحید رسالت، اور یوم آخرت کا اقرار کرتے تھے، اور درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازش کے جال تیار کرتے رہتے تھے، ان میں سے بعض تو وہ تھے جو صرف سازش اور دغا بازی کے ارادہ سے کلمہ توحید پڑھتے تھے، مگر اُن کا دل کفر و شرک کی تمام شقاوتوں سے پُر تھا، اور بعض وہ تھے جو اپنے بڑے بڑوں کو اسلام لاتا دیکھ کر خود بھی زبان سے اسلام لانے کا اقرار کرتے تھے، گویا اُن کے نزدیک اصل مسئلہ اپنے بڑوں کی اتباع تھا، اگر وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر رہتے تھے اور اگر وہ مسلمان ہیں تو یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگتے تھے، چونکہ ان منافقوں کے کوئی مستقل عقائد نہیں تھے، بلکہ یہ زبان سے اپنے آپ کو اسلامی عقائد ہی کے پیرو کہتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ اُن کے عقائد پر رد کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ قرآن کریم نے اُن کی بدطینتی اور سازشی خصلت کو جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے، اور اُن کی خباثتوں کے پول کھولے ہیں، اس کے نمونے دیکھنے ہوں تو سورہ توبہ اور سورہ انفال پڑھ جائیے، ان دونوں سورتوں میں باری تعالیٰ نے اُن کی گندگیوں کو ایک ایک کر کے بیان فرمایا ہے،

احکام

قرآن کریم کا دوسرا مضمون ”احکام“ ہے، اس میں جن احکام کا ذکر کیا گیا ہے

انہیں ہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں :-

(۱) وہ احکام و قوانین جو خالص اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں، جنہیں مختصر الفاظ میں خالص "عبادات" کہا جاسکتا ہے، اس میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، شربانی اور حج کے احکام داخل ہیں، اور قرآن کریم نے ان چیزوں سے متعلق بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں،

(۲) وہ احکام و قوانین جو خالص بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، جنہیں ہم "معاملات" سے تعبیر کر سکتے ہیں، مثلاً تجارت، قصار، شہادت، امانت، گروی رکھنے، ذبیحہ جانوروں کو کھانے، مختلف مشروبات کے استعمال، وصیت اور میراث وغیرہ ان کے احکام خود قرآن کریم میں موجود ہیں،

(۳) وہ احکام و قوانین جو بعض حیثیت سے عبادت ہیں اور بعض حیثیات سے معاملہ اس نوع میں بنے نکاح و طلاق، حدود و تعزیرات (Criminal Laws) دیتا، قصاص (Torts)، جہاد، ایمان، قسمیں اور شرکت کے احکام قرآن کریم نے ذکر فرمائے ہیں،

قرآن کریم چونکہ دنیا کو ایک ایسا پاکیزہ نظام حیات دینا چاہتا ہے جس پر ہر زمانہ میں عمل کر کے انسان امن و سکون پاسکیں، اس لئے اس نے اپنے احکام نافذ کرتے وقت "تدریجی انداز" اختیار کیا، یعنی کوئی غیر متوقع حکم یکایک نہیں دیدیا، بلکہ پہلے اپنے اس حکم کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا، اور بعد میں اُسے نافذ فرمایا، اس کی ایک مثال شراب کی حرمت ہے، اہل عرب شراب کے ایسے متوالے تھے کہ ان کی زبان میں اس کے ڈھائی سو نام ہیں، ان سے اس خبیث عادت کو چھڑانا قرآن کریم ہی کا معجزہ ہے، جب شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی حلت و حرمت کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھا گیا، تو قرآن نے فوراً یہ نہیں فرمادیا کہ اسے چھوڑ دو بلکہ ارشاد ہوا :-

قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْ فَاحِشٌ لِلنَّاسِ وَاعْتَصِمَا
اَكْبَرُ مِنْ نَفْسِهِمَا، (البقرة: ۲۱۹)

”آپ کہہ دیجئے کہ ان (شراب اور جوئے) میں بڑا نقصان ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان کا نقصان اُن کے نفع سے زیادہ بڑا ہے“
 سلیم الفطرت انسان اسی سے سمجھ گئے کہ اس چیز کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد حکم نازل ہوا۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (النساء: ۴۲)
 نئے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ“

اب عام طور پر ذہنوں میں شراب کی ناپسندیدگی بیٹھ چکی تھی، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد واضح حکم نازل ہو گیا کہ:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَفْسَابُ وَالْأَنَامُ رَجَسٌ
 مِنَ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ، (المائدہ: ۹۰)

”بلاشبہ شراب، جوا، بُت اور لاٹری کے تیر گندگی کی چیزیں اور شیطان کا عمل ہیں، لہذا تم ان سے پرہیز کرو“

قرآن کریم میں جس قدر احکام مذکور ہیں وہ دو طریقے سے نازل ہوئے:-
 ۱) مسلمانوں یا کافروں میں کوئی غلط رواج تھا اس کو بدلنے کی

شان نزول

اللہ تعالیٰ نے خود ہی ضرورت محسوس فرمائی، اور اس کے لئے آیت نازل ہو گئی اس طرح بعض اوقات ایک ہی آیت نے کئی کئی غلط رسموں کو ختم کر دیا، مثلاً حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اہل عرب کا ایک معمول یہ تھا کہ اپنے زیر سر پرستی یتیم عورتوں کے مال و دولت اور حُسن و جمال کی وجہ سے اُن سے شادی کر لیا کرتے تھے، پھر اُن کو مال و نفقہ اور ہر اس معیار کا نہیں دیتے تھے جس معیار کا وہ دوسری عورتوں سے نکاح کرنے پر دیتے، حضرت ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ اہل عرب دس دس عورتوں سے بیکنے لگے شادی کر لیتے تھے اور جب اُن کے مصارف ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے تو اپنے زیر سر پرستی یتیموں کے مال میں خرد برد کرتے تھے، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ اہل عرب دس دس بیویاں رکھتے تھے، مگر ان کے

درمیان عدل و انصاف کا معاملہ نہیں کرتے تھے،

اہل عرب کے یہ تمام طرز ہائے عمل غلط تھے، اور اسلامی معاشرہ میں انہیں بدلنے کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جامع آیت نازل فرمادی جس نے ان تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیا،

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَنْفُسُوا فِي آلِهَتِكُمْ إِلَّا تَفْسَاطُ أَنْفُسِكُمْ
مَنْ الْيَتَامَىٰ وَتِلْكَ الْأَمْوَالُ لَوْلَا فَتَحْنَا بِهَا
فَوَاحِشًا، (نساء: ۳)

”اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یتیموں کے باپے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو دوسری عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کر لو، دوسرے تین تین سے، چار چار سے، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے، تو ایک ہی سے نکاح کر لو۔“

جو لوگ اپنی زیر پرورش یتیم عورتوں سے شادی کر کے انہیں بولے حقوق نہیں دیتے تھے، اس آیت نے انہیں یہ حکم دیدیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ تم انہی یتیم عورتوں سے شادی کرو، اللہ نے تمہارے لئے دوسری عورتوں میں سے چار تک نکاح کرنا جائز قرار دیا ہے، ان سے نکاح کر لو، جو لوگ دس دس عورتوں سے نکاح کر ڈالتے تھے اور ان کے مصارف سے کنگال ہو جانے پر یتیموں کے مال میں خرد بُرد کرتے تھے، انہیں شادی کی ایک معقول حد بتلا دی کہ چار سے آگے نہ بڑھو، تاکہ مصارف اتنے زیادہ ہی نہ ہوں کہ یتیموں کے مال میں گڑ بڑ تک نوبت پہنچے، اور جو لوگ دس دس بیویوں سے نکاح کر کے ان کے درمیان بے انصافی کے مجرم تھے، انہیں بھی یہ فرمادیا گیا کہ چار سے زیادہ شادیاں نہ کرو تاکہ عدل و انصاف پر قائم رہنا آسان ہو، اور اگر ان میں بھی بے انصافی کا خوف ہے تو بس ایک بیوی پر اکتفا کرو،

اس طرح اس ایک آیت نے بیک وقت کئی خرابیوں کا انسداد کر دیا،

(۲) احکام کے نازل ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا تھا کہ کسی خاص واقعہ کے

پیش نظر صحابہؓ نے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس پر آیت نازل ہو گئی، اس کی مثالیں اسباب نزول کے عنوان کے تحت پیچھے گزر چکی ہیں،

قِصَص

قرآن کریم کا تیسرا اور اہم مضمون ”قصص اور واقعات“ ہیں، قرآن کریم میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انہیں دو قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ واقعات جو ماضی سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق ہیں،

ماضی کے واقعات میں باری تعالیٰ نے زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے ہیں، اور ان کے علاوہ بعض نیک یا نافرمان افراد و اقوام کے واقعات بھی مختلف جگہوں پر ذکر کئے ہیں، قرآن کریم میں کُل ستائیس انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر فرمائے گئے ہیں جن کے اسمائے گرامی تاریخی ترتیب سے حسب ذیل ہیں:-

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت الیسعؑ، حضرت شموئیلؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام،

ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد و اقوام کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے:-

اصحاب الجنۃ، اصحاب القرۃ، حضرت لقمانؑ، اصحاب التبت، اصحاب الرین، حضرت ذوالقرنینؑ، اصحاب الکہف، الرقیم، قوم سبا، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، ان قصوں کو بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود تاریخ نگاری نہیں ہے، بلکہ

وہ ان قصوں کو یاد دلا کر ایک طرف تو تذکرہ و معظمت کا سامان ہوتا فرماتا ہے، اور مسلمانوں کو انبیاء کرام کی دعوت و عزیمت سے سبق لینے پر مجبور کرتا ہے اور دوسری طرف یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ سابقہ قوموں اور امتوں کے یہ بصیرت افروز سچے واقعات اس ذاتِ گرامی کی زبان پر جاری ہو رہے ہیں جو بالکل اُمتی ہے، اور اس نے آج تک کسی کے پاس رہ کر اس قسم کا کوئی علم حاصل نہیں کیا، اس لئے یقیناً اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باخبر کیا جاتا ہے، اور جو کلام وہ تلامذہ فرماتے ہیں وہ کوئی انسانی کلام نہیں خدا کا کلام ہے،

پھر ان قصوں کے درمیان علم و حکمت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں اور ان کی ہر آیت انسان کو زندگی کے ان گنت مسائل پر صحیح اور بہترین رہنمائی عطا کرتی ہے،

واقعات میں تکرار کیوں؟ | قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان سے متعلق عام طور پر ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے، کہ قرآن کریم میں

ایک ہی قصے کو بعض اوقات کسی کسی بار دہرایا گیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ کا واقعہ قرآن کریم میں بہتر مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اگر ایک قصہ ایک ہی جگہ بیان کر دیا جائے اور بقیہ مقامات پر احکام بیان ہو جاتے تو امت کے لئے شاید زیادہ آسانی کا موجب ہوتا اور بہت سے اختلاف ختم ہو جاتے،

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دراصل قصوں کو بار بار ذکر کرنے میں کئی حکمتیں ہیں، (۱) قرآن کریم دفعۃً ایک مرتبہ نازل نہیں ہوا، بلکہ تدریجاً اُتر رہا ہے، اور اس امت کیلئے اُتر رہا ہے جسے اپنے ابتدائی دور میں قدم قدم پر نئی آزمائشوں اور بے شمار تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اُس امت کی پوری زندگی ہی اپنی ترقی کے دور میں جہاد و قتال، حرب و ضرب، سرفروشی و جان بازی اور محنتوں میں گزری ہے، ایسی صورت میں اگر انھیں بار بار تسلی نہ دی جاتی تو وہ دل شکستہ ہو بیٹھتے، چنانچہ قرآن کریم نے ہر اُس موقع پر پچھلے انبیاء کے واقعات سنائے جہاں مسلمانوں کو دشواریاں پیش آئیں، اور بار بار انھیں یہ بتلایا کہ ان آزمائشوں میں تم تنہا نہیں ہو، بلکہ دعوتِ حق کا ہر قافلہ اُن کٹھن دادیوں سے گزر رہا ہے اور انجام کار ہمیشہ کامیابی و کامرانی نے اس کے

قدم چومے ہیں،

بہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک نبی کا واقعہ بھی قرآن حکیم میں یک جا نہیں ہوتا بلکہ اس کے متفرق حصے مختلف مقامات پر مذکور ہیں، جس موقعہ پر جس پیغمبر کے جس واقعے کی ضرورت ہوتی اس موقع پر اسی کو نازل فرمایا گیا،

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ قصوں کے اس تکرار سے یہ بات واضح انداز میں معلوم ہوتی ہے کہ قرآن حکیم جزئیات احکام بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوا، وہ احکام کے صرف اصول بیان فرماتا ہے، اور اس کا بنیادی مقصد عقائد کی اصلاح، تذکیر اور خوش کردار پر ابھارنا ہے، یہی قانونی جزئیات، سو وہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تشریح پر چھوڑ دیئے ہیں، اور انھیں وہ وحی غیر متلو کے ذریعے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے، قرآن کریم کا یہ طرز عمل ”حجیت حدیث“ پر ایک بڑی واضح دلیل ہے، کیونکہ اگر فقہ و قانون میں صرف قرآن حجت ہوتا اور احادیث حجت نہ ہوتیں، تو قرآن کریم میں بار بار قصے بیان کرنے کی بجائے احکام بیان فرمائے جاتے، اور قصوں کو وحی غیر متلو کے ذریعے بیان فرما دیا جاتا، ظاہر ہے کہ قصے بیان کرنے سے جو مقصد ہر وہ اس طرح بھی بدرجہ اتم پورا ہو جاتا، مگر باری تعالیٰ نے اس کے برعکس ترتیب رکھ کر گویا اس بات پر تنبیہ فرمادی ہے کہ قرآن عقائد و اخلاق کی تربیت کے لئے آیا ہے، اور صرف اصول احکام بیان فرماتا ہے، اور جزئیات کے بارے میں اس کا ارشاد یہ ہے:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا ۝ (النساء: ۶۵)

”پس نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم! وہ ایمان نہیں لاسکتے تا وقتیکہ وہ آپ کو

اپنے مختلف فیہ معاملات میں فیصلہ نہ بنالیں، اور پھر آپ کے فیصلے سے دل میں اپنے

کوئی تنگی محسوس نہ کریں (بلکہ) اسے خوب اچھی طرح تسلیم کر لیں“

(۳) قصوں کے مکرر ہونے میں ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے اعجاز قرآنی کا

مظاہرہ ہوتا ہے، انسان کی نفسیات کا تقاضا ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار سنتے رہنے سے اکتا جاتی ہے، اور چند مرتبہ کے بعد ایک اچھے خاصے واقعے میں بھی اُسے کوئی حظ یا لطف محسوس نہیں ہوتا، مگر قرآن کریم اگرچہ ایک ہی واقعے کو بار بار ذکر فرماتا ہے، مگر اس میں ہر بار نئی لذت اور ہر مرتبہ نیا کیفیت محسوس ہوتا ہے، یہ بات انسان کو بیسیختہ اس نتیجے تک پہنچے پر مجبور کر دیتی ہے کہ یہ کلام یقیناً کسی بشری دماغ کا جنم دیا ہوا نہیں ہے،

مستقبل کے واقعات | قرآن کریم نے پیش گوئی کے طور پر مستقبل کے واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں، اس قسم کے واقعات میں قیامت کی نشانیاں، قیامت کے احوال، حشر و نشر کا منظر، دوزخ کی ہولناکیاں اور جنت کی دل فرمایاں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ قیامت سے پہلے زمین سے ایک بولتے ہوئے جانور کا نمودار ہونا، یا جرج و ماجرج کا خروج، صور اسرافیل، سوال و جواب اور جہنمیوں کے باہمی مکالمے قرآن کریم میں متحدہ جگہوں پر موجود ہیں،

امثال

قرآن کریم میں جو امثال مذکور ہوئیں ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ امثال جو کسی بات کو سمجھانے کے لئے تمثیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، مثلاً:

مَثَلُ الَّذِينَ يُبْغُونَ آمَوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ
أُتْبِتَتْ سَبْعَ سَنَاطِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةَ حَبَّةٍ، (البقرہ: ۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی حالت اُس بیج کی سی ہے جس نے سات خوشے اُگائے ہوں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوں۔

بتلانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا بدلہ آخرت میں سات سو گنا بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ملے گا، انسانی عقل اس کو ذرا بعید سمجھ سکتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا دیا، کہ جس طرح زمین میں ڈالایا ایک بیج درخت پر سات سو نئے بیج لے کر نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں خرچ

کیا ہوا مال آخرت میں سات سو گنا بڑھ کر انسان کو ملے گا،
 اس قسم کی تمثیلات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور موثر بنانے کے لئے لائے
 گئے ہیں، امثال کی دوسری قسم وہ ہے جسے اردو میں ”کہادت“ کہتے ہیں، اس قسم کی
 امثال قرآن کریم میں دو طرح مذکور ہوئی ہیں، بعض تو وہ ہیں جو نزولِ قرآن کے
 بعد ہی کہادت بنیں، گویا اُن کا موجد ہی قرآن ہے، مثلاً:-
 هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانِ (رحمن: ۶۰)
 اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“

اور :-

وَأَنْ تَذَكَّرُوا الْآخِرَ رَبِّ لِلتَّقْوَى (البقرہ: ۲۳۷)
 اور معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے

کہادتوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں صراحت کوئی کہادت تو مذکور نہیں، مگر
 آیت کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا یہ تو عوامی ضرب الامثال کا سرچشمہ ہیں، یا اُن کی نظر
 دلالت کرتی ہے، ایسی امثال کو ”امثالِ کامنہ“ کہا جاسکتا ہے، اس کی قرآن کریم میں
 بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً ایک عربی کہادت مشہور ہے کہ :-
 كَيْسَ الْخَبَرَ كَالْأَعْيَانِ
 شنبہ کے بودمانند دیدہ

یہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
 نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ ”آپ مجھے دکھلائیے کہ آپ مُردے کو زندہ کس طرح
 کرتے ہیں؟“ اس پر باری تعالیٰ نے پوچھا: ”کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟“ تب
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا :-

بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيُظْمَیْنَ وَلِیُحْیَی

”کیوں نہیں؟ (میں ایمان رکھتا ہوں) مگر
 رہنے پر درخواست اس لڑکی کی ہو کہ میرا دل مطمئن ہوگا“

اسی طرح مثل مشہور ہے :-
 لَا يُكْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ مُحْرَمَاتَيْنِ
 ”مسلمان کو ایک سوراخ سے دوسرے
 نہیں ڈسا جاسکتا“

یہ سورۃ یوسف کی آیت میں موجود ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے
 ماں شریک بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد
 حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھی بھیج دیجئے،
 تو انھوں نے فرمایا :-

هَلْ أَتَاكُمْ عَلَيْهٖ إِلَّا كَمَا أَتَاكُمْ
 عَلَىٰ أَخِيهِ (یوسف : ۶۴)

”کیا میں تمہیں اس کے بارے میں ایسا ہی امانت دار
 سمجھوں جیسا کہ اس کے بھائی کے بارے میں سمجھا تھا؟“

علمِ تفسیر

• — تعارف

• — اصول

• — تاریخ

باب اول

علم تفسیر اور اس کے مآخذ

تعارف؛

لفظ ”تَفْسِیْرٌ“ در اصل ”قَسْرٌ“ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں ”کھولنا“ اور اس علم میں چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے، اس لئے اسے ”علم تفسیر“ کہتے ہیں چنانچہ قدیم زمانے میں تفسیر کا اطلاق قرآن کریم کی تشریح ہی پر ہوتا تھا، اور بعد رسالت سے قرب اور علوم کے اختصار کی بنا پر اس علم میں زیادہ شاخیں نہیں تھیں، لیکن جب اس نے ایک مدون علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اُس کی خدمت کی گئی تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلدار علم بن گیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں تفصیلاً کا اضافہ ہوتا چلا گیا، اب ”علم تفسیر“ جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے :-

”لہ چنانچہ علامہ زرکشی نے علم تفسیر کی مختصر تعریف یہ کی ہے: ”علم یعرف بہ ذہم کتاب اللہ المنزل علی نبیہ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم و بیان معانیہ واستخراج احکامہ وحکمہ“ یعنی ”وہ علم جس سے قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے“ (البرہان، ص ۱۳ ج ۱)

عِلْمٌ يَبْعَثُ فِيهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ التَّحْلُفِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ وَمَوْلَا
وَأَحْكَامَهَا الْإِفْرَادِيَّةَ وَالتَّرْكِيْبِيَّةَ وَمَعَانِيَهَا الَّتِي تُحْمِلُ عَلَيْهَا
حَالَةَ التَّرْكِيْبِ وَتَتَمَاسَتُ لَهَا لَفْظًا

”علم تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، اُن کے مفہوم، اُن کے
افزادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی
حالت میں مراد لئے جاتے ہیں، نیز اُن معانی کا تحمل، ناسخ و منسوخ، شان نزول اور
مبہم قصوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔“

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:-
۱۔ ”الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے“ یعنی الفاظِ قرآن کو کس کس طریقے سے
پڑھا جاسکتا ہے؟ اسی کی توضیح کے لئے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت
کے ساتھ اس کی تشریحات بھی تفصیل سے واضح کرتے تھے، اور اس مقصد کے لئے
ایک مستقل علم ”قرآت“ کے نام سے بھی موجود ہے، جس کا مختصر تعارف پچھلے صفحات
میں آچکے ہیں،

۲۔ ”الفاظِ قرآنی کے مفہوم“ یعنی اُن کے لغوی معنی، اس کام کے لئے علم لغت
سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے، اور اسی بنا پر تفسیر کی کتابوں میں علماء لغت
کے حوالے اور عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں،

۳۔ ”الفاظ کے انفرادی احکام“ یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا
مادہ کیا ہے؟ یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے؟ اس کا وزن کیا ہے؟ اور اس
وزن کے معانی و خواص کیا ہیں؟ ان باتوں کے لئے ”علم صرف“ کی ضرورت پڑتی ہے،
۴۔ ”الفاظ کے ترکیبی احکام“ یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ دو

الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے؟ اس کی نحوی ترکیب (Grammatical
Analysis) کیا ہے؟ اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں؟ اور

لہ رُوح المعانی، للآلوسی، ص ۴ ج ۱،

کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں؟ اس کام کے لئے علمِ نحو اور علمِ معانی سے مدد لی جاتی ہے،
 ۵۔ ”ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی“ یعنی پوری آیت اپنے سیاق و سباق
 میں کیا معنی دے رہی ہے؟ اس مقصد کے لئے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علوم
 سے مدد لی جاتی ہے، مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علمِ ادب اور علمِ بلاغت سے کام
 لیا جاتا ہے، بعض اوقات علمِ حدیث سے اور بعض اوقات علمِ اصولِ فقہ سے،
 ۶۔ ”معانی کے تھلے“ یعنی آیاتِ قرآنی کا پس منظر اور وجوہات، قرآن کریم میں محفل ہے
 اس کی تفصیل، اس غرض کے لئے زیادہ تر علمِ حدیث سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے
 علاوہ بھی یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیا کے ہر علم و فن کی معلومات کھپ سکتی ہیں
 کیونکہ بسا اوقات قرآن کریم ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرماتا ہے مگر اس میں حقائق و
 اسرار کی ایک غیر متناہی کائنات پوشیدہ ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-
 وَفِي آتِفْسِكُمْ أَفْكَ لَا تُبْصِرُونَ (ذاریات)

”اور تم اپنی جانوں میں غور کرو، کیا تم نہیں دیکھتے؟“ Physiology
 غور فرمائیے کہ اس مختصر سے جملے کی تشریح و تفصیل میں پورا علمِ الابدان ()
 اور پورا علمِ نفسیات (Psychology) سما جاتا ہے، اس کے باوجود یہ
 ہمیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمتِ بالغہ کے جن اسرار کی طر
 اشارہ فرمایا ہے وہ سب پورے ہو گئے، میں، چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جُز میں عقل و تدبیر
 تجربات و مشاہدات کے ذریعے انتہائی متنوع مضامین شامل ہو جاتے ہیں،

تفسیر اور تاویل؛

قدیم زمانے میں ”تفسیر“ کے لئے ایک اور لفظ ”تاویل“ بھی بکثرت استعمال ہوتا
 تھا اور خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لئے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، ”وَمَا يَعْلَمُ
 تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ اس لئے بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں لفظ بالکل
 ہم معنی ہیں، یا ان میں کچھ فرق ہے؟
 امام ابو عبیدہؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ بالکل مرادف ہیں اور دوسرے

حضرات نے ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی، لیکن دونوں میں فرق بتانے کے لئے اتنی مختلف آراء ظاہر کی گئی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً چند اقوال یہ ہیں:-

- ۱۔ ”تفسیر“ ایک لفظ کی انفرادی تشریح کا نام ہے، اور ”تاویل“ جملے کی مجموعی تشریح کا،
- ۲۔ ”تفسیر“ الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور ”تاویل“ اصل مراد کی توضیح کو،
- ۳۔ ”تفسیر“ اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال نہ ہو، اور ”تاویل“ کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریحات ممکن ہیں ان میں سے کسی ایک کو دلیل کے ساتھ اختیار کر لیا جائے،

۴۔ ”تفسیر“ یقین کے ساتھ تشریح کرنے کو کہا جاتا ہے، اور ”تاویل“ تردد کے ساتھ تشریح کرنے کو،

۵۔ ”تفسیر“ الفاظ کا مفہوم بیان کر دینے کا نام ہے، اور ”تاویل“ اس مفہوم سے بچنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کا، وغیرہ وغیرہ،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابو عبیدہ ہی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، کہ ان دونوں لفظوں میں استعمال کے لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں، جن حضرات نے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے شدید اختلافِ آراء پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی معیث اور اتفاقی اصطلاح نہیں بن سکی، اگر ان میں حقیقۃً فترق ہوتا تو ایسے شدید اختلاف کے کوئی معنی نہیں تھے واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل علم نے ”تفسیر“ اور ”تاویل“ کو الگ الگ اصطلاحات قرار دینے کی کوشش کی ہوگی، لیکن اس میں ایسا اختلاف رونما ہوا کہ کوئی بھی اصطلاح عالمگیر قبولیت حاصل نہ کر سکی، یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے مفسرین ان الفاظ کے ساتھ عموماً ہم معنی الفاظ کا سا معاملہ کرتے آئے ہیں، اور ایک کو دوسرے کی جگہ بلا تکلف استعمال کیا جاتا رہا ہے، لہذا اس بحث میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے،

تفسیر کے مآخذ

”علم تفسیر“ کے اس مختصر تعارف کے بعد سب سے ضروری بحث یہ ہو کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا ذرائع ہیں جن سے ہم کسی آیت کی تفسیر معلوم کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ آیات قرآنی دو قسم کی ہیں، بعض آیات تو اتنی صاف واضح اور آسان ہیں کہ جو زبان جاننے والا انھیں پڑھے گا، اُن کا مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا، اسی لئے ایسی آیتوں کی تفسیر میں کسی اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسی آیات کی تفسیر کا مآخذ تو صرف لغت عرب ہے، عربی زبان پر ماہرانہ نظر اور عقل سلیم کے سوا اُن کا مطلب سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن دوسری قسم اُن آیات کی ہے جن میں کوئی اجمال، ابہام، یا تشریحی دشواری پائی جاتی ہے، یا اُن کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُن کے پورے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یا اُن سے دقیق قانونی مسائل یا گہرے اسرار و معارف مستنبط ہوتے ہیں، ایسی آیات کی تشریح کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے بہت سی معلومات کی ضرورت ہے، آگے اسی قسم کی آیات کی تفسیر کے مآخذ بیان کئے جا رہے ہیں :-

اس لحاظ سے تفسیر قرآن کے کُل چھ مآخذ ہیں: خود قرآن کریم، احادیث نبویہ، صحابہ کرامؓ کے اقوال، تابعینؓ کے اقوال، لغت عرب اور عقل سلیم، ذیل میں ان تمام مآخذ کی تھوڑی سی تفصیل اور علم تفسیر میں اُن کے مقام کے بارے میں چند مباحث پیش خدمت ہیں :-

لہ والحق ان علم تفسیر منہ ما يتوقف على النقل... ومنہ ما لا يتوقف الخ (البرہان للزركشي) ص ۱۷ ج ۲ نوع ۴، فصل، بعد کلام الصوفیہ فی القرآن، والاتقان، ص ۸۳ ج ۲ نوع ۴ آخر الکلام علی تفسیر الرازی

پہلا ماخذ، خود قرآن کریم

تفسیر قرآن کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے، یعنی اُس کی آیات بعض اوقات ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتی ہیں، ایک جگہ کوئی بات مبہم انداز میں کہی جاتی ہے، اور دوسری جگہ اس ابہام کو رفع کر دیا جاتا ہے، مثلاً سورۃ فاتحہ میں ارشاد ہے :-

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ (الفاتحہ)

”ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کیجئے، اُن لوگوں کے راستے کی جن پر
آپ نے انعام فرمایا“

یہاں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، اُن سے کون لوگ
مراد ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے :-

فَاُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالشّٰهِيْدِۃِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۝ (نساء: ۶۹)

”یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین،
شہداء اور نیک لوگ“

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے :-

فَتَلَقَّىٰ اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهِ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ (البقرہ: ۳۷)

”پس آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے اُن کو توبہ
قبول کر لی“

لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے؟ دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت
فرمادی گئی، ارشاد ہے :-

قَالَ رَبَّنَا اٰطَعْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ كُنَّا نَعْفُوْهُ وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اعراف: ۲۳)

”انھوں نے (آدم وحوئے) کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی
جانوں پر ظلم کیا ہے، اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم
نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے“

نیز ایک مقام پر ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝ (التوبة: ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ”سچے لوگوں“ سے کون مراد ہیں؟ لیکن ایک دوسری آیت میں
اس کی تشریح فرمادی گئی ہے، ارشاد ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا
عَاهَدُوا ۚ وَالصَّادِقِينَ فِي الْبُيُوتِ وَالصَّاعِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

(البقرة: ۱۷۷)

”کچھ ساری نیکی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو، لیکن (اسی)
نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے، اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر
اور (آسمانی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں
کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں
یا غلاموں کی) گردن چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو
اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں اور صبر کرنے والے ہوں
منگدستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے وقت، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ متقی ہیں۔“

اس آیت نے یہ بات واضح فرمادی کہ ”صادقین“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں، یہ صرف تین مثالیں تھیں، قرآن کریم میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں،

۱۔ ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی دوسری شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی بات اس کی ایک قرارت میں مبہم ہوتی ہے اور دوسری قرارت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، مثلاً ایک قرارت میں وضو کا طریقہ بیان فرماتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَآيِدَيْكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَ
امْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ط (المائدہ: ۶)

عربی گرامر کی روش سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-
”تم اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو، اور اپنے سروں کا

مسح کر لو، اور پاؤں دھو لو،

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-

”اپنے سروں کا اور پاؤں کا مسح کرو“

لیکن دوسری قرارت میں ”وَأَرْجُلَكُمْ“ کے بجائے ”وَأَرْجُلَكُمْ“ آیا ہے، اس قرارت میں اس کے سوا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا کہ ”اپنے پاؤں دھو لو“ لہذا اس قرارت نے یہ واضح کر دیا کہ پہلی قرارت میں بھی پاؤں دھونے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور اس میں مسح کرنے کا جو ترجمہ ہو سکتا ہے وہ مراد نہیں ہے،

اس طرح متواتر قرار توں کی روشنی میں تشران کریم کی جو تفسیر کی جائے وہ یقینی اور قطعی ہوتی ہے، مشہور ترا توں سے اگرچہ علم یقینی تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن تفسیر میں اُن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن شاذ ترا توں کے بارے میں اہل علم کی رائے مختلف ہیں، بعض حضرات انھیں تفسیر میں کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور بعض حضرات انھیں ”خبر واحد“ کے درجے میں قبول کرتے ہیں، اس مسئلے کی پوری تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے،

۳۔ ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی تیسری صورت یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر مطلوب ہے خود اسی کے سیاق و سباق (Context) پر غور کیا جائے، اس طرح بسا اوقات آیت کے کسی حل طلب مسئلے کی تشریح واضح ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ احزاب میں اقہات المؤمنین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْأُولَىٰ، (الاحزاب: ۳۳)

”اور تم اپنے گھروں میں مترار سے رہو، اور قدیم زمانہ جاہلیت کے

دستور کے مطابق بے پردہ مت بھرد“

بعض اصول شرعیہ سے ناواقف لوگوں نے یہ دیکھ کر یہاں خطاب ازواجِ مطہرات کو ہو رہا ہے، یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا یہ حکم صرف ازواجِ مطہرات ہی کے ساتھ مخصوص تھا عام عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لیکن قرآن کریم کا سیاق و سباق اس دعوے کی تردید کر رہا ہے، اسی آیت کے آگے اور پیچھے ازواجِ مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کئی احکام مذکور ہیں، اور وہ یہ کہ: بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو، نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، ان احکام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسری عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لہذا ان بہت سے احکام کے بیچ میں سے صرف ایک جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عام عورتوں کے لئے نہیں ہے، دوسری آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ وغیرہ کے علاوہ قرآن کریم کے سیاق و سباق کے بھی بالکل خلاف ہی حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے احکام تمام مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، اور یہاں خاص طور سے ازواجِ مطہرات کو خطاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ ان پر احکام شرعیہ کی ذمہ داری زیادہ ہے، انہیں ان احکام کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے، اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَإِذَا سَأَلَ لَتَمُوتُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَلُّوهُنَّ مِنْ وَرَائِكُمْ حِجَابًا (الاحزاب: ۵۳)
 اور رانے سلوانو، جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے کوئی سامان
 مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔

اس آیت کے بارے میں بھی بعض ناواقف لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف ازواجِ
 مطہرات کے ساتھ مخصوص ہی حالانکہ اسی آیت کا اگلا جملہ وضاحت کر رہا ہے کہ
 اس حکم کا اطلاق تمام عورتوں پر ہوتا ہے، ارشاد ہے:-

ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ط (الاحزاب: ۵۳)

”یہ طریقہ تمہاری دلوں کے لئے بھی اور ان کے دلوں

کے لئے بھی زیادہ پاکیزگی کا سبب ہے۔“

اب ظاہر ہے کہ دلوں کی پاکیزگی صرف ازواجِ مطہرات ہی کے لئے مطلوب نہیں،
 بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے مطلوب ہے، اس لئے آیت کے حکم کو کچھ خاص عورتوں
 میں منحصر کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

اسی طرح سورۃ احزاب ہی میں ارشاد ہے:-

اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ

الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ط (الاحزاب: ۳۳)

”اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دور کر دے

اور تم کو خوب اچھی طرح پاک کر دے۔“

بعض لوگوں نے اس آیت کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ ”اہل بیت“ سے مراد صرف آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد وغیرہ ہیں، ازواجِ مطہرات اس میں داخل نہیں لیکن
 قرآن کریم کا سیاق و سباق اس نظریہ کی واضح تردید کرتا ہے، کیونکہ اس آیت
 کے آگے اور پیچھے تمام تر خطاب ازواجِ مطہرات کو ہو رہا ہے، اس لئے یہ کیسے

لہ پردے کے حکم کے عام ہونے پر اور بھی بہت سے واضح دلائل ہیں، یہاں بطور مثال
 صرف سیاق و سباق کو پیش کیا گیا ہے،

ممكن ہے کہ وہ ”اہل بیت“ کے مفہوم میں داخل نہ ہوں؟ خاص طور سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:-

وَالَّذِينَ كُونُوا يُشْكِيَانِي وَيُقْبِلُونَنِي (الاحزاب: ۳۴)

”اور (اے ازواجِ نبویؑ) تمہارے گھروں میں جو تلاوت ہوتی

ہے اُسے یاد کرو“

اس میں لفظ ”بیوت“ نے واضح کر دیا کہ پچھلی آیت میں ”أَهْلُ الْبَيْتِ“ کے مفہوم میں ازواجِ مطہرات تو سب سے پہلے داخل ہیں، انھیں اس آیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا یہ صرف چند مثالیں تھیں، ورنہ قرآن کریم پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کے بہت سے حل طلب مسائل سیاق و سباق کو دیکھ کر حل ہو جاتے ہیں، البتہ کبھی سیاق و سباق سے آیت کی تفسیر اتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اُسے کوئی بھی معقولیت پسند آدمی رد نہیں کر سکتا، ایسی تفسیر قطعی اور یقینی ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ سیاق و سباق کی مدد سے جو تفسیر کی جاتی ہے وہ اتنی واضح نہیں ہوتی، چنانچہ اُسے قبول کرنے یا رد کرنے میں مجتہد علماء کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں،

یہ تفسیر القرآن بالقرآن کا اجمالی تعارف تھا، بعض حضرات نے ایسی پوری تفسیر بھی لکھی ہے جن میں ہر آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کا التزام کیا گیا ہے، اس قسم کی ایک تفسیر علامہ ابن جوزیؒ نے لکھی ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں اس کا ذکر کیا ہے،

اسی نوعیت کی ایک گر اندر کتاب مدینہ طیبہ کے ایک عالم شیخ محمد امین بن محمد بن شنفیطی (رحمۃ اللہ علیہ) نے چند سال پہلے تالیف کی ہے، جو ”أَضْوَاءُ الْبَسِيَانِ فِي إِيضَاحِ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہیں،

۱۔ الاتقان، ص ۱۰۵ ج ۲ نور ۷۷،

۲۔ أضواء البسیان، ص ۲ تا ۳، ج ۱، مطبوعہ دارالاصغفانی، جلد ۳۷۵ھ،

دوسرا ماخذ، احادیث نبویؐ

تفسیرِ قرآن کا دوسرا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح فرمایا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد یہی تھا کہ آپ اپنے قول و فعل سے آیاتِ قرآنی کی تفسیر فرمائیں چنانچہ سورۃ نحل میں ارشاد ہے :-

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُرِّيتُ بِهِ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ، (النحل: ۴۴)

اور ہم نے قرآن آپ پر اسی لئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں و سناحت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں۔
اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ آپ کا مقصد بعثت یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں، نیز ارشاد ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (آل عمران: ۱۶۴)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا، جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک و صاف بنائے، اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی تعلیم دے، اگرچہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔“

نیز سورۃ نساء میں ارشاد ہے :-

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بِهِ النَّاسَ بِمَا آدَّبَ اللَّهُ، (نساء: ۱۰۵)

”بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ آپ، لوگوں کو

درمیان آن رہدایات، کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہیں

اور سورۃ نحل میں ارشاد ہے :-

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا لَكَبِيرَاتٍ لَّهُمْ الَّتِي
اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّٰمِنُوْنَ ۝

اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر اس لئے کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں
کھول کھول کر بتادیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور تاکہ یہ کتاب

ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت کا سبب ہو۔

ان آیات میں خود قرآن کریم نے یہ واضح فرما دیا ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ دنیا کو
قرآن کریم کی ہدایات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں، اور اس کے مطابق
زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائیں، اس لئے خود قرآن کریم ہی سے یہ بات ثابت
ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات تفسیر قرآن کا اہم ترین ماخذ ہیں،

یوں بھی اس بات کے لئے لمبی چوڑی منطق کی ضرورت نہیں کہ کسی آسمانی کتاب
کی صحیح تشریح اس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے جن پر وہ کتاب نازل ہوئی، اس دنیا میں
اس سے بڑا الحق کوئی نہیں، ہو سکتا، جو یہ کہے کہ قرآن کریم نازل تو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم پر ہوا تھا، لیکن اس کی تفسیر میں زیادہ جانتا ہوں،

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت تو مسلم ہے، مگر چونکہ وہ ارشادات ہم تک
قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچے، اس لئے ہم ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے،

لیکن اس مغالطے کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معلم بنا کر بھیجا اور بار بار یہ واضح فرمایا کہ آپ کو کتاب اللہ کی تشریح
و توضیح کے لئے بھیجا جا رہا ہے، اس لئے قیامت تک تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ
آپ کی تعلیمات کی پیروی کریں، اور دوسری آپ کی تعلیمات و تشریحات کو قیامت

تک باقی رکھنے کا کوئی محفوظ انتظام نہیں فرمایا، کیا یہ بات کوئی ایسا شخص کہہ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہو؟ اور جس نے قرآن کریم میں یہ آیت پڑھی ہو کہ:-

لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وِثْرَةً،

اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے باہر کام

کا مکلف نہیں کرتا۔

بعض لوگ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے لئے تو معلم قرآن تھے، لیکن ہمارے زمانے میں (معاذ اللہ) آپ کی تعلیمات کی ضرورت نہیں رہی، لیکن اس بے ٹکلی بات کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام جن کی مادری زبان عربی تھی جو اس کے ایک ایک لفظ کا لغوی اور محاوراتی معنی جانتے تھے، جو نزول قرآن کے پورے ماحول سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس سے عملاً گزر رہے تھے، اور جو ایک ایک آیت کے پورے پس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، انہیں تو کسی پیغمبر کی تعلیم کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا، اور ان کے مقابلہ میں اس زمانے کے لوگ جن کی نہ مادری زبان عربی ہے، نہ نزول قرآن کا ماحول سننے ہے اور نہ اس کے پس منظر سے آگاہ ہیں ان کو قرآن کریم کی تفسیر جاننے کے لئے کسی پیغمبر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟ اگر ذہن میں عقل و خرد اور دل میں عدل و انصاف کی ادنیٰ رُمق باقی ہو تو اس بے سرو پات بات کو کون باور کر سکتا ہے؟

یہ ایک بڑا مفصل موضوع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں وہ کتنے قابل اعتماد ہیں؟ اس موضوع کی تحقیق کے لئے علم حدیث اور اسما و الرجال کے پورے کتب خانے موجود ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات کے لئے زبردستی شرعی جواز ڈھونڈنے کی بات تو الگ ہے، لیکن اگر سچے دل ان علوم کا مطالعہ کیا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو یوں ہی رہتی دنیا تک واجب الاتباع قرار نہیں دیا بلکہ اُنکی

حفاظت کا انتظام فرمایا ہے کہ اس کی تفصیلات، دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، حدیث کے دوسرے شارح و رشاخ علوم کو چھوڑ کر صرف ایک اسماء الرجال کے علم ہی کو دیکھ بیچے تو وہ اس امت کا ایسا قابل فخر اور مجید العقول کا زامہ ہو جس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے زمانے تک جس کسی شخص نے کوئی حدیث کہیں بیان کی ہے، اس علم کی کتابوں میں اس کا پورا کچھ چٹھا و سناحت کے ساتھ موجود ہے، کہ وہ کہاں پیدا ہوا؟ کس کس سے احادیث کا علم حاصل کیا؟ کن کن راویوں سے اس کی ملاقات ہوئی؟ اس کا عام کردار کیسا تھا؟ قوتِ حافظہ کس درجہ کی تھی؟ روایت بیان کرتے ہوئے احتیاط کو کس حد تک مد نظر رکھتا تھا؟ اُس کے ہم عصر اور بعد کے علماء نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے؟ آج بھی حدیث کی کسی کتاب میں جس حدیث کے جس راوی کا نام چاہئے نکال لیجئے، اسماء الرجال کی کتابوں میں اُس کے متعلق مذکورہ بالا سوالات کا جواب مل جائے گا،

یہاں حدیث کی حفاظت کے موضوع پر کوئی مفصل بحث پیش نظر نہیں، اس کے لئے تدریس حدیث پر لکھی ہوئی بہت سی مبسوط کتابیں موجود ہیں، لیکن یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے انکار و اعتراض ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس پر قرآن کریم، عقلِ عام اور واقعاتِ تاریخ کسی بھی اعتبار سے غور کیجئے نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ اس کی بنیاد میں عقولیت کا کوئی چھینٹا بھی نہیں پڑا،

البتہ یہ درست ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایا ملتی ہیں، لہذا جو روایت جہاں مل جائے اُسے پڑھ کر کوئی فیصلہ کر لینا درست نہیں، بلکہ اسوۂ حدیث کے مطابق اُسے اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے، کہ وہ ان اسوۂ پر پوری اُترتی ہے یا نہیں، خاص طور سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں ان کی چھان بھٹک اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسرین نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں صرف جمع کر دی ہیں، محدثانہ طریقے پر ان کی تحقیق و تفتیش کی بحث کو نہیں

چھیڑا، لہذا ان روایات سے ٹھیک ٹھیک استفادہ وہی شخص کر سکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر ماہرانہ نگاہ رکھتا ہو، اور جسے صحیح و سقیم روایات کو پرکھنے کے اصول معلوم ہوں۔

تیسرا مأخذ، اقوال صحابہ رضی

جن حضرات نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی وہ صحابہ کرامؓ ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیاں اسی کام کے لئے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم، اُس کی تفسیر اور متعلقات کو براہ راست آپ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہل زبان بھی تھے، اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انھوں نے اپنی زباں دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ سے پڑھا، امام ابو عبد الرحمن سلمیٰؒ مشہور تابعی عالم ہیں وہ فرماتے ہیں :-

حَدَّثَنَا الَّذِينَ كَانُوا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَ
عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَغَيْرِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا تَعَلَّمُوا مِنَ
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ آيَاتٍ لَمْ يَتَجَاوَزُوا هَا حَتَّى
يَعْلَمُوا مَا فِيهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ ۝

صحابہ کرامؓ میں سے، جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ سے دس آیتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک کہ ان آیتوں کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کر لیں۔

اسی لئے مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں :-

كَانَ الرَّجُلُ إِذَا قَرَأَ الْبَقَرَةَ وَالْإِنشِرَاءَ فِي آخِرِ آيَاتِهَا

جب کوئی شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت

قابل احترام ہو جاتا تھا۔

اور موطاً امام مالک میں روایت ہے کہ :-

أَقَامَ ابْنُ عُمَرَ عَلَى حِفْظِ الْبَقَرَةِ شَتَاً وَسَيِّمًا ۖ

”حضرت عبداللہ بن عمرؓ آٹھ سال تک صرف سورہ بقرہ یاد کرتے رہے۔“

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ایسے ضعیف الحافظہ نہیں تھے کہ سورہ بقرہ کے محض الفاظ

یاد کرنے میں اُن کے آٹھ سال خرچ ہو جائیں، یقیناً یہ مدت اسی لئے صرف ہوئی کہ وہ

الفاظِ قرآنی کو یاد کرنے کے ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ متعلقات کا علم حاصل کر رہے؛

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں :-

وَالَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ مَا تَزَلْتُ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللَّهِ إِلَّا وَآتَا

أَعْلَمُ فِيمَنْ تَزَلْتُ وَآيَنْ تَزَلْتُ، وَلَوْ أَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمُ

بِكِتَابِ اللَّهِ مِثْلِي تَنَالُهُ الْمَطَايَا لَا يَكْنُتُهُ إِلَهٌ

”اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نازل

نہیں ہوئی جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل

ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلے جو کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ

جانتا ہو اور سواریاں اُس کے پاس پہنچا سکتی ہوں تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا؛

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بعد تفسیرِ قرآن کا تیسرا اہم مآخذ

اُن صحابہ کرام کے اقوال ہیں جنہوں نے اس محنت و جانفشانی سے قرآن کریم کی تفسیر کی

تھی، لیکن یہاں بھی چند امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے :-

۱۔ صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں ملتی ہیں،

لہذا ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اصولِ حدیث کے مطابق ان کی جانچ پڑتال ضروری ہے،

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اُس وقت حجت ہوں گے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو، اگر آپ کی بیان فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی، اور اگر کوئی قول آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائیگا، ۳۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر مستند روایات میں منقول نہ ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کی ہوئی تفسیروں میں کوئی اختلاف نہ ہو وہاں انہی کے اقوال کو اختیار کیا جائے گا،

۴۔ جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف ہو وہاں اول تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو اسی پر عمل کیا جائے گا، اور اگر اختلاف ناقابلِ تطبیق ہو تو ایک مجتہد جس قول کو دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط پائے اُسے اختیار کر سکتا ہے،

چوتھا مأخذ، تابعین کے اقوال

تابعین سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا، اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہو کہ تفسیر میں تابعین کے اقوال حجت ہیں یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے اس سلسلے میں بہترین محاکمہ کیا ہے، اُن کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ تابعی اگر کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہا ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر کا ہے، اور اگر خود اپنا قول بیان کرے تو یہ دیکھا جائے گا کہ دوسرے کسی تابعی کا قول اس کے خلاف ہے

۱۔ یہ اصول، البرہان، ص ۲۷۲ ج ۲ اور الاتقان، ص ۴۶ تا ۴۸ ج ۲ سے تلخیص و تنقیح کر کے اخذ کئے گئے ہیں،

یا نہیں؟ اگر کوئی قول اس کے خلاف موجود ہو تو اس وقت تابعی کا قول حجت نہیں ہوگا بلکہ اس آیت کی تفسیر کے لئے قرآن کریم، لغت عرب، احادیث نبویہ، آثارِ صحابہؓ اور دیگر شرعی دلائل پر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ اور اگر تابعین کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو تو اس صورت میں بلاشبہ اُن کی تفسیر حجت اور واجب الاتباع ہوگی۔

پانچواں مأخذ، لغت عرب

پہچے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم بدیہی طور پر واضح ہو، اور جس کے مفہوم میں کوئی الجھن، اشتباہ یا ابہام و اجمال نہ ہو، اور نہ اُسے سمجھنے کے لئے کسی تاریخی پس منظر کو جاننے کی ضرورت ہو، وہاں تو عربی لغت ہی تفسیر کا دوسرا مأخذ ہے، لیکن جہاں کوئی ابہام و اجمال پایا جا رہا ہو، یا جو آیت کسی واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہو یا اس سے فقہی احکام مستنبط کئے جا رہے ہوں، وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بنیاد تو خود قرآن کریم، سنت نبویہ اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؓ پر ہوگی، لیکن ان مأخذ کے بعد لغت عرب کو بھی سنا رکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، اور اس میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور ایک ایک جملے کے متعدد معنی ہو سکتے ہیں، لہذا صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم معین کرنا مغالطوں کا سبب بن جاتا ہے اسی بنا پر بعض حضرات نے ”مطلق لغت“ کو مستقیلاً مأخذ ماننے سے ہی انکار کیا ہے بلکہ امام محمدؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ لغت کے ذریعے قرآن کریم کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے، لیکن علامہ زکریاؒ فرماتے ہیں کہ اُن کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکل نظر انداز کرنا نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا ممنوع ہے، جو قلیل الاستعمال اور درواز کار لغوی

تحقیقات پر مبنی ہوں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا جس جگہ قرآن و سنت یا آثارِ صحابہؓ میں کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو، وہاں آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہل عرب کے عمومی محاورات میں متبادر طور پر سمجھی جاتی ہو۔ ایسے مواقع پر اشعار عربیے استدلال کر کے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں تو لکھے ہوئے ہیں لیکن عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ اس کو ایک واضح مثال سے سمجھے، قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے پانی کی فرمائش کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ :-

وَاصْبِرْ بِتَعَصَاكَ الْتَسْحَرْ ،

”اور اپنی لاشی کو پتھر پر مارو ،“

یہ جملہ کسی زبان جاننے والے کے سامنے بولا جائے گا وہ صراحتاً اس کا یہی مطلب سمجھ گا کہ لاشی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے، چنانچہ اس جملے کی یہی تفسیر صحیح اور معتبر ہے، لیکن سرسید احمد خان صاحب نے لغت کے دوران کارحوالوں کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس جملے کا مطلب یہ ہو کہ ”لاشی کے سہارے اس چٹان پر چلو“ اس میں اصْطَب کے معنی ”مارو“ کے بجائے ”چلو“ اور العَصَا کے معنی (پتھر) کے بجائے ”چٹان“ بیان کرنا ایک ایسی بُر دستی ہو جس کی تائید میں اگر لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھا حوالہ مل بھی جائے تو عام محاورات عرب اس کی بالکل تردید کرتے ہیں،

لہٰذا البرہان، ص ۱۶۰ ج ۲، نور ۱۴۱، اتہاتِ ماخذ التفسیر،

تفسیر القرآن، از سرسید احمد خان صاحب، ص ۹۱ ج ۱، مطبوعہ لاہور،

۳۔ یہاں ہم نے سرسید سارے بیان کئے ہوئے اس معنی کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ درحقیقت انکی بیان کی ہوئی اس تشریح کی کسی لغت سے بھی تائید نہیں ہوتی، اور لغت کے اعتبار سے بھی اس میں چند درجہ غلطیاں ہیں، مثلاً ”مضربہ“ جب چلنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ”فی“ ”مزدور“ ہوتا ہے جیسے قَرَأَ اَصْحَابُ بَيْتٍ فِي الْاَسْرَانِ ”اور یہاں ”فی“ نہیں ہے،

امام احمدؒ نے لغت کے ذریعے اسی قسم کی تفسیریں بیان کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ لغت سے اس طرح کا کام لینے کو کوئی بھی عقل و انسان رکھنے والا شخص درست نہیں کہہ سکتا۔

جِصًا مَأْخَذٌ، عَقْلٌ سَلِيمٌ

عقلِ سلیم کی ضرورت یوں تو دنیا کے ہر کام کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ پچھلے چار ماخذ سے استفادہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن یہاں اس کو ایک مستقل مأخذ کے طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسرار و معارف ایک ناپید اکسار سمندر کی حیثیت رکھتے ہیں، مذکورہ بالا پانچ ماخذ کے ذریعے اس کے مضامین کو بقدر ضرورت تو سمجھا جاسکتا ہے، لیکن جہاں تک اس کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف کا تعلق ہے اُن کے بارے میں کسی بھی دَر میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب اُن کی انتہا ہو گئی ہے، اور اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے بجائے واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے ان حقائق و اسرار پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم و عقل اور خشیت اور امانت کی دردت سے نوازا ہو وہ تدریج کے ذریعہ نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ ہر دور کے مفسرین اپنی اپنی فہم کے مطابق اس باب میں اضافہ کرتے آئے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کی دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے فرمائی تھی :-

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِيْ الشَّأْنِ الْوَسِيْلَ وَفَقِّهْنِيْ فِي السِّيَرِ ۝

یَا اللہ! اس کو تفسیر کا علم اور دین میں سمجھ عطا فرما ۝

لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس طرح عقل و فہم سے مستنبط کئے ہوئے وہی حقائق و اسرار معتبر ہیں جو دوسرے شرعی اصول اور مذکورہ بالا پانچ ماخذ سے متصادم نہ ہوں، اور اگر اصول شرعیہ کو توڑ کر کوئی نکتہ بیان کیا جاتا تو اس کی دین میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے،

باب دوم

تفسیر کے ناقابل اعتبار مآخذ

تفسیرتہ آن کے معتبر اور مستند مآخذ معلوم کرنے کے بعد ان ناقابل اعتبار مآخذ کی نشان دہی بھی ضروری ہے جنہیں بعض لوگ تفسیر کی بنیاد قرار دے کر غلط فہمیوں، بلکہ بعض اوقات گمراہیوں کا شکار ہو جاتے ہیں :-

۱۔ اسرائیلی روایات

”اسرائیلیات“ یا ”اسرائیلی روایات“ ان روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تنہا پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہ راست بائبل یا تالمود سے لی گئی ہیں، بعض مشنا اور ان کی تشریح سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود و نصاریٰ میں معروف و مشہور تھیں تفسیر کی مردوجہ کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے؛

۱۔ پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے

مثلاً فرعون کا غرق ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ، آپ کا کوہ طور پر جانا وغیرہ، ایسی روایات اس لئے قابل اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے اُن کی تصدیق کر دی ہے،

(۲) دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، مثلاً یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ) بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے، یہ روایت اس لئے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحتاً اس کی تردید فرمائی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ من گھڑت کہانی کہ آپ (معاذ اللہ) اپنے سپہ سالار اور یا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے،

۳۔ تیسری قسم اُن اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹی ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ، ایسی اسرائیلیات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے :-

لَا تُصَدِّقُوْهُنَّ اَوْ لَا تُنْكِرْنَ بُوْهُنَّ،

”نہ اُن کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب“

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے، لیکن نہ اُن پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، اور نہ اُن کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے، اور اس قسم کی روایا بیان کرنا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ خود... قرآن کریم نے سورہ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟ ارشاد ہے :-

مَنْ يَّقُوْلُ اَنْ ثَلَاثَةً رَّآيَهُمْ كَلْبُهُمْ، وَيَقُوْلُ اَنْ خَمْسَةً

۱۔ بائبل، کتاب سلاطین اول (۲: ۱۳) کہ ایثنا ۲۔ سمویل ۱۳: ۱۱،

۲۔ تفسیر ابن کثیر، مقدمہ ص ۴۲ اور اسول التفسیر لابن تیمیہ ص ۳۳،

سَادِ سُهُمْ كُلُّهُمْ رَجَبًا بِالْعَيْبِ، وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَنَا مِنْهُمْ
كُلُّهُمْ، قُلْ رَبِّيَ أَعْلَمُ بِعِيَّتِهِمْ مِمَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۝
فَلَا تُنَادِيهِمْ إِلَّا مِنْ آخِ ظَاهِرٍ أَوْ لَا تَسْتَفْتِي فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

راصحاب کہتے ہیں کہ تعداد کے بارے میں بعض اہل کتاب کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور
چونکہ ان کا کتاب ہے، اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا کتاب ہے، یہ لوگ
اکٹھ بچوں ہوتا ہے، اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا
کتبہ ہے، آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے، ان کو بہت کم لوگ
جانتے ہیں، سو اب ان کے بارے میں مجھ پر سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے، اور
آپ ان کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی نہ پوچھئے ۝

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اہل کتاب کی مخالفت
اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرٹ اشارہ
فرمادیا ہے:-

۱۔ اسرائیلی روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ
نے بیان فرمایا،

۲۔ ان میں سے ہر روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں ان کے غلط ہونے پر تنبیہ بھی
کر دی ہے، چاہئے، جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ تعالیٰ نے ”رَجَبًا بِالْعَيْبِ“ کہہ کر رد فرمایا۔
۳۔ جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو، اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا
چاہئے، جیسے کہ اللہ نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا،

۴۔ ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہئے کہ حقیقی علم
اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،

۵۔ ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ سے پرہیز کرنا چاہئے،
۶۔ ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں، کیونکہ ان سے
دنیا و آخرت کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں،

پھر بعض روایات میں تو صراحت ہوتی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے، اور بعض روایات میں ایسی صراحت نہیں ہوتی، لیکن دوسرے دلائل کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے، تفسیر کی کتابوں میں جو روایات کتب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان دونوں کا مختصر حوالہ معلوم کر لینا بھی ضروری ہے،

کعب الاحبار کون تھے | کعب الاحبار کا پورا نام کعب بن ماثع حمیری ہے، اور وہ کعب الاحبار یا کعب، الحمر کے لقب سے مشہور ہیں، یہ یمن کے باشندے تھے، اور انھیں علمائے یہود میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، انھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مشرف باسلام نہ ہو سکے، سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے دوران یہ مدینہ طیبہ آئے اور مسلمان ہو گئے، طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اُن سے پوچھا کہ ”تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیوں اسلام نہیں لائے؟“ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے تورات کا ایک نسخہ لکھ کر دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس پر عمل کرتے رہو، اور تورات کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں انھیں بن کر کے اس پر مہر لگا دی تھیں، تاکہ میں اُن کا مطالعہ نہ کروں، اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے رشتہٴ اہل بیت کا واسطہ دے کر یہ عہد لیا تھا کہ میں یہ مہریں نہ توڑوں، لیکن جب دین اسلام دنیا میں غالب ہونے لگا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے باپ نے مجھ سے کوئی علم چھپانے کی کوشش نہ کی ہو، چنانچہ میں نے ان کتابوں کی مہر توڑ دی، اور اُن کا مطالعہ کیا، تو اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کا تذکرہ مجھے ملا، اس لئے میں اب مسلمان ہو کر آیا ہوں۔“

لہ قال الکوفیؒ فی سندہ النجاشیؒ و ابو مخنفؒ و فی ایضاً علی بن زید بن جعدان ضعیف
واحد مقالات الکوفی ص ۳۲، ولکن حسنہ الحافظ فی الاصابۃ (۳: ۲۹۸)

کعب الاحبارؓ کو عام طور سے ثقہ قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض روایات کی بناء پر ان کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات کا بھی اظہار کیا ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد اقصیٰ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ ”مسجد کو صخرہ بیت المقدس کے آگے تعمیر کیا جائے یا پیچھے؟“ اس پر کعب الاحبارؓ نے مشورہ دیا کہ ”مسجد صخرہ کے پیچھے بنائی جائے“، یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، ”یہودی عورت کے بیٹے! تم پر یہودیت کا ابھی تک اثر ہے، میں تو مسجد کو صخرہ کے آگے بناؤں گا، تاکہ نماز میں صخرہ کا استقبال نہ کیا جائے“ علامہ زاہد کوثریؒ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد کعب احبارؓ کے ذہن میں حضرت عمرؓ کے بارے میں کچھ رنجش رہی، یہاں تک کہ ان کا میل جول ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا جو حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش میں ملوث تھے اور اس سے پہلے وہ اہل کتاب کی بعض کتابوں کے حوالے سے حضرت عمرؓ کو یہ تنبیہ کر چکے تھے کہ آپ کو کسی وقت قتل کیا جائے گا، ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں :-

”ان پھر بڑے ہونے پر واقعات کو طمانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ذرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عتبہ بن مالکؓ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کعب الاحبار پر پورا بھروسہ نہیں کرتے تھے۔“

علامہ کوثریؒ نے کعب الاحبار پر جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، اور مختلف صحابہؓ کے اقوال سے جو نتائج نکالے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ ان کی بیشتر روایات اسرائیلی روایات ہیں، لہذا جب تک ان کی تصدیق خارجی دلائل سے نہ ہو جائے، اس وقت تک ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا،

۱۔ مقالات الکوثری، ص ۳۳۳، مقالہ: ”کعب الاحبار والاسرائیلیات“

۲۔ مسرے محقق عالم ڈاکٹر رمزی نعمانہ نے ان شکوک و شبہات کی مفصل اور مدلل تردید کی ہے، (ملاحظہ ہو ان کی کتاب ”الاسرائیلیات واثرها فی التفسیر“ ص ۱۷۲ تا ص ۱۸۳ مطبوعہ دارالنبیاء بیروت ۱۹۷۷ء)

وہب بن منبہ

دوسرے بزرگ جن سے بکثرت اسرائیلی روایات منقول ہیں وہب ابن منبہ (متوفی ۱۱۵ھ) ہیں، یہ بھی یمن کے علاقے صنعاء کے باشندے تھے، اور فارسی الاصل تھے، روایات کے مطابق یہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد منبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمان ہو چکے تھے، وہب بن منبہؓ عابد و زاہد تابعی تھے، اور انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ سے روایتیں لی ہیں، ان کے پاس علماء اہل کتاب کی روایات کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو حضرت عبداللہ ابن سلامؓ اور کعب الاحبارؓ کے علوم کا جامع سمجھتے تھے، امام ابن سعدؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان روایات پر مشتمل ایک کتاب ”احادیث الانبیاء“ کے نام سے تالیف کی تھی، اور مسعودیؒ نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب ”المبدأ“ کے نام سے لکھی تھی، اور حاجی خلیفہؒ نے ”كشف الظنون“ میں شاید اسی کتاب کو ”کتاب الاسرائیلیات“ کے نام سے ذکر کیا ہے، نیز یاقوت الحمویؒ اور قاضی ابن خلکانؒ نے ان کی ایک اور کتاب کا تذکرہ کیا ہے، جس کا نام ”ذکر الملوک المفتوحہ من حمیرا و اخبارہم وغیر ذلک“ تھا، قاضی ابن خلکانؒ نے یہ کتاب خود دیکھی ہے،

جہاں تک وہب بن منبہؓ کے صدق اور امانت کا تعلق ہے اس کے بارے میں محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے کوئی کلام نہیں کیا، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ”وہ ثقہ اور سچے تھے، اور اسرائیلی کتابوں سے بکثرت نقل کرتے تھے“ امام ابو زرہؒ

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۱۰۱ ج ۱ ۲۔ طبقات ابن سعد، ص ۶۷ ج ۲

۳۔ مروج الذهب، ص ۱۲ ج ۵ ۴۔ بحث فی نشأة علم التاریخ عند العرب للدکتور عبدالعزیز الدوری ص ۱۱۳ ج ۵ ۵۔ معجم الأدباء للحموی ص ۲۲۲ ج ۶، ووفیات الاعیان لابن خلکان ص ۸۰

اور امام نسائیؒ نے انھیں ”ثقة“ قرار دیا ہے، امام عجلؒ فرماتے ہیں: ”دہب ثقة تابعی تھے“ صرف امام عمرو بن علی الفلاسؒ نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں دہب کے صدق و امانت میں کوئی شبہ تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دہب ابتداء میں قدرتیہ فرقہ کے عقائد کی طرف مائل تھے، لیکن امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بعد میں اپنے اس عقیدے سے رجوع کر لیا تھا، اور ابوسنانؒ نے خود دہب بن منبہؒ سے نقل کیا ہے کہ میں پہلے قدری عقائد کا قائل تھا لیکن بعد میں میں نے اُن سے رجوع کر لیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ ائمہ جرح و تعدیل میں سے کسی نے بھی اُن کی سچائی اور امانت و دیانت پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اسی بنا پر امام بخاریؒ، اور امام مسلمؒ دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں اُن کی روایات ذکر کی ہیں، لہذا جو روایات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگر ان کی سند اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہو تو ان کو بلاشبہ قبول کیا جائے گا، البتہ زمانہ ماضی کے جو قصے اور زمانہ آئندہ کی جو خبریں انھوں نے بغیر کسی حوالے کے بیان کی ہیں وہ زیادہ تر اسرائیلی روایات ہیں جن کے بارے میں ہمیں حکم یہ ہے کہ ہم نہ اُن کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب، عہد حاضر کے بعض مصنفین مثلاً سید رشید رضا مرحوم وغیرہ نے اُن کی عجیب و غریب اسرائیلی روایات کی بنا پر انھیں ضعیف قرار دیدیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا محض بیان کرنا کوئی جرم نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان روایات پر کسی اسلامی عقیدے یا اسلامی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ | لعاب الاحبارؒ اور دہب بن منبہؒ تو تابعین میں سے ہیں، اور سب سے زیادہ اسرائیلی روایات انہی سے مروی ہیں، صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ اسرائیلیات شاید حضرت عبداللہ بن عمروؓ

لے تہذیب الہتذیب، ص ۱۶۸ ج ۱۱،

۵۵ سید رشید رضا مرحوم وغیرہ کے اس نظریے کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر رمزی نغاعہ کی محققانہ کتاب ”الاسرائیلیات واثرائیہ فی التفسیر“ ص ۱۸۸،

سے مروی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سریانی زبان باقاعدہ سمجھتے تھے، اس زمانہ میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں، اور غزوہ یرموک کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اس قسم کی کتابیں اتنی بھاری تعداد میں ہاتھ آگئی تھیں کہ وہ دو اونٹوں پر لاد دی جانی تھیں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے بہت سی اسادیث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کی ہیں، لیکن ان کا اسرائیلیات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اگر وہ صحیح سند ثابت ہوں تو درود سکر صحابہؓ کی روایات کی طرح ان کی روایات بھی واجب تسلیم ہیں، ہاں جو روایات انہوں نے سراحۃ اہل کتاب نقل کی ہیں وہ اسرائیلی روایات ہیں جنکی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، اسی طرح جو روایات خود ان کے اپنے مقولے کے طور پر منقول ہیں ان کے بارے میں بھی اکثر گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلیات ہیں، اور ان کو اسلامی عقائد کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، مگر ان کے ایک منکر حدیث مصنف، ابوریثہؓ نے اپنی کتاب ”انوار علی السنۃ المحمدیہ“ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا کہ وہ کبھی کبھی اسرائیلی روایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی منسوب کر دیتے تھے، لیکن یہ الزام نہ صرف سونی سد غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ اس نے خود ابوریثہؓ صاحب کے علم و دیانت کی قلعی بھی کھول دی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی دلیل میں حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ :-

أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو كَانَ ذَا أَصَابَ ذَا مَلِكَيْنِ، مِنْ كُتُبِ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَكَانَ يَتَرَدُّ بِهِمَا لِلنَّاسِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، إِلَى اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَجَدَّهُ الرَّسُولُ ﷺ كَثِيرًا مِّنْ أُمَّةٍ مِنَ التَّائِبِينَ وَكَانَ يُقَالُ لَهُ: لَا تُحْكِنِ شُعَاعِدَ الزَّامِلَيْنِ،

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اہل کتاب کی کتابوں میں سے دو اونٹوں کا بوجھ ملا تھا وہ ان کتابوں کی باتیں لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب

کریکے روایت کرتے تھے، اس لئے بہت سے ائمہ تابعین نے ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا، چنانچہ لوگ اُن سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان دو آدمیوں کے بوجھ میں سے کچھ نہ سنائیے۔“

اس عبارت میں خط کشیدہ جملہ حافظ ابن حجرؒ کی ”فتح الباری“ میں نہیں ہے، البوریہ صاحب نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا کر حافظ ابن حجرؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے، اس آپ منکرین حد اور مغرب زدہ مؤلفین کی علمی امانت و دیانت کا اندازہ کر سکتے ہیں!

۲۔ صوفیاء کرامؒ کی تفسیریں

صوفیائے کرامؒ سے قرآن کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور مآثر معنی کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَكُونُ بَيْنَكُمْ وَالْكَافِرِينَ
”قتال کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل ہیں“

اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا کہ:-

قَاتِلُوا النَّفْسَ فَإِنَّهَا تَكُنِي الْكَافِرَاتِ،
نفس سے قتال کرو، کیونکہ وہ انسان کے سب سے زیادہ متصل ہے۔“

اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر نہیں، صوفیاء کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآن کریم کی اصل مراد یہ ہو، اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آ رہا ہے وہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن کریم کے ظاہری مفہوم پر جو اس کے اصل مآخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں، اور اس

۱۔ اور اس سلسلے میں البوریہ کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عجاج الخطیب کی کتاب ”التنبيه قبل التذوين“ اور ڈاکٹر رمزی نعمانہ کی ”الاسرائیلیات واثرہا فی کتب التفسیر“ (ص ۱۵۸)

بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اُن وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اُس آیت کی تلاوت کے وقت اُن کے قلب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے پر جہاد و قتال کا حکم مراد نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کفار سے جہاد و قتال کا حکم تو اس آیت کا اصلی تقاضا ہی ہے، لیکن اسی آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ سب سے قریبی نافرمان اس کا نفس ہے، جو اُسے بُرائیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اُس سے بھی جہاد ضروری ہے،

ماضی قریب کے معدون مفسر علامہ محمود اکو سی، جن کی تفسیر میں صوفیاء کرام کے اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

”قرآن کریم میں سادات صوفیاء سے جو کلام منقول ہے، وہ درحقیقت ان دقیق امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو ارباب سلوک پر منکشف ہوتے ہیں، اور ان اشارات میں اور قرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے تطبیق ممکن ہے، صوفیاء کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں، اور باطنی مفہوم مراد ہے، اس لئے کہ یہ تو باطنی ملحوظ کا اعتقاد ہے جسے انھوں نے شریعت کی بالکل نفی کا زینہ بنایا ہے، ہمارے صوفیاء کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں اور وہ بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ قرآن کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل کیا جائے“

لیکن صوفیاء کے اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:-

۱۔ روح المعانی، ص ۱، مقدمہ، فائدہ ثانیہ، یہی مضمون علامہ سیوطی نے شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ سے نقل فرمایا ہے، (الاتقان، ص ۸۵ ج ۲)

۱۔ ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن کریم کی اصل مراد وہی ہے جو تفسیر کے اصل مآخذ سے سمجھ میں آتی ہے، اور یہ اقوال محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا اگر ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو یہ گمراہی ہے، چنانچہ امام ابو عبد الرحمن مسلمیؒ نے ایک کتاب ”حقائق التفسیر“ کے نام سے لکھی تھی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی، اس کے بارے میں امام واحدیؒ نے فرمایا کہ:-

”جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا“

۲۔ اس قسم کے اقوال میں بھی صرف ان اقوال کو درست سمجھا جاسکتا ہے جن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کسی مسئلہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، اور اگر ان وجدانیات پر دین کے مسلم اصول و قواعد کی خلاف ورزی کی جائے لگے تو یہ صریح الحاد ہے،

۳۔ اس قسم کے وجدانیات صرف اُس وقت معتبر ہو سکتے ہیں جب قرآن کریم کی تحریف کی حد تک نہ پہنچے ہوں، اور اگر قرآن کریم کے الفاظ کو توڑ مڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ بھی الحاد اور گمراہی ہے، مثلاً ایک شخص نے آیت قرآنی ”مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ“ کے تحت یہ کہا کہ یہ اصل میں ”مَنْ ذَلَّ ذِي يَشْفَعُ“ ہے، ذی سے مراد ”نفس“ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ”جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا، شفا پا جائیگا“ اس بات کو یاد رکھو، علامہ سراج الدین بلقینیؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا کہ: ”ایسا کہنے والا ملحد ہے“

۴۔ قدیم زمانے میں محدودوں کا ایک فرقہ ”باطنیہ“ کے نام سے گذرا ہے، جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، اور

یہی تشریح کی اصل تفسیر ہے، یہ اعتقاد باجماع امت کفر و الحاد ہے، لہذا صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھا جائے تو وہ باطنیت ہوگا، ان چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیائے کرام کے اقوال کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات و احوال رکھنے والوں کو ان اقوال سے فائدہ بھی پہنچا ہے، اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر ”روح المعانی“ میں آیات کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان ”باب الاشارة فی الايات“ قائم کرتے ہیں، اور اس میں اس قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں،

مذکورہ بالا گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے قرآن کریم کے تحت اپنے وجود وجدانیات ذکر فرمائے ہیں وہ قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہیں، اور بعض لوگوں نے اُن پر باطنیت کا جو الزام عائد کیا ہے وہ درست نہیں، اس کے باوجود ہم حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کو نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ:-
وَمَعَ ذٰلِكَ فَيَا لَيْتَهُمْ كَمْ يَتَسَاهَلُوْا بِمِثْلِ ذٰلِكَ يَمَافِيْهِ
مِنْ اِلَافِهِمْ وَاِلَافِائِهِمْ،

”اس کے باوجود اے کاش! کہ یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اپنے تساہل سے کام نہ لیتے، کیونکہ ان میں غلط فہمی اور اشتباہ کی بڑی گنجائش ہے“

۳۔ تفسیر بالرائے

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:-
مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَاصَابَ فَقَدْ اَخْطَا
”جو شخص تشریح قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھی کہے تو اس نے غلطی کی“

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ تترآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر و رائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعہ قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کئے جاسکتے جو اصول شرعیہ کے مطابق ہوں، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبیر اور استنباط کو حاجت محسن قرار دیا ہے، اور اگر فکر و تدبیر بالکل پابندی لگا دی جائے تو قرآن سنت سے شرعی احکام و قوانین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو جائے گا، لہذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے،

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن و سنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے معاملہ میں غور فکر اور عقل و رائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جو اصول اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ ہیں، اُن کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطا کار ہے، کیونکہ اس نے رستہ غلط اختیار کیا، اب اصول تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:-

- ۱۔ جو شخص تفسیر تترآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کر دے،
- ۲۔ کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؓ سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے،
- ۳۔ جن آیات میں صحابہؓ و تابعینؓ سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان و ادب کے اصولوں کو یا مال کر کے کوئی تشریح بیان کرے،

۴۔ قرآن و سنت سے براہ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لئے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کر دے،

۵۔ قرآن کریم کی متشابہ آیات و جن کے بائے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ اُن کی سو فی صد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، ان کی جسزم و در ثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے، اور اُس پر مصر ہو،

۶۔ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر سَلَم اور طے شدہ عقائد یا احکام مجروح ہوتے ہوں،

۷۔ تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل و فکر کا استعمال جائز ہے، وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے،

یہ تمام صورتیں اس ”تفسیر بالرائی“ کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیا:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعْهُ
مَقْعَدًا مِنَ النَّارِ

”جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے“

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن و سنت کے وسیع و عمیق علم اور اسلامی علوم میں ہمارے کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کے لئے بھی کچھ کارآمد اصول معتر فرمائے ہیں، جو اصول فقہ اور اصول تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اور اُن کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدر الدین زکشیؒ نے اپنی کتاب ”البرہان فی علوم القرآن“ کی نوع ۷۱ میں بالخصوص

”اقسام التفسیر“ کے زیر عنوان (صفحہ ۶۲ تا ۱۰۷) بیان فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابل تدریس، لیکن چونکہ عربی زبان و علوم کی جہارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس لئے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرنا بے فائدہ ہے، جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں،

تفسیر میں گمراہی کے اسباب

علم تفسیر جہاں ایک انتہائی شرف و سعادت کی چیز ہے وہاں اس نازک وادی میں قدم رکھنا بے حد خطرناک بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کسی آیت کی غلط تشریح کر بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں نے ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر میں دخل اندازی کی ہے، وہ کافی محنت خرچ کرنے کے باوجود اس بدترین گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے یہاں ایک نظر ان اسباب پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جو انسان کو تفسیر قرآن کے معاملے میں گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں؛

پہلا سبب، نااہلیت

تفسیر قرآن میں گمراہی کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک سبب یہ ہے کہ انسان اپنی اہلیت و صلاحیت کو دیکھے بغیر قرآن کریم کے معاملے میں رائے زنی شروع کر دے، خاص طور سے ہمارے زمانے میں گمراہی کے اس سبب بڑی قیامت ڈھائی ہے، یہ غلط فہمی عام ہوتی جا رہی ہے، کہ صرف عربی زبان پڑھ لینے کے بعد انسان قرآن مجید کا عالم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جس طرح سمجھ میں آئے قرآن کریم کی تفسیر کر سکتا ہو، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں محض

زبان دانی کے بل پر جہارت پیدا ہو سکتی ہو، آج تک کبھی کسی ذی ہوش نے انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا ہو گا کہ وہ ڈاکٹر ہو گیا ہے، اور میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر دنیا پر مشفق ستم کر سکتا ہے، اسی طرح کوئی شخص محض... انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ قانون کی اعلیٰ کتابیں دیکھ کر ماہر قانون کہلا سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو یقیناً ساری دنیا اُسے احمق اور بیوقوف کہے گی، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام علوم و فنون محض زبان دانی اور بنی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے لئے ساہا سال کی محنت درکار ہے، انھیں ماہر اساتذہ سے پڑھا جاتا ہے، اس کے لئے بڑی بڑی درسگاہوں میں کئی کئی امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، پھر کسی ماہر فن کے پاس رہ کر ان کا عملی تجربہ کرنا پڑتا ہے، تب کہیں انسان ان علوم کا مبتدی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے،

جب ان علوم و فنون کا حال یہ ہے تو تفسیر و تفسیر قرآن جیسا علم محض عربی زبان سمجھ لینے کی بنا پر آخر کیسے حاصل ہو جائے گا؟ آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ علم تفسیر میں درک حاصل کرنے کے لئے کتنی وسیع معلومات درکار ہوتی ہیں قرآن کریم عام کتابوں کی طرح کوئی ایسی مسلسل کتاب نہیں ہے جس میں ایک موضوع کی تمام باتیں ایک ہی جگہ لکھی ہوتی ہوں، بلکہ وہ دنیا کی تمام کتابوں کے برخلاف اپنا ایک جدا گانہ اور ممتاز اسلوب رکھتا ہے، لہذا کسی آیت کو قرار دہی طور پر سمجھنے کے لئے اول تو یہ ضروری ہے کہ اس آیت کی مختلف قراءتوں، اُس موضوع کی تمام دوسری آیات اور ان کے متعلقات پر پوری نگاہ ہو، پھر آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہوتی ہیں جسے سبب نزول کہا جاتا ہے، اور جب تک سبب نزول کی مکمل تحقیق نہ ہو اس کا پورا مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا، نیز یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ قرآن کریم بہت سی مجمل باتوں کی تشریح و تفسیر سرکارِ دعوام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

ہر چھوڑ دیتا ہے، لہذا ہر آیت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قول یا عملی تعلیم موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ تنقید روایات کے مسلم اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں؟ نیز صحابہ کرامؓ نے جو نزول قرآن کے عینی شاہد تھے، اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا؟ اگر اس بارے میں روایات کے درمیان کوئی تعارض و اختلاف ہو تو اسے کیونکر رفع کیا جاسکتا ہے؟ پھر عربی زبان ایک وسیع زبان ہے جس میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی اور ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ ہوتے ہیں، لہذا جب تک اُس زمانے کے اہل عرب کے محاورات پر عبور نہ ہو کسی معنی کی تعیین بہت مشکل ہوتی ہے، اس کے علاوہ صرف الفاظ کے لغوی معنی جاننے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ عربی میں نحوی ترکیبوں کے اختلافات سے معانی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بات عربی لغت و ادب پر مکمل عبور کے بغیر طے نہیں کی جاسکتی، کہ اس مقام پر کونسی ترکیب محاورات عرب کے زیادہ قریب ہے؟ اور سب آخریں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار و معارف الیہ شخص پر نہیں کھولتا جو اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہو، لہذا تفسیر قرآن کیلئے اللہ کی بندگی اس کے ساتھ تعلق خاص، طاعت و تقویٰ اور حق پرستی کے بے لاگ جذبے کی ضرورت ہے، اس شرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ تفسیر قرآن کے لئے صرف عربی زبان کی معمولی واقفیت کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے لئے علم اصول تفسیر و علم حدیث اصول حدیث، اصول فقہ، علم فقہ، علم نحو، علم صرف، علم لغت، علم ادب اور علم بلاغت میں ماہرانہ بصیرت اور اس کے ساتھ طہارت و تقویٰ ضروری ہے، ان ضروری شرائط کے بغیر تفسیر کی وادی میں قدم رکھنا اپنے آپ کو گمراہی کے راستے پر ڈال دینے کے مرادف ہے، اور اسی طرز عمل کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ يَغْيِرُ عَلَيْهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَهُ
مِنَ النَّارِ،

”جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفت گو کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے“

اس سلسلے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے:-
چند غلط فہمیاں (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:-

وَلَقَدْ كَيَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي تَكْرِ قَوْلُ مَنْ مَّدَّ كِبْرَهُ
 ”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان

کر دیا ہے“

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی بلے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص قرآن کریم کا متن پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے، جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہو واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہے، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے دوسرے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، بلکہ یہ مقصد قرآن کریم کے مستند تراجم دیکھ کر بھی ایک حد تک حاصل ہو جاتا ہے، مذکورہ آیت میں اسی مقصد کے لئے یہ کہا گیا کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے یہ بات محل نہیں چھوڑی ”الَّذِي تَكْرِ“ (یعنی نصیحت کے واسطے) کا لفظ بڑھا کر اس حقیقت کو ردِ روشن کی طرح واضح کر دیا ہے،

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علیٰ معنایں پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل

مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور بچپن کی حاصل نہ ہو اُس وقت تک قرآن کریم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انھیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ وغیرہ نے امام عبدالرحمنؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ:

فَعَلَّمَنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا

”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے“

چنانچہ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۃ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مستدرِ احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا، ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا، اے

غور کرنے کی بات یہ ہو کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی شعر و ادب میں جہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی تو جہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انھیں قرآن کریم حفظ کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی، کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے

کے لئے صرف عربی زبان کی جہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی جہارت اور نزول وحی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود... "عالمِ قرآن" بننے کے لئے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شدید پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسرِ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ يَتَّبِعُ عَلِيًّا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ فِي النَّارِ
جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا
جہنم میں بنالے گا۔

علماء اور اجارہ داری (۲) بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے ایک ہدایت کی کتاب ہے، لہذا ہر شخص کو اس سے اپنی سمجھ کے موافق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اور اس کی تشریح و تفسیر ہر صنفِ علماء کی "اجارہ داری" قائم نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ بھی انتہائی سطحی اور جذباتی اعتراض ہے جسے حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، قرآن کریم بلاشبہ تمام انسانوں کے لئے سرمایہ ہدایت ہی، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ہر آن پڑھ جاہل بھی اس سے دقیق قانونی اور کلامی مسائل کا استنباط کر سکتا ہو، اور اس مقصد کے لئے کسی قسم کی صفاتِ اہلیت درکار نہیں ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی ماہرِ قانون فلسفی یا ڈاکٹر اگر اپنے فن پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء پوری انسانیت کو

فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے، اب اگر کوئی ایسا شخص جو ان علوم و فنون کے مبادی سے واقف نہیں ہو کھڑا ہو کر یہ اعتراض کرنے لگے کہ یہ کتابیں تو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھیں، اُن پر ماہرین قانون، فلسفیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری کیوں قائم کر لی ہے؟ تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی کتاب سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کے لئے اہلیت کی کچھ صفات مقرر کرنا "اجارہ داری" قائم کرنے کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دنیا کے کسی علم و ہنر کو جاہلوں اور اناڑیوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا، دراصل علم و فن کی ہر کتاب انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس علم و فن کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرے، اور اس کے لئے جو محنت اور جتنا وقت درکار ہے، اُسے خرچ کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو جن لوگوں نے اس علم و فن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عمریں کھپائی ہیں اُن میں جس پر زیادہ اعتماد ہو، اُس کی تشریح و تفسیر پر بھروسہ کرے، ان دو راستوں کے علاوہ جو شخص کوئی تیسرا راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرے گا اور متعلقہ علم و فن پر بھی، بالکل یہی معاملہ قرآن و سنت کا بھی ہے، کہ وہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لئے دستورِ ہدایت ہیں، لیکن اُن سے ہدایت حاصل کرنے کے بھی دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان ان علوم کو ماہر اساتذہ سے باقاعدہ حاصل کر کے ان میں پوری بصیرت پیدا کرے، یا پھر اُن لوگوں کی تشریح و تفسیر پر اعتماد کرے جنہوں نے اپنی زندگیاں ان علوم کے لئے وقف کی ہیں اس سو فی صد معقول اصول کو جس پر دنیا کے ہر علم و فن کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے، "اجارہ داری" کا طعنہ دینا سوائے سطحی جذباتیت کے اور کیلئے؟ کیا ساری دنیا میں صرف قرآن و سنت ہی (معاذ اللہ) ایسے لاوارث رہ گئے ہیں کہ اُن سے مسائل مستنبط کرنے کے لئے اہلیت کی کوئی شرط درکار نہیں ہے؟ اور اُن پر ہر کس و ناکس مشق ستم کر سکتا ہے؟

علماء اور پاپائیت | (۳) مذکورہ اعتراض ہی کو قد لے مختلف عنوان سے بعض لوگ اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اسلام میں "پاپائیت" کی

کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ بات عیسائی مذہب کا خاصہ ہے کہ اس میں بائبل کی تشریح و تفسیر کا حق صرف پوپ کو حاصل ہوتا ہے، اور کسی دوسرے شخص کو اس سے محال اختلاف نہیں ہوتی، اسلام نے پاپائیت کی جرہ کاٹی ہے، لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دین فطرت میں بھی تشرک ان کریم کی تفسیر کا سارا حق علماء کے ایک مخصوص طبقہ کے حوالے کر دیا جائے؟

لیکن یہ اعتراض بھی پاپائیت اور علماء اسلام دونوں کی بات کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے، قلماً کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا نام نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ نسل، ذات، پات، مال، دولت یا جاہ و منصب کی خاص شرائط پر ہو، نہ ”علماء“ کسی ایسی لگی بندھی تنظیم کا نام ہے، جس کا رکن بنے بغیر انسان ”عالم“ کہلانے کا حق نہ ہو، بلکہ علم و فضل اور سیرت و کردار کی کچھ مخصوص صفات کا حامل ہر شخص عالم دین ہے، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، اور نسب کے اعتبار سے کسی بھی خاندان سے وابستہ ہو، اس لحاظ سے اسلام کے علماء اور عیسائیت کے پاپاؤں میں مندرجہ ذیل واضح فرق موجود ہیں:-

۱۔ ”پاپائیت“ ایک ایسے چھپیرہ مذہبی نظام کا نام ہے جو ایک لگی بندھی عالمگیر تنظیم میں جکڑا ہوا ہے، اس میں بے شمار عہدے اور منصب ہیں، ان عہدوں اور مناصب پر فائز ہونے والوں کی تعداد مختصر رہی، ہر عہدہ و منصب پر کسی شخص کا تقرر کچھ معین انسان کرتے ہیں، اور وہی اس کو فرائض و اختیارات تفویض کرتے ہیں، کوئی شخص محض اپنی ذاتی اہلیت، علم و فضل یا سیرت و کردار کی بنیاد پر بلا واسطہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس تنظیم کے ارباب اقتدار سے نامزد نہ کریں، اور جب تک وہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہ کرے مذہبی معاملات میں اُس کی ہر رائے قطعی غیر مؤثر ہے، خواہ وہ علم و فضل کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی علوم میں اعلیٰ درجے کی جہاز حاصل کر لے تب بھی وہ دلائل کے زور سے چرچ کے مضبوط حصار کو نہیں توڑ سکتا،

اور اگر یہ معین تنظیم اپنی کتب مقدسہ اپنے پیغمبروں اور اپنے اسلاف سے بغاوت پر کمزور
باتدھ لے تب بھی تنظیم سے باہر کے کسی عالم کو اس کے خلاف دم مارنے کی گنجائش
نہیں ہے،

اس کے برخلاف علمائے اسلام کی کسی بھی زمناً میں اس نوعیت کی کوئی عالمگیر
تنظیم نہیں رہی، جس میں داخلے کے بغیر مذہبی معاملات میں لب کشائی ممنوع ہو،
جس کے عہدوں کا دائرہ اختیار خاص ہو، اور جن میں مقتدر کا فیصلہ کچھ مخصوص افراد
کرتے ہوں، اس کے بجائے ہر وہ شخص جس نے ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی قرآن و
سنت اور متعلقہ علوم میں بصیرت اور اصلاح و تقویٰ پیدا کر لیا ہو وہ "عالم دین"
کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، مذہبی معاملات میں اُس کے فرائض و اختیارات کا تعین
معدود دے چند انسانوں کا کوئی گروہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے علم و تقویٰ کی بنیاد پر
عام مقبولیت اس کا فیصلہ کرتی ہے، چرچ کے ارباب بست و کشاد اپنے عہدہ و
منصب کے زور پر اپنی بات منواتے ہیں، اور ایک مسلمان عالم اپنے علم و فضل اور
تذکرہ دار کی قوت سے یہ مقام حاصل کر لے، وہاں چرچ کے متشدد قوانین کسی
شخص کو واجب الاتباع اور قابل تقلید قرار دیتے ہیں اور یہاں اس معاملے میں صل
فیصلہ کن قوت اُمت کا اجتماعی ضمیر ہے، کلیسا کے عہدہ داروں کی ایک تعداد مقرر
ہے، اور اس تعداد کے پورا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو اپنے زمانے
کے کلیسا کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا، اس کے برعکس علمائے دین کی کوئی
تعداد مقرر نہیں ہے، علم دین کی ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد ہر شخص عالم دین
کے حقوق حاصل کر سکتا ہے،

۲۔ پھر کلیسائی نظام میں مذہب اور عقائد کی تشریح و تفسیر کے تمام اختیارات
فرد واحد پر مرکوز ہو جاتے ہیں، جسے "پوپ" کہتے ہیں، اس پوپ کو مذہب کے کردار
پیرؤں میں سے مکمل سترکار ڈینل (Cardinals) منتخب کرتے ہیں،
اس پوپ کے اختیارات یہ ہیں کہ وہ رئیس الحواریین (جناب پطرس) کا تہما خلیفہ ہو

تمام مذہبی معاملات میں آخری انتہائی طے ہے، مذہب کی تشریح کے معاملے میں ہر سچی کے لئے واجب الاتباع ہے، اس کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عالم کو اس سے اختلاف کا حق نہیں پہنچتا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس کے اختیار کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

ہنذا پوپ عقائد و نظریات کے معاملہ میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت

سے اسی استناد (Authority) اور اسی معصومیت (Infallibility)

کا حامل ہے، جس طرح پورا کلیسا، وہ قانون ساز اور حج کی حیثیت

وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو پوری کلیسیا کو حاصل ہیں۔۔۔۔۔“

غور فرمائیے کہ پوری تاریخ اسلام میں آج تک کسی بھی عالم دین نے کبھی اس مطلق العنانی کا دعویٰ کیا ہے؟

۳۔ پھر عیسائی عقائد کے مطابق ”پوپ“ نظریاتی مسائل کا اعلان کرتے ہوئے

معصوم اور خطاؤں سے پاک ہوتا ہے، چنانچہ برٹانیکا میں ہے :-

”ہنذا پوپ کے در خصوصی امتیازات ہیں، ایک یہ کہ جب وہ مقتدر

اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عقائد کے بارے میں کوئی اعلان کرے تو وہ

معصوم اور غلطیوں سے پاک ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ مذہب

کے تمام پیروؤں پر حاکمانہ اختیار کامل (Sovereign

jurisdiction) رکھتا ہے، یہ دونوں استحقاقات جن کا دعویٰ اور

استعمال صدیوں سے پوپ کرتے آئے ہیں، ان کو جولائی ۱۸۷۰ء

کی ویٹی کن کونسل میں واضح دستوری شکل بھی دیدی گئی ہے“

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ ”پوپ“ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ ج ۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۳ ج ۱۸، مزید دیکھئے مقالہ ”معصومیت“ (Infallibility)

اس کے برخلاف یہ تمام علمائے اسلام کا متفقہ عقیدہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کوئی فرد معصوم نہیں ہے، اور ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے، چنانچہ علمائے اسلام پوری آزادی سے ایک دوسرے پر تنقید کرتے آتے ہیں، اور یہ سلسلہ عہدِ صحابہؓ سے اب تک جاری ہے، اسی کا نتیجہ ہو کہ کوئی مشہور سے مشہور عالم اگر شران و سنت کی تشریح میں کوئی غلطی کرے تو دوسرے تمام علماء اس کی گرفت کر کے اُدت کو اس کے نتائجِ بد سے محفوظ کر سکتے ہیں،

۴۔ پھر کلیسا میں جو سنٹر کارڈ نیل پوپ کا انتخاب کرتے اور اس کو مشورے دیتے ہیں ان کی نامزدگی خود پوپ صاحبِ تنہا کرتے ہیں، چنانچہ ”برٹانیکا“ میں ہے :-
سنٹر کارڈ نیل کی نامزدگی آجکل تنہا پوپ کا کام ہے، پوپ جن افراد کو خفیہ طور پر چھنتا ہے، ان کے ناموں کی اشاعت سے یہ کام مکمل ہو جاتا ہے اس کے لئے کسی اور ضابطے کی پابندی ضروری نہیں، ... اسی طرح سیکرڈ کالج کی وٹنگ یا منظوری کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کلیسا کے یہ ارباب اقتدار جو مذہب کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں ان کا تقرر حصّہ اہلیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خطوں میں مختلف علاقائی تعصبات کا رفسرما ہوتے ہیں، ”برٹانیکا“ ہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:-
”یاسہائے متحدہ امریکہ میں کلیسا دنیا کی ہر قوم کے مختلف گروپوں سے مرکب ہوتا ہے، لیکن انگریزی بولنے والی اقوام اکثریت میں ہوتی ہیں انیسویں صدی کے وسط تک آئرش اور جرمن اقوام کو سب سے زیادہ کوٹا حاصل تھا، ... ان کے علاوہ مشرقی کیتھولک اقوام مثلاً (یونانی، شامی اور آرمینی) ایک قابلِ لحاظ تناسب سے موجود ہیں۔“

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۸۵۵ ج ۲، مقالہ ”کارڈ نیل“

۲۔ ایضاً، مقالہ ”رومن کیتھولک چرچ“ ص ۴۲۱ ج ۱۹،

اس مختصر سے تعارف کے بعد پاپائی نظام کا موازنہ علماء اسلام سے کیجئے تو دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علماء اسلام کی نہ کوئی لگی بندھی تنظیم ہے، نہ کوئی فردِ واحد مذہبی معاملات میں حاکم اعلیٰ ہے، نہ کوئی شخص معصومیت اور غلطیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ دار ہے، نہ علماء کی کوئی مخصوص تعداد مختصر رہے جس پر اضافہ نہ ہو سکتا ہو، نہ کوئی شخص دوسرے علماء کی تنقید سے بالاتر ہے، نہ عالم کے منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی فردِ واحد کی اجازت اور منظوری درکار ہے، نہ اس منصب کے لئے کسی رنگ و نسل یا زبان و وطن کی کوئی قید ہے، بلکہ تاریخ اسلام میں اکثر سیاست خوروں کے پاس رہی، لیکن علماء عجمیوں بلکہ غلاموں کے خاندان سے پیدا ہوتے رہے، اور پورا عالم اسلام ان کے علم و فضل اور تقدس و تقویٰ کا لوہا مانتا رہا، لہذا جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں دخل اندازی کے لئے ان علوم میں بصیرت و جہارت درکار ہے تو اُس پر ”پاپائیت“ کا الزام عائد کرنا حقیقت اور انصاف کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے سوا کچھ نہیں، اس کے بجائے درحقیقت دینی علوم کی مثال دوسرے علوم کی سی ہے، جس طرح دنیا کے تمام علوم فنون کے بارے میں کسی شخص کی بات اُس وقت تک قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک اس نے اُس متعلقہ علم کو ماہرِ اساتذہ سے حاصل کر کے ان کا عملی تجربہ حاصل نہ کیا ہو، اسی طرح قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر میں کسی کی بات اُس وقت تک قابل قبول نہیں ہوگی جب تک اس نے متعلقہ علوم کو باقاعدہ حاصل کر کے ماہرِ اساتذہ کے زیر نگرانی اُن کا عملی تجربہ نہ کیا ہو، اگر اس بات کو کوئی شخص ”پاپائیت“ سے تعبیر کرتا ہے تو دنیا کا کوئی علم و فن اس ”پاپائیت“ سے خالی نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہاں ہمارا منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ علماء اسلام اور پاپاؤں کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ بات فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ پاپائیت کے نظام میں واقعہً کتنی خرابیاں اور کتنی اچھٹیاں ہیں؟ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے پروپیگنڈہ نے جہاں پاپائیت کی حقیقی خرابیوں کی نشان دہی کی ہے وہاں اسے محض بدنام کرنے کے لئے بہت سے الزامات غلط بھی لگائے ہیں جو اس پر عائد نہیں ہوتے، لیکن یہاں اس بحث کا موقع موقع نہیں ہے، محمد تقی

۲، قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تابع بنانا

تفسیر قرآن کے سلسلے میں دوسری عظیم گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات متعین کر لے، اور پھر قرآن کریم کو ان نظریات کے تابع بنانے کی فکر کر دے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے نشان دہی فرمائی ہے، قدیم زمانے سے باطل فرقوں، ظاہریتوں اور اپنے وقت کے فلسفے سے مرعوب لوگوں نے تفسیر قرآن میں یہی گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے، اور الفاظ قرآنی کو توڑ موڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ طرز عمل دنیا کے کسی بھی معاملہ میں حق و انصاف کے مطابق نہیں ہے، خاص طور سے قرآن کریم کے بارے میں یہ طریق کار اختیار کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس کے برابر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو ”ہدایت“ کی کتاب قرار دیا ہے، ”ہدایت“ کے معنی یہ ہیں کہ ”جس شخص کو منزل کا راستہ معلوم نہ ہو اسے راستہ دکھلانا“ لہذا قرآن کریم سے ”ہدایت“ حاصل کرنے کے لئے ناگزیر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس شخص کی طرح خالی الذہن رکھے جسے اپنی منزل کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کے بعد دل میں یہ اعتقاد پیدا کرے کہ قرآن کریم جو راستہ بتائے گا وہی میرے لئے صلاح و فلاح کا موجب ہوگا، خواہ اسے میری محدود عقل قبول کرے یا نہ کرے، اگر میری عقل ایسی ہی قابل اعتماد تھی کہ میں اس کے زور پر سب کچھ معلوم کر سکتا تھا تو پھر قرآن کریم کی طرت رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس اعتقاد کے ساتھ جب انسان قرآن کریم کی طرت رجوع کرے گا، اور ان آداب و شرائط کو ملحوظ رکھے گا جو قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں تو اسے بلاشبہ ہدایت حاصل ہوگی اور وہ منزلِ مراد کو پالے گا، اس کے برعکس اگر کسی شخص نے محض اپنی عقل کی بنیاد پر کچھ مخصوص نظریات اپنے ذہن میں پہلے سے بٹھالے، اور پھر قرآن کریم کو ان مخصوص نظریات کی عینک سے

پڑھنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے عقلی نظریات کی تائید حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی عقل پر اتنا بھروسہ کرتا ہو اور اپنی عقل کو قرآن کا سامنا نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنی عقل اور خواہشات کا خادم بنانا چاہتا ہو۔۔۔ قرآن کریم اسے ہدایت کی روشنی عطا کرنے سے بے نیاز ہے، ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہنچنے کے بجائے اپنی گمراہی کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے، اور اُسے ہدایت کی توفیق نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے:

يَسْتَكْبِرُ بِهِ كَيْدُهُمْ أَتَىٰ بَنِي إِسْرَٰءِيلَ

اللہ تعالیٰ اس (قرآن) کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے

اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے

لہذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے ذہن کو دوسرے نظریات خالی کر کے ایک طالب حق کی طرح قرآن کریم کی طرف رجوع کیا جائے، اور اس کی مراد سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہو، اُن کو حاصل کر کے اس کی تفسیر معلوم کی جائے، اور اس طرح جو کچھ ثابت ہو اس پر ایک سچے مومن کی طرح ایمان رکھا جائے، اور جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا اُسے اپنے ذہن پر یہ اعتماد نہ ہو اس کے لئے سیدھا راستہ یہ ہو کہ وہ خود ”تفسیر قرآن“ کی وادی میں قدم رکھنے کے بجائے اُن لوگوں کی تفسیر پر بھروسہ کرے، جنہوں نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کی ہیں، اور جن کی علمی بصیرت اور لٹریٹ وغدا ترسی پر اُسے زیادہ اعتماد ہو،

۳، زمانے کے افکار سے مرعوبیت

تفسیر قرآن کے سلسلے میں تیسری گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی نظریات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف رجوع کرے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں اُن نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے دے، یہ گمراہی دراصل دوسری

مگر اسی نے ذیل میں خود بخود آجاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرعوبیت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھائی ہے اس لئے یہاں اس مگر اسی کو مستقل طور سے ذکر کیا جا رہا ہے،

تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود رہی ہے جو قرآن و سنت کے علوم میں پختگی پیدا کئے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہ فلسفہ ان کے ذہنوں پر اس بڑی طرح مسلط ہو گیا کہ وہ اس کے بناء ہوئے فکر و نظر کے دائروں سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا، اور اس کی بہت سی باتیں انھیں اپنے آئینہ پرست فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انھوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحریف و ترمیم شروع کر دی، اور اس کے الفاظ کو کھینچ تان کر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنا کر انہیں شروع کر دیا،

جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے قرآن و سنت کے علماء میں پختگی پیدا کئے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا، اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بڑی طرح مرعوب ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے، ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے، اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ ناقابل تردید ہے، اور قرآن و سنت کی متواتر تفسیر اس کے لئے ہوئے فکری سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لئے اس تفسیر کو بدل کر قرآن و سنت کی ایسی تشریح کرنی چاہتے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ قرآن و سنت اور اسلام کے ساتھ ایک نادان دوستی تھی جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا، اور معتزلہ اور جہمیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کر دیئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نچتہ کار علماء دین جنہیں قرآن و سنت کے علوم میں رسوخ حاصل تھا، اور جو قرآن و سنت کے مقابلے میں وقت کے کسی چلے ہوئے نظام فکر سے مرعوب نہیں تھے، اُن کی ایک بڑی جماعت کو

دوسرے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہو جانا پڑا اور انہوں نے یونانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشان دہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلل اور مفصل تردید کی جو اس فلسفے کے اثر سے قرآن و سنت میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، غرض ایک عرصے تک فکری مباحث اور تصنیف و مناظرہ کا بازار گرم رہا، اور فریقین کی طرف اپنے اپنے موقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے،

بجۃ کار علماء دین کا موقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی نہیں اس خالق کائنات کی کتاب ہے جو اس دنیا اور اس میں ہونے والے واقعات کی رتی رتی سے باخبر ہے، اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہو سکتا، لہذا قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے بیان کردہ حقائق سدا بہار، اور ناقابل ترمیم ہیں، جن احکام و قوانین اور نظریات پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی تھی اُن کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معین بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرمادیئے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آسکیں، اور اُن کی روشنی میں ہر بدلے ہوئے ماحول میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہیں، یا جن کی واضح تفسیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلنے والی باتیں نہیں ہیں،

فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بیشتر نظریات جو قطعی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، اور جس زمانے میں جو نظریہ رائج رہا وہ لوگوں کے ذہن و فکر پر اس بُری طرح چھا گیا کہ لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ رہے، لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریے کی کاپی پلٹی تو وہی نظریہ اتنا بدنام ہوا کہ اس کو منہ سے نکالنا بھی دقت و سبب کی علامت بن گیا، اب اس کی جگہ کسی نئے نظریے نے ذہنوں پر اپنا سکہ بٹھایا، اور اس کی گھن گرج نے ہر مخالفت راستے کا گھلا گھونٹ دیا، پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن بان کھوی بیٹھا، اور کسی تیسرے نظریے نے اس کی جگہ لے لی، فکر انسانی

کی تاریخ میں ہمیشہ ہی ہوتا آیا ہے، اور جب تک حقیقت کی پیاس انسان کو قطعی مشاہد تک نہیں پہنچا دیتی اُس وقت تک یہی ہوتا رہے گا، اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح رہنمائی عطا کی ہے، وہ چونکہ ایک ایسی ذات کے بیان کئے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ واضح اور بے غبار ہیں، اس لئے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ بھولی کو اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا، آپ زمانے کے جس نظریہ سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے، ہو سکتا ہے کہ وہی نظریہ عہدِ جہالت کی یادگار ثابت ہو، اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرماتے لگیں،

راسخ العقیدہ اہل علم کا یہ طرز فکر تجربے سے بالکل سچا ثابت ہوا، آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور اس کے نہ صرف بہت طبعی، عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پائے، بلکہ اُن کی بنیاد پر مابعد طبعی (Metaphysical) نظریات کی جو عمارت اٹھائی گئی تھی، وہ بھی زمین بوس ہو چکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی جھک دمک سے خیرہ ہو کر قرآنِ سنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً اُن کی ندامت و شرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہتی،

لیکن حیرت ہے کہ سطح پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے متاثر و مرعوب ہو کر قرآن و سنت کی ایسی تفسیر گھڑنے کی فکر میں ہے جو مغرب کے چلے ہوئے نظریات پر فٹ ہو سکے، یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول اور معروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشقِ ستم میں مصروف ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی افکار کے مطابق بنا دیا جائے، یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل و تحریف کی مشق کر رہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جن نظریات کی خاطر وہ خدا کے کلام میں کھینچ تان کر رہے ہیں، وہ کتنے پائیدار ہیں؟

اور جب فکر انسانی کا قافلہ ان نظریات کو روند کر اور آگے بڑھے گا تو اس قسم کی تفسیروں اور تشریحات کا حشر کیا ہوگا؟

معجزات کا مسئلہ | نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانونِ تجاذب کا انکشاف کیا تو اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کے بارے میں ایک نظریہ مقبول عام ہو گیا، جسے ”میکانکی نظریہ حیات“ کہتے ہیں، اور سادہ لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ پوزیٹیو کائنات علت و معلول کے نظام میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس سے سہمہ تجارتا وز نہیں کر سکتی یہاں پائی جانے والی ہر چیز کی ایک فطرت یا نیچر ہے، جو اس کے لئے لازم ذات ہے، اور کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتی، مثلاً آگ کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلانے لگی، اس طرح فطرت کا اس سے الگ ہونا ممکن نہیں، چنانچہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آگ موجود ہو اور اس سے جلانے کی خاصیت ختم ہو جائے،

جب پوری دنیا میں اس نظریہ کا ڈمکا بجنا شروع ہوا تو مغرب کے مفکرین نے ایسے تمام واقعات کا مذاق اڑانا شروع کیا، جنہیں وہ مافوق الفطرت (Super Natural) سمجھتے تھے، اور جو ان کے دریافت کئے ہوئے علت و معلول کے نظریہ کے خلاف تھے، چنانچہ انھوں نے ہر اس چیز کو توہم پرستی قرار دیدیا جو عادی اسباب کے ماتحت واقع نہ ہوتی ہو، اس نظریے کی گھن گرج اور اس سے زیادہ مافوق الفطرت“ اشیاء کے استہزاء نے عالم اسلام کے بعض متجددین کو بھی انتہائی مرعوب متاثر کر دیا، اور جب انھوں نے دیکھا کہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے بہت سے معجزات مذکور ہیں جو اس نظریہ سے میل نہیں کھاتے، تو انھوں نے قرآن کریم کے الفاظ میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جس سے یہ سارے معجزات اہل مغرب کی اصطلاح میں ”مافوق الفطرت“ یا ”سپر نیچرل“ ہونے کے بجائے عادی اسباب کے ماتحت آجائیں، مثلاً علت و معلول کے مذکورہ بالا نظریہ کے مطابق جلانا آگ کی لازمی خاصیت تھی جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ

میں بیان کیا ہے، کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اُن کے لئے آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، چنانچہ عالم اسلام کے بعض مجدد و پسند لوگوں نے اس واقعے ہی سے سرے سے انکار کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی واضح آیتوں میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جو قرآن کی معنوی تحریف کی حد تک پہنچ گئی، اور جو تیرہ سو سال کے عرصے میں قرآنِ سنت کے کسی عالم کے دہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی، اور پوری اُمت کے برخلاف آیاتِ قرآنی کی اس تحریفِ معنوی کا جواز پیدا کرتے ہوئے سرسید احمد خان حنا نے لکھا:-

اُن کے (قدیم علماء اسلام کے) زمانے میں نیچرل سائنسز نے ترقی نہیں کی تھی، اور کوئی چیز اُن کو قانونِ فطرت کی نظرِ رجوع کرنے والی اور انکی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی، پس یہ اسباب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ اُن کی کافی توجہ قرآن مجید کے الفاظ کی طرف نہیں ہوئی، مثلاً..... حضرت ابراہیم کے قصے میں کوئی نقص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، مگر انھوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا۔

حالانکہ احادیث و روایات سے قطع نظر، خود قرآن کریم کے الفاظ اس واقعے سے متعلق یہ ہیں:-

قَالُوا احْرَقُوْهُ وَاَنْصُرُوْا آلَ الْاِثْمِ كُمْ اِنْ كُنْتُمْ قَاعِلِيْنَ ؕ قُلْنَا يٰۤاَكَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّاَوْسَدًا مَّا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ؕ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمْ اِلَآءَ الْخٰسِرِيْنَ ؕ (انبیاء، ۵۷)

”ان سب کافروں نے کہا کہ اس (ابراہیم) کو جلادو اور اپنے دیوتاؤں کی

مدد کر د اگر تم کو تاجا ہے ہو، ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد
اور سلا متی بن جا، اور انھوں نے ابراہیم کے ساتھ مکر کا ارادہ کیا، پس ہم نے
ان کو ان کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْفُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۚ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا
فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ،

”انھوں نے کہا اس کے لئے ایک عمارت بناؤ اور اس کو دکھتی آگ میں ڈال دو“

پس انھوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو ہم نے ان کو پست اور ذلیل کر دیا۔

ان واضح اور صریح الفاظ پر تحریف و تاویل کی مشق ستم صرف اس بنا پر کی گئی کہ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ سلامت نکل آنے کا یہ واقعہ مغرب کے رائج الوقت
”نیچرل سینس“ کے خلاف تھا، چنانچہ سر سید احمد خان صاحب اور ان کے ہم نوا دوسرے
تجدد پسندوں نے مغرب کی اس ”نیچرل سینس“ کی خاطر نہ صرف تفسیر قرآن کے تمام
اصولوں کو باطل کیا اور قرآن کریم کے الفاظ میں کھینچ تان شروع کی، بلکہ اسلام کے
بنیادی عقائد میں سے معاد جسمانی جیسے عقائد پر بھی خط نسخ پھیر دیا، ملائکہ، شیاطین
اور جنات کو بھی توہم پرستی قرار دیر دیا، انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات کو ”ما فوق الفطرت“
کہہ کر ان کے منکر ہو گئے، اور اس غرض کے لئے پورے قرآن کو شاعرانہ تمثیلات کا مجموعہ
بنا کر رکھ دیا، ایسے لوگوں کی تفسیریں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم نے انبیاء
علیہم السلام کے تمام واقعات اپنے سیدھے سادے اسلوب کے بجائے تمثیلات کے معمول
میں بیان کئے ہیں جن کا انکشاف تیرہ سو سال بعد پہلی بار ان فدا یان مغرب پر ہوا ہے،
قرآن کریم کے واضح اور صریح لفظ کو من مانے مجازی معنی پہنا دینا ان حضرات کا ایک
معمولی کھیل ہے، جس کی بے شمار مثالیں ان کی تفسیروں میں ملتی ہیں، اور اس تمام
کدو کاوش کا منشاء سر سید احمد خان صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

”مجب معجزات کو ما فوق الفطرت قرار دیا جاوے جن کو انگریزی میں
”سپر نیچرل“ کہتے ہیں، اور اس سے انکار کرتے ہیں اور ان کا وقوع

ایسا ہی ناممکن قرار دیتے ہیں، جیسے کہ قوی وعدے کا اقرار نہ ہونا، اور
 علانیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے، جو فوق
 الفطرت ہو، اور جب کوئی معجزہ قرار دیتے ہو، اور اگر فرض محال خدا کی
 قدرت کے حوالے پر اس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بے فائدہ امر ہوگا۔

اس کے برخلاف علماء اسلام کا موقف یہ تھا کہ معجزات کا وقوع عقلی طور پر کوئی
 محال نہیں ہے، ہاں یہ واقعات خلاف عادت ضرور ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جب
 اپنے کسی پیغمبر کی حقانیت ہر عامی اور اُن پڑھ کے سامنے ثابت کرنا چاہتا ہے تو
 ان کے ہاتھ پر ایسے حیرت انگیز خلاف عادت کام ظاہر کر دیتا ہے، جنہیں دیکھ کر
 ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ اللہ کے اس پیغمبر کو تاہید خداوندی حاصل ہے، مگر چونکہ مغرب میں
 نیچرل سائنس کا سکہ چلا ہوا تھا، اس لئے سرسید صاحب وغیرہ یہ بات کہتے ہوئے شرماتے تھے،
 لیکن قدرت خداوندی کا یہ کرشمہ ملاحظہ فرمائیے کہ جس وقت سرسید احمد خان صاحب
 اور اُن جیسے دوسرے متجددین ”نیچرل سائنس“ کی خاطر تمام انبیاء کے معجزات کا انکار کر رہے
 اور اس غرض سے قرآن کریم کی آیات پر تحریف و تاویل کی مشق کی جا رہی تھی، ٹھیک
 اسی زمانے میں سائنس کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو رہا تھا، نیوٹن کے
 نظریات نئی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہے تھے، اور آئن سٹائن اپنا انقلابی
 نظریہ اضافیت کی داغ بیل ڈال رہا تھا، جس نے سائنس کے گزشتہ مفروضات کی کایا پلٹ کر
 رکھ دی، اور اس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں جس ایٹمی سائنس کا ڈھکاجا اس نے قانون
 کشش اور قانون علت و معلول کو رد کر کے نیچرل اور سپرنیچرل کی تفریق ہی ختم کر ڈالی، چنانچہ
 عہد حاضر کا ایک عظیم اور مسلم سائنس دان سر آر تھو ایڈنگٹن (Eddington)
 لکھتا ہے :-

”سائنس کی تحقیقات سے استنباط کی کسی اندرونی ذاتی ولایت نفع

خاصیت یا ماہیت و نوعیت (نچر) کا بہ نہیں چلتا ۱۱

اور اس طرح :-

”ایک اہم نتیجہ خارجی دنیا میں قانون علت کے ختم ہونے کا بہ نکلتا کہ فطرت اور فوق الفطرت کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا“
سائنس کے مسلمات میں یہ زبردست انقلاب کس طرح رُونما ہوا، اس کی مختصر سرگزشت
ہمارے دُور کے مشہور سائنٹسٹ سر جیمز جینز (Sir James Jeans)
کی زبانی سنئے :-

”گیلیلے اور نیوٹن کی عظیم سترہویں صدی کی یہ بڑی عظیم کامیابی اور فتح
مان لی گئی تھی کہ کائنات میں ہر مابعد کا تغیر و تبدل یا تخلیق اپنے قبل
کا ناگزیر نتیجہ و لازمہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ ساری کائنات فطرت (نچر)
کی پوری تاریخ آخر تک لازمی اور ناگزیر نتیجہ اس ابتداء کا ہے جس میں دُ
پہلے دن تھی،

اس تصور ہی کا لازمہ وہ تحریک تھی جس نے ساری مادی کائنات
کو بس ایک مہین بننا اور سمجھا لیا تھا، یہ صورت حال انیسویں صدی کے
آخر تک مسلم اور جاری رہی، اور ساری نچرل سائنس کا واحد مقصد
اس کائنات کو مشینی ساخت (میکانکس) میں تبدیل و تحویل کر دینا
بن گیا.....

پھر اسی انیسویں صدی کے آخر مہینوں میں برلن کے ماکس پلانک
(Max Plank) نے کوانٹم نظریہ کی بنیاد ڈالی، جو بالآخر
ترقی کر کے جدید طبیعیات (فزکس) کا ایک ہمہ گیر اصول قرار پا گیا جس نے

Eddington ; The Nature of Physicals World P 303

ماخوذ از ”مذہب سائنس“ از مولانا عبدالباقی نعیمی، ص ۸۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء

آئے ہیں کر سائنس کے میکائی عہد کا خاتمہ کر کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔
ابتداء میں پلاننگ کے نظریہ سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ کائنات فطرت میں تسلسل کا عمل
کا رفرما نہیں، لیکن ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے بتایا کہ پلاننگ کا نظریہ دراصل بہت یاد
انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے اور بقول جیمز جینز :-

”یہ نظریہ اس قانون علت و معلول ہی کو اپنی فرمانروائی کے تحت آمارنے
والا ہے جسکو اب کائنات کے ایک ہمہ گیر مہیا اسوں کا مقام حاصل تھا
پرانی سائنس کا قطعی اعلان اور دعویٰ تھا کہ فطرت (نچس) سلسلہ علت و
معلولات کے بند سے ہوئے قوانین سے یا ہر ایک قدم نہیں نکال سکتی، علت
”الف“ کے بعد ناگزیر طور پر ”ب“ کے معلول ہی کو پیدا یا ظاہر ہونا چاہئے،
لیکن نئی سائنس اب صرف اتنا دعویٰ کر سکتی ہے کہ ”الف“ کے بعد ”ب“،
”ج“ وغیرہ کے یوں تو بے شمار امکانات ہیں، البتہ اتنا صحیح ہے کہ ان میں
”الف“ کے بعد ”ب“ کا نمودار ہونا ”ج“ کے مقابلے میں اور ”ج“ کا ”د“ کے
مقابلے میں اغلب ہے،

جیمز جینز نے بتایا ہے کہ اس اعلیٰ قوت یا ظن غالب کے سوا کسی نام نہاد علت کے بعد
کسی خاص نام نہاد معلول ہی کے پیدا ہونے کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے
نہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، بلکہ :-

This is matter which Lies on the kness
of gods whatever gods there be.

یہ معاملہ طیغ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے جس کو بھی خدا کہا جائے۔

غرض بیسویں صدی میں ایسی تجربات کی روشنی میں جو سائنس پر دان چڑھی ہے

۱۔ جیمز جینز کی کتاب ”پراسرار کائنات“ (Mysterious Universe)

ص ۲۴ تا ص ۳۲ ماخوذ از مذہب سائنس، مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۳ تا ۸۵،

انسان پرانے تصورات کو جڑ مٹا ہی سے ختم کر دیا ہے کہ کائناتی اشیاء کی خاصیتیں ان اشیاء سے مجزا نہیں ہو سکتیں، اور آگ سے جلائے کی صفت کو کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا، اب سائنس کا کہنا یہ ہے کہ آگ اکثر بیشتر جلاقی مزدور ہے، اور غالب گمان یہی ہے کہ جہاں آگ ہوگی وہاں تپش اور جلن پائی جائے گی، لیکن اگر کبھی اس کے خلاف ہو جائے تو یہ نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ سائنسی مستلزمات اس کی تردید کر سکتے ہیں، لہذا آج کا سائنس دان معجزات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کر سکتا ہے، اُن کو ناممکن کہہ کر اُن کا اصولی انکار نہیں کر سکتا، شاید یہی وجہ ہو کہ بیسویں صدی میں مغرب کے عوام پھر اُن چیزوں کی طرف لوٹ رہے ہیں جنہیں وہ پہلے ”ما فوق الفطرت“ سمجھ کر توہم پرستی متراکب کر رہے تھے، انتہا یہ ہے کہ بعض اطلاعات کے مطابق مغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں ”جادو“ سکھانے کے لئے باقاعدہ شعبے قائم ہونے لگے ہیں،

پھر تجدد پسندوں کی ذہنیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ زمانے کے عام شور و غضب سے متاثر و مدعوب ہو کر بڑی جلدی سے ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، اور معاملے کی پوری تحقیق کئے بغیر ہی اُس رائے پر فکر و نظر کی پوری عمارت کھڑی کر لیتے ہیں، معجزات کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے کہ جن وقت سرسید احمد خان صاحب اور اُن کے ہم فواد و مر متجددین معجزات کو ”ناممکن“ متراکب کر رہے تھے اس وقت مغرب میں عام شور تو بیشک اُن کے انکار ہی کا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ فلسفہ اور سائنس کی دنیا کے تمام لوگ ہیوم اور ہکسلے کی طرح معجزات کے منکر ہوں، بلکہ بہت سے ممتاز سائنس دان اُس وقت بھی معجزات کے قائل تھے جن میں نیوٹن، فرانز، سمپسن، کیلون، اور کسٹر بطور خاص قابل ذکر ہیں، اور جرمنی کے مشہور سائنس دان لوٹزر () نے تو معجزات کی تائید میں بڑے معرکے کے مضامین لکھے ہیں، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات کسی بھی طرح عقل یا سائنس کے خلاف نہیں ہیں؛

۱۔ ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۸۷ و ۵۸۸، مطبوعہ ۱۹۵۷ء، مقالہ ”معجزہ“
(باقی صفحہ اگلے صفحہ پر)

اور پھر حاضری کے سائنس دانوں کے جو اقوال پیش کئے گئے ہیں ہم نے اُن کو قرآن کریم کی صداقت اور حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا، کیونکہ قرآن کریم کی سچائی ان اقوال کی تائید سے بے نیاز ہے، وہ اُس وقت بھی سچا تھا، جب سائنس داں مافوق الفطرت اشیاء کا مذاق اڑاتے تھے، اور آج بھی سچا ہے، جب سائنس داں خود مافوق الفطرت اشیاء کے امکان کو تسلیم کر رہی ہے، اور اگر بالفرض کل سائنس کے نظریات دوبارہ بدل جائیں تو اس کی سچائی میں اس وقت بھی ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی، لیکن یہ اقوال ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے پیش کئے ہیں، کہ جن لوگوں نے مروجہ نظریات سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کی تفسیر میں کتر ہیونت کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی بنیاد کس قدر کمزور اور ناپائیدار تھی، انھوں نے ایک ایسے کلام کو وقتی نظریات کے پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی تھی، جس کا علم ماضی مستقبل کی تمام وسعتوں کو محیط ہے، اور جس کے آگے فکر انسانی کی تمام کاوشیں بچوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں،

لہذا اگر قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تالچ بنانے کے بجائے اُس سے واقعہ رہنمائی حاصل کرنی ہے، تو اسے رائج الوقت نظریات کی عینک سے پڑھنے کے بجائے اُس طرح پڑھتے جس طرح سرکارِ دُعا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے پڑھا تھا، اور اس کی تشریح و تفسیر کے وقت مروجہ افکار کے شور و غل سے متاثر ہونے کے بجائے وہ اصول استعمال کیجئے جو تفسیر کے فطری معقول اور واقعی اصول ہیں، ان اصولوں کے ذریعہ

رقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (Miracle) اس مقالے میں تقریباً اسی کاروائی نے معجزات کے امکان اور ضرورت پر اچھی بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات نہ صرف عقل اور سائنس کی رُو سے ممکن ہیں بلکہ انکی ضرورت ناقابل تردید ہے، اس کے علاوہ معجزہ کے موضوع پر مندرجہ ذیل کتابیں بطور خاص قابل مطالعہ ہیں: (۱) سیرۃ النبیؐ (۲) اتا ص ج ۳، باب مؤلف مولانا عبدالباری ندوی، (۲) موقف العقل والعلم والعالم، مؤلف شیخ مصطفیٰ صبری بک، (۳) اسلام اور معجزات، مؤلف حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ،

جواب قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اُسے جھینپ جھینپ کر اور شرما شرما کر نہیں، بلکہ پورے یقین و ایمان اور خود اعتمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیجئے، اور زمانے کے مردِ جنسِ نیاں ہزار اس کے خلاف ہوں، یہ یقین رکھئے کہ حق دہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کر دیا، اگر انسانیت کی قسمت میں کوئی فلاح بھی ہے تو وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کے بیان کئے ہوئے حقائق تک پہنچ کر رہے گی،

خلافتِ عقل اور ماورائے عقل | یہاں ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر خلافتِ عقل کے معنی معروف اصول و قواعد کے مطابق کوئی ایسی بات قرآن کریم کی طرف منسوب ہوتی ہو جس کے بارے میں ہم جدید تحقیقات کی روشنی میں کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں کہ وہ عقل یا مشاہدے کے خلاف ہو تو پھر قرآن کریم کی اسی قدیم تفسیر پر اصرار کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مترآن کریم کی باتوں کو قطعی مشاہدات کے خلاف قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کریں جو یقینی مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکی ہے،

اس کا جواب یہ ہو کہ مترآن کریم کی جو تفسیر قطعی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہو، وہ آج تک کبھی عقل یا قطعی مشاہدے کے خلاف ثابت نہیں ہوئی، چودہ سو سال کے عرصے میں علمی تحقیقات و انکشافات میں سینکڑوں انقلاب آئے، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مترآن کریم کی کوئی قطعی البتہ تفسیر مشاہدے کے خلاف پڑی ہو، اور چونکہ مترآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قوی اور علی تفسیر ہی کے لئے مبعوث کیا گیا تھا، لہذا آپؐ کی بیان کردہ ہر تفسیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت کے مطابق ہے، اور آپؐ کی کوئی تفسیر آئندہ بھی عقل یا مشاہدے کے خلاف نہیں ہو سکتی،

البتہ اس معاملے میں غلطی دو طرح لگتی ہے :-

(۱) جو لوگ زمانے کے مروجہ نظریات سے بہت جلد مرعوب ہو جانے کے عادی ہیں، وہ کسی چیز کے خلاف عقل ہونے کا فیصلہ بہت جلد کر ڈالتے ہیں، یہ ایک طے شدہ

مسئلہ ہو کہ ہر حیرت انگیز چیز خلاف عقل نہیں ہوتی، اور نہ ہر اُس چیز کو ناممکن کہا جاسکتا ہے جس کے اسباب سمجھ میں نہ آئے ہوں، ایسی چیز کو مستبعد (improbable) غیر معمولی (Extra ordinary) یا حیرت انگیز (astonishing) تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو ناممکن (impossible) کہنا خود خلاف عقل ہوگا جو شخص متعلقہ فن سے واقف نہ ہو اس کے لئے یہ بات قطعی ناقابل فہم ہے کہ دائر لیس سیٹ میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے انسان کی آواز کس طرح سُنائی دے رہی ہے؟ اور اگر کسی دیہاتی کے سامنے یہ بات کہی جائے تو عجب نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دائر لیس سیٹ میں دور دراز کے کسی آدمی کی آواز سنائی دینا ”خلاف عقل“ یا ”ناممکن“ ہے، بعض حضرات قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے، بلکہ ہر اُس چیز کو ”خلاف عقل“ یا ”ناممکن“ قرار دیتے ہیں جو محض حیرت انگیز یا زیادہ سے زیادہ خلاف عادت اور مستبعد (improbable) معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث وغیرہ میں اس قسم کی باتوں کا پایا جانا ہرگز محل تعجب نہیں، ہم کتاب کے شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ وحی نبوت کا آغاز ہی اُس مقام سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وحی و رسالت کے سلسلے کا تو مقصد اصلی یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو اُن باتوں سے باخبر کیا جائے جنہیں وہ محض عقل کے ذریعے نہیں جان سکتا، چنانچہ اگر وحی و رسالت کا سلسلہ نہ ہوتا تو عقل معاد و آخرت حساب و کتاب، جنت و جہنم اور ملائکہ وغیرہ کا ادراک از خود نہیں کر سکتی تھی، ورنہ اگر یہ ساری باتیں نری عقل سے معلوم ہو سکتی تھیں تو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمانے، اُن پر وحی نازل کرنے اور انھیں آسمانی کتابیں دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، لہذا اگر وحی اولہ رسالت پر ایمان ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم کے اس ذریعے سے ہمیں بہت سی باتیں ایسی معلوم ہوں گی جو محض عقل سے معلوم نہ ہو سکتی تھیں، اور جن کا ادراک و تصور عقل کے لئے مشکل تھا،

اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ قرآن و حدیث میں ایسی حیرت انگیز چیزوں کا وجود ان کے

موضوع کے لحاظ سے بالکل مناسب بلکہ ضروری ہے، تو قرآن کریم کی کسی ظاہر و منہاد اور ادراجاعی تفسیر کو محض اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے ایک حیرت انگیز بات ثابت ہوتی ہے، تاوقتیکہ وہ بات واقعہً خلاف عقل یعنی ناممکن اور محال نہ ہو، لیکن قرآن کریم کی قطعی تفسیروں میں آج تک کوئی بات ایسی ناممکن اور خلاف عقل ثابت نہیں ہو سکی، اور نہ قیامت تک ہو سکتی ہے، اس مسئلے کی مزید تفصیل و تشریح ہم انشاء اللہ اگلے باب میں اصول تفسیر کے تحت کریں گے،

(۲) دوسری غلطی بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی تفسیر قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، نہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی قطعی تفسیر سے، نہ امت مسلمہ کے اجماع سے، اس کے باوجود وہ تفسیر عام لوگوں میں اتنی مشہور ہو جاتی ہے کہ لوگ اسے یقینی اور قطعی تفسیر سمجھنے لگتے ہیں، اور جب وہ عقل کی کسی قطعی دلیل یا مشاہدے کی بنا پر غلط ثابت ہوتی ہے تو بعض نادان لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں، اور بعض قرآن کریم یا اس کی یقینی اور قطعی تفسیروں کے بارے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اسی طرح خلاف عقل ہو سکتی ہیں، لہذا ایسے موقع پر یہ دیکھنا چاہو کہ قرآن کریم کی جو تفسیر عقل کی کسی دلیل قطعی یا مشاہدے کے خلاف معلوم ہو رہی ہے وہ کس کی ہے؟ محض عام شہرت کی بنا پر اسے یقینی تفسیر سمجھ لینا غلط ہے،

یہ بحث ”اصول تفسیر“ کے تحت قدرے تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے، کہ جب عقلی اور نقلی دلائل میں تضاد معلوم ہو تو صحیح راہ عمل کیا ہے؟ اُس موقع پر اس بحث کو ضرور دیکھ لینا چاہیے،

۴۔ قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا،

تفسیر قرآن کے بارے میں چوتھی گمراہی یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھتے، اور اس میں وہ باتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے موضوع سے خارج ہیں، مثلاً بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم

سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق مستنبط کئے جائیں، اور سائنس کے مسلمات کو قرآن سے ثابت کیا جائے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن سے سائنس کے یہ مسائل ثابت ہو سکیں تو معاذ اللہ! یہ قرآن کریم کا نقص ہوگا، چنانچہ وہ پورے خلوص کے ساتھ قرآنی آیات سے سائنسی مسلمات ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہناتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے، اس میں اگر کہیں کائناتی حقائق کا ذکر آیا ہے تو ضمنی طور سے آیا ہے، لہذا اگر اس میں کہیں کوئی سائنٹفک حقیقت واضح طور سے مل جائے تو اس پر تو بلاشبہ ایمان رکھنا چاہئے، لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے اُسے زبردستی نکالنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں قانون کے مسائل تلاش کرنے لگے،

قرآن کریم نے اپنا موضوع اور مقصد نزول مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ بیسیوں آیات میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اُسے کیوں نازل کیا گیا ہے؟ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ هُدىً بِهٖ اللَّهُ مَتِّعَ النَّبِيعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (مائدہ: ۱۶ و ۱۷)

”تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور کتاب واضح

کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضاء حق کے طالب ہوں

سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر

نور کی طرف لے آئے ہیں، اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں۔“

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى قِتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَمَن يُزِره (مائدہ: ۱۹)

اے اہل کتاب تمھارے پاس یہ ہمارے رسول آپہنچے ہیں جو تم کو صاف صاف بتلا۔ تمہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ (عرسہ) موقوف تھا، تاکہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا نہ آیا، نہ ڈرانے والا، تو اب تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ ۖ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلِّ جَعَلْنَا مَتَكُمْ شُرْعَةً وَ مِنْهَا جَاهُ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَأَسْبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۖ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (مائده: ۴۸)

ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے، جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو (آسانی) کتابیں ہیں اُن کو بھی تصدیق کرتی ہے، اور ان کتابوں کی محافظ ہو تو اُن کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے، اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر اُن کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے، تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقہ تجویز کیا تھا، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے، لیکن ایسا نہیں کیا، تاکہ جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرما دیں، تو میکوں کی طرف دوڑو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے، پھر وہ تم سب کو جلا دیگا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

وَكَذَٰلِكَ نَقُصُّلُ الْآيَاتِ وَلِيُذَكِّرَ الَّذِينَ فِي السَّبِيلِ سَبِيلَ الْمَجْرُمِينَ ۖ (انعام: ۵۵)

”اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جاوے

طریقہ گنہگاروں کا“

كِتَابُ أَنْزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَوزٌ مِنْهُ لِتُنْذِرَ بِهِ
وَذِكْرٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (اعراف: ۱)

یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعے (لوگوں کو نافرمانی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں کسی کے نہ ماننے سے بالکل تنگی نہ ہونی چاہئے، اور یہ نصیحت ہے ایمان والوں کی۔
أَوْعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ
لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (اعراف: ۶۴)

گیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا بشر ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈراوے، اور تاکہ تم ڈرجاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے“

تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْحَكِيمَةِ هَدَىٰ وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ
الَّذِينَ يُتِمُّونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُونَ (لقمان اتا ۴)

یہ آیتیں ہیں ایک پُر حکمت کتاب کی، جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور وہ لوگ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں“

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ أَمْ يَقُولُونَ
اُفْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا آتَاهُمْ مِنْ
نَذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (سجده: ۳)

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں، یہ رب العالمین کی طرف

سے ہے، کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے
دل سے بنالیا ہے، بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے، تاکہ
آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا
نہیں آیا تھا، تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں۔

تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لَتُنذِرَنَّهُمْ كَمَا أَنْذَرَ آبَاءَهُمْ
فَهُمْ غَافِلُونَ (یس: ۶۵)

”یہ قرآن خدا کے زبردست ہر بان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ آپ
ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادا سے نہیں ڈرائے گئے تھے، سو اسی
بے خبر ہیں۔“

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ بِالْحَقِّ فَاْعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ
الْدِّينَ، (زمر: ۲)

”ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے، سو آپ خاص
اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کیجئے۔“

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ
حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ، فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ
فَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (شوری: ۷)

”ہم نے اسی طرح آپ پر قرآن عربی وحی کے ذریعے نازل کیا ہے، تاکہ آپ
مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد ہیں، ان کو ڈرائیں، اور
جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت) سے ڈرائیں، جس میں ذرا شک نہیں،
ایک گروہ جنت میں ہوگا، ایک گروہ دوزخ میں۔“

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِّ عِصْيَةٍ مِنَ الْأَمْوَاقِ يَتَّبِعُهَا وَلَا تَشْتَعِ أَهْوَاءُ
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ، إِيَّاهُمْ لَنْ يُعْذَرَ عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا
وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَبِالْمُتَّقِينَ

هَذَا ابْصَارُ النَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةُ لِقَوْمٍ يُؤْقِنُونَ ۝

(الجاثية: ۲۰ تا ۲۸)

پھر ہم نے آپ کو (دین کے) ایسے ناسطریقے پر گردیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جایئے، اور ان ہنہامہ کی خواہشوں پر نہ چلئے، یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے، اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا، یہ قرآن عام لوگوں کے لئے بصیرت اور ہدایت (پر مشتمل ہے) اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت رکھتا ہے۔
 اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْكِتَابِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَّثَانِي تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ كَلَّيْنُ مَجْلُودُهُمْ وَقَالُوا بِهِمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكِ هُدًى لِّلَّذِينَ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ رَّزْم: ۲۳)

”اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (قرآن) نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہو کہ باہم ملتی جلتی ہے، (اور جس میں ضروری باتیں) بار بار دہرائی گئی ہیں جس اُن لوگوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے، جس کو وہ چاہتا ہے اس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا ہے اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اُس کا کوئی ہادی نہیں“

یہ محض چند مثالیں ہیں، اور اگر صرف انہی پر غور کر لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد انسان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم و ترغیب ہے، اور جتنی باتیں اس میں تاریخی واقعات یا کائنات و آفاق سے متعلق آئی ہیں وہ سب اسی بنیادی موضوع کی تائید و تقویت کے لئے آئی ہیں، لہذا اگر اس میں سائنس کا کوئی مشہور مسئلہ موجود نہ ہو تو نہ یہ کوئی عیب کی بات ہے نہ تعجب کی، کیونکہ یہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر

ماضی یا مستقبل کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں نہ ملے تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں جستہ جستہ واقعات عبرت اور موعظت کے لئے بیان کئے گئے ہیں،

اس سے بعض اُن غیر مسلموں کا اعتراض بھی دُور ہو جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک نے جن علوم و فنون کے ذریعے مادی ترقی کی ہے، اُن کے بارے میں قرآن کریم نے کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اور اُن لوگوں کی غلط فہمی بھی دُور ہو جاتی ہے جو ان اعتراضات سے متاثر ہو کر اس فکر میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے سائنس وغیرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جائے، کیونکہ اس کوشش کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص قانون کی کسی کتاب پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ کیوں مذکور نہیں؟ تو اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص قانونی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے ایٹم کی تصویری نکالنے کی کوشش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ اُس اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک مذاق ہوگا، اسی طرح جو شخص قرآن کریم میں سائنس اور انجینئرنگ کے مسائل نہ ہونے پر معترض ہو، اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے سائنس کے مسائل زبردستی نکالے جائیں، بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نہ سائنس یا انجینئرنگ کی کتاب ہے اور نہ مادی ترقی حاصل کرنے کے طریقے اس کا موضوع ہیں، چونکہ یہ ساری باتیں انسان اپنی عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی محنت و کاوش اور تحقیق و جستجو پر چھوڑ دیا، اور ان باتوں کو قرآن کریم کا موضوع بنایا جو محض انسانی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں، بلکہ اُن کے ادراک کے لئے وحی الہی کی رہنمائی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچ گیا، لیکن ایمان و یقین کی دولت، قلب دُرُوح کی پاکیزگی، اعمال و اخلاق کی تطہیر، اللہ کے ساتھ بندگی کا تعلق اور آخروی زندگی سنوارنے کا جذبہ جو وحی الہی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اور جسے قرآن کریم نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ عقل و فکر کی اس حیرت انگیز ننگ نانا

کے بعد بھی انسان کو نہ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ اُس وقت تک حاصل ہو سکتا ہے جب تک اس معاملے میں سچے دل سے قرآن کی رہنمائی حاصل نہ کی جائے،

ہماری اس گزارش کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم سے سائنس کا کوئی مسئلہ اخذ کرنا علی الاطلاق کوئی جرم ہے، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ قرآن کریم میں ضمنی طور سے سائنس کے بہت سے حقائق کا بیان آیا ہے، چنانچہ جہاں اس کی کسی آیت سے کوئی واضح سائنٹفک بات معلوم ہو رہی ہو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس معاملے میں درجہ ذیل غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے:-

(۱) سائنس کی جو بات قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ضمناً مذکور ہے، اس کا اصل مقصد ان حقائق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور اس کے ذریعے ایمان میں پختگی پیدا کرنا ہے، لہذا اس بنیاد پر قرآن کریم کو سائنس کی کتاب سمجھنا یا باور کرنا بالکل غلط ہے،

(۲) جہاں سائنس کے کسی مسئلے کی مکمل وضاحت موجود نہ ہو وہاں خواہ مخواہ الفاظ اور سیاق و سباق کو توڑ موڑ کر سائنس کی کسی دریافت پر چسپاں کرنے کی کوشش کسی طرح درست نہیں، یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی؛

جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور دوسرے سیارے اس کے گرد حرکت کرتے ہیں تو بعض لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کی، اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا گیا:-

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّكَ مُتَرَاوِعًا

یا وہ ذات لائق عبارت ہو جس نے زمین کو

جائے قرار بنایا

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ”جائے قرار“ کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے، حالانکہ قرآن کریم کا مقصد تو یہ بیان کرنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ تم زمین پر ڈھونڈاؤ دل رہنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ رہتے ہو، اور اس میں لیٹنے،

بیٹھے اور قرار حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی تکلیف برداشت کرنی نہیں پڑتی، اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا زمین کی حرکت و سکون سے کوئی تعلق نہیں بلکہ زمین متحرک ہو یا ساکن، یہ نعمت ہر صورت میں انسان کو حاصل ہے، اس لئے اس آیت سے زمین کو ساکن ثابت کرنا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے،

پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو بعض حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور مندرجہ ذیل آیت کو حرکت زمین کی تائید میں پیش کر دیا:-

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدًا وَهِيَ
تَمْرُجُ مَرَّ السَّحَابِ ۚ

”اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ یہ جامد ہیں اور یہ بادل کی طرح چل رہے ہوں گے“

ان حضرات نے یہاں ”تَمْرُجُ“ کا ترجمہ ”چل رہے ہوں گے“ کے بجائے ”چل رہی ہیں“ کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت میں زمین کی حرکت کا بیان ہے، کیونکہ پہاڑوں کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین چل رہی ہے، حالانکہ آیت کا سیاق و سباق (Context) صاف بتا رہا ہے کہ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے، اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے پہاڑ جھینس تم اپنی جگہ اٹل سمجھتے ہو فضا میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے، لیکن قرآن کریم سے سائنس کے مسائل مستنبط کرنے کے شوق نے سیاق و سباق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا،

واقعہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے قرآن کریم خاموش ہے، اور پورے قرآن میں کہیں اس مسئلے کا بیان نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بات اس کے موضوع سے خارج ہے، نہ قرآن سے زمین کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ سکون، لہذا سائنس کے دلائل کے لحاظ سے اس میں سے جو نظریہ بھی اختیار کیا جاتے قرآن اس میں مزاحم نہیں ہوتا، اور نہ اُس سے دین و ایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے،

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ قرآن سے سائنٹفک مسائل متنبط کرنے کی کوششیں بسا اوقات بڑے خلوص کے ساتھ کی جاتی ہیں، اور اس کا منشأ غیر مسلموں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو! جو بات تم نے صدیوں کی محنت کے بعد معلوم کی ہے وہ ہمارے قرآن میں پہلے سے موجود ہے، لیکن درحقیقت اگر یہ استنباط اصولی تفسیر کو توڑ کر کیا گیا ہے تو یہ قرآن کے ساتھ نادان دوستی کے سوا کچھ نہیں جس وقت لوگ قرآن سے زمین کا ساکن ہونا ثابت کرنا چاہ رہے تھے، وہ بزرگم خود اسے قرآن کی خدمت تصور کرتے تھے، لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی اور عالمگیر طور پر یہ مان لیا جاتا کہ قرآن زمین کے ساکن ہونے کا قائل ہے تو آج جبکہ زمین کو ساکن سمجھنا سائنس کے نقطہ نظر سے کلمہ کفر کے مراد ہو گیا ہے قرآن کے ساتھ یہ نادان دوستی کیا نتائج پیدا کرتی؟ لہذا سائنس کے بارے میں جو باتیں قطعی طور قرآن کریم میں موجود ہیں انھیں تو قرآن کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن جن باتوں کی قطعی وضاحت قرآن نے نہیں کی، ان کو خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کرنا نکل بھی غلط تھا اور آج بھی غلط ہے۔

—————

۱۷ اس مسئلہ کی مزید تفصیل و شرح کے لئے ملاحظہ ہو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب ”الانتباہات المفیدۃ“ اور اس کی محل الانتباہات“ انتباہ چہارم ص ۲۶ تا ۲۷ ج ۲ مطبوعہ دہلی،

تفسیر کے چند ضروری اصول

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن کریم کی تفسیر اور اس سے احکام و قوانین کا استنباط ایک بہت وسیع موضوع ہے، اور اس کے مکمل اصولوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان و ادب، نحو و صرف، بلاغت اور علم حدیث و فقہ کی واقفیت ضروری ہے، لہذا اس کتاب میں یہ تمام اصول بیان نہیں ہو سکتے، علم اصول فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم سے احکام و قوانین مستنبط کرنے کے اصولوں پر ہی مشتمل ہے، اور جو شخص اس موضوع کا مفصل علم حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لئے علم اصول فقہ کو ماہر اساتذہ سے پڑھنا ضروری ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں تفسیر قرآن کے سلسلے میں چند وہ موٹے موٹے اصول بیان کر دیں جو علم اصول فقہ کی پوری مہارت کے بغیر بھی سمجھ میں آسکتے ہیں، اور جن کو نظر انداز کرنے کی بناء پر تفسیر کے معاملے میں بڑی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پھیل رہی ہیں، یہ تفسیر کے مکمل اصول نہیں ہیں، بلکہ اس علم کے جستہ جستہ مباحث ہیں، جنہیں عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جا رہا ہے، واللہ الموفق والمعين،

۱۔ قرآن کریم اور محجاز

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ سے اس کے حقیقی معنی مراد

نہیں ہوتے، بلکہ مجازی معنی مراد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ”شیر“ کے حقیقی معنی تو ایک مخصوص درندے کے ہیں، لیکن بسا اوقات یہ لفظ ”بہادر انسان“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ایٹس کا مصرعہ مشہور ہے

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

یہاں شیر سے مراد وہ درندہ نہیں ہے، بلکہ بہادر انسان ہے، اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ کسی خاص مناسبت سے کسی ایسے معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں جو ان کے لغوی اور حقیقی معنی نہیں ہوتے، قرآن کریم میں بھی بہت سے الفاظ اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ ان سے مجازی معنی مروا دیے گئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہو کہ وہ قرآن کے جس لفظ کو چاہے حقیقی معنی پر اور جس کو چاہے مجازی معنی پر محمول کر سکتا ہے، بلکہ علماء اُمت نے اس کا ایک ایسا ضابطہ بنایا ہے جو سو فی صد معقول ہے اور جس پر تمام علماء متفق ہیں، یہاں اس ضابطے کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ ضابطہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اصل یہ ہے کہ اُن سے حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور مجازی معنی صرف اُس وقت مراد ہوں گے جب حقیقی معنی کسی مجبوری کی وجہ سے مراد نہ ہو سکتے ہوں، اور جہاں کوئی مجبوری نہ ہو وہاں مجازی معنی مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، مجبوری کی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ حقیقی معنی عقلی طور پر یا قطعی مشاہدے کی رُو سے ممکن نہ ہوں، اور عقلی طور پر ممکن نہ ہونے کی مفصل تشریح انشاء اللہ اگلے اصول میں ”قرآن کریم اور عقلی دلائل“ کے زیر عنوان آئے گی،

۲۔ عرف اور محاورے کے اعتبار سے اُس لفظ یا جملے کے حقیقی معنی متروک ہو گئے ہوں، مثلاً کفار کے بارے ارشاد ہے :-

فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ

”یہ لوگ تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں“

لفظ ”قلیل“ کے حقیقی معنی ”تھوڑے“ یا ”کم“ کے ہیں، لیکن ایسے مقامات پر عرف اور

محاورے میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے کہ وہ ایمان تولاتے ہیں مگر تھوڑا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بالکل ایمان نہیں لاتے، اور اس طرہً قلیلاً "کا لفظ مجازاً نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اردو میں "تھوڑا ہی" اور انگریزی میں "few" کا بھی یہی حال ہے۔
۳۔ مجازی معنی مراد لینے کے لئے تیسری مجبوری یہ ہوتی ہے کہ عبارت کے سیاق و سباق میں کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جو حقیقی معنی کو ناممکن بنا دیتا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔

پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

ان الفاظ کا ٹھیک لغوی اور حقیقی مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور کفر کی مساوی اجازت ہے، لیکن آگے ارشاد ہے :-

إِنَّا آَعْتَنَّا لِلظَّالِمِينَ نَارًا

بلاشبہ ہم نے ظالموں (کافروں) کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایمان اور کفر مساوی طور سے جائز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دونوں کا انجام واضح ہو جانے کے بعد انسان کو اختیار ہے کہ وہ کفر کی راہ پر باقی رہے یا ایمان لے آئے، پہلی صورت میں اُسے عذابِ جہنم سے واسطہ پڑے گا اور دوسری صورت میں وہ رضائے الہی سے بہکنار ہوگا،

ان مجبوریوں کے سوا کسی لفظ کو اُس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر محمول کرنا ہرگز درست نہیں، یہ ایک متفقہ اصول ہے، اور اس کی معقولیت ناقابلِ انکار ہے اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے مجازی معنی مراد لینے کی کھلی چھٹی دیدی جائے،

۱۔ یہاں ہم نے اس مسئلہ کے مفصل معنی مباحث سے بچتے ہوئے سادہ الفاظ میں اس اصول کا خلاصہ بیان کیا ہے اس موضوع کی مکمل اور جامع و مانع بحث کیلئے اصول فقہ کی کتابیں ملاحظہ فرمائی جائیں، بالخصوص فخر الاسلام ہزدومی کی "اصول اور اس کی شرح" کشف الاسرار لعبدالعزیز البخاریؒ،

تو قرآن کریم کی کوئی آیت معنوی تحریف سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور ہر شخص اپنی من مانی نظریات کو قرآن کریم میں ٹھونس کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں الفاظ کے مجازی معنی مراد ہیں بلکہ بات صرف حقیقت اور مجاز تک ہی محدود نہیں، بسا اوقات ایک ہی لفظ یا ایک ہی جملے کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں، اور وہ سب اس کے حقیقی معنی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں بھی مسئلہ قاعدہ یہ ہو کہ جو معنی عرف اور محاورے کے لحاظ سے زیادہ قریبی ظاہر اور متبادر ہوں ان کو اختیار کیا جائے گا، اور دوسرے درجہ کے معانی کو اس وقت تک اختیار نہیں کیا جاسکتا جب تک قریبی معنی مراد لینے میں مذکورہ بالا مجبوریوں میں سے کوئی مجبوری لاحق نہ ہو، یا خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد سے دوسرے معنی ثابت نہ ہو جائیں، چنانچہ علامہ بدر الدین زکشیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

أَحَدُهُمَا أَنْ يَكُونَ أَحَدُهُمَا أَظْهَرَ مِنَ الْآخَرِ، فَيَجِبُ
الْحَمْلُ عَلَى الظَّاهِرِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْغَيْرَ أَهْوَى
الْحَقِيقِي دُونَ الظَّاهِرِيِّ فَيُحْمَلُ عَلَيْهِ،

قرآن کریم میں ایک سے زائد معانی کے احتمال کی ایک صورت یہ ہو کہ ایک معنی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہوں، ایسی صورت میں وہی معنی مراد لئے جائیں گے جو زیادہ ظاہر ہیں، الا یہ کہ کوئی دلیل اس بات پر قائم نہ ہو جاوے کہ یہاں ظاہری معنی کے بجائے پوشیدہ معنی مراد ہیں، ایسی صورت میں پوشیدہ معنی مراد لینا ضروری ہو گا۔

یہ اصول اس قدر برہمی (self evident) اور معقول ہے کہ قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، عام انسانی گفتگو میں بھی اس پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو کسی بھی شخص کی بات کو صحیح طور سے سمجھنا ممکن نہ رہے، فرض کیجئے کہ ایک مسافر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے

نوکر سے کہتا ہے کہ ”ٹکٹ لے آؤ“ اس کے جواب میں اگر نوکر ریلوے کا ٹکٹ لائے کے بجائے ڈاک کا ٹکٹ لے آئے تو اسے ساری دنیا احمق قرار دے گی، اگرچہ ”ٹکٹ“ کے لفظ میں دونوں احتمال موجود تھے لیکن نوکر کی حماقت یہ ہو کہ اس نے ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں ٹکٹ کے ظاہری اور قریبی معنی کو چھوڑ کر دُور کے معنی مراد لئے، اسی طرح اگر کسی شہر کا حاکم کسی انجینئر کو یہ حکم دے کہ فلاں جگہ ایک نہر کھودی جائے جس سے اس پہاڑ کی آبادی سیراب ہو سکے، اور انجینئر اس کا یہ مطلب بیان کرے کہ نہر کھودنے سے یہاں مراد ایک درسگاہ قائم کرنا ہے جس سے اس پاس کی آبادی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنے اس دعوے کی تائید میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا کلام پیش کر دے کہ انھوں نے درسگاہ کے لئے ”نہر“ کا لفظ استعمال کیا ہے، تو ایسے انجینئر کو آپ کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہی دنیا اسے دیوانہ قرار دے گی، کیونکہ ”نہر“ کے لفظ کو مجازاً ”درسگاہ“ کے معنی میں بے شک استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کی یہ تشریح اسی وقت درست ہو سکتی ہے جبکہ ”نہر“ کے اصلی اور حقیقی معنی کے خلاف کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو، اور مذکورہ مثال میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں تھی،

بعض لوگ اس واضح اصول کو پس پشت ڈال کر قرآن کریم کی تفسیر میں شدید گمراہیوں کے شکار ہو گئے ہیں، قدیم زمانے میں ملحدین کی ایک جماعت قرامطہ یا باطنیہ کے نام سے گزری ہو، اس نے تو اپنے مذہب باطل کی پوری عمارت اسی طرح کھڑی تھی کہ قرآن کریم کے ہر لفظ کو اس کے ظاہری اور حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اسے عجیب غریب معانی پہناتے تھے، چنانچہ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم میں ”صلوٰۃ“ (نماز) سے مراد امام (یعنی باطنی لیڈر) کی اطاعت ہے، ”حج“ سے مراد اُس لیڈر کی زیارت اور خدمت ہے، ”صوم“ (روزے) سے مراد اس لیڈر کا راز فاش کرنے سے پرہیز ہے، نہ کہ کھانے پینے سے، اور ”زنا“ سے مراد باطنی فرقتے کا کوئی راز فاش کرنا ہے، اسی طرح عَصَا موسیٰ

سے خردانے نزدیک حضرت موسیٰ کا غالب آجانا ہے، اور بادل کے سایہ کرنے سے مراد انکی حکومت کا قیام ہے،

ہمارے زمانے میں بھی بہت سے مصنفین نے اس اصول کی خلافت درزی کر کے تفسیر کے معاملے میں خطرناک ٹھوکریں کھائی ہیں؛ مثلاً انیسویں صدی کے آغاز میں مغربی فلسفے کی سرسری معلومات کی بنیاد پر عالم اسلام کے بعض ”جذرت پسند“ حضرات اسلامی عقائد میں سے اُن تمام چیزوں کا انکار کر بیٹھے تھے، جنہیں مغرب کے لوگ ”توہم پرستی“ کا طعنہ دیا کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے قرآن کریم میں ایسی تحریفات کی ہیں جنہیں دیکھ کر دل لرز اٹھتا ہے، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی تقریباً آدھی آیات کو حجاز، استعارہ اور تمثیل قرار دیدیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کریم میں دسیوں مقامات پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، اُن کے آگے فرشتوں کے سجدہ ریز ہونے اور ابلیس کا انکار کا واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن چونکہ مغرب میں ڈارون (Darwin) کا نظریہ ارتقاء اُس دور میں کافی مقبول ہو رہا تھا، اور اس کی کچھ ناتمام سی اطلاعات ہندوستان میں بھی پہنچ رہی تھیں، اس لئے انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام، فرشتوں اور ابلیس کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ محض ایک تمثیل ہے، اور نہ آدم علیہ السلام کا کوئی شخصی وجود ہے، نہ فرشتوں کا اور نہ ابلیس کا۔ چنانچہ سرسید احمد خان صاحب لکھتے ہیں:-

”آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہو جس کو عوام الناس اور مسجد

کے مُلّا باوا آدم کہتے ہیں، بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے“

آگے لکھتے ہیں:-

”اس قصے میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی

۱۔ المثل والنخل للہرستانی مع حاشیہ ص ۳۳۲ ج ۱،

۲۔ تفسیر القرآن از سرسید احمد خان ص ۲۸ ج ۱،

۳۔ غنیمت ہو کہ خدا کا مطلب قوسین میں مادہ وغیرہ نہیں بتایا،

قوائے ملکوتی، تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) جو تھے آدم (یعنی انسان) جو مجموعہ ان قوائے کا ہے، اور جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں (مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبانِ حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے)۔

سوال پیدا ہوا کہ قرآن نے تو فرشتوں کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں، اس کے جواب میں سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”جو قوائے جس کام کے لئے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے، قوتِ نامیہ انما اور قوتِ ناطقہ نطق، قوتِ احراق حرک، قوتِ سیالہ سیلان، قوتِ جامدہ انجامد کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی“

پھر سوال پیدا ہوا کہ آدم کے جنت میں رہنے، شجرہ ممنوعہ کھانے اور وہاں سے زمین پر اُتارے جانے (ہبوط) کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں ”مجاز و تمثیل“ کی یہ کرشمہ کاری ملاحظہ فرمائیے :-

”ہم شروع ہی سے اس قصہ (یعنی آدم و ابلیس کے واقعہ) کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اُس فطرت کی زبانِ حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اُس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہی جب تک وہ مکلف کسی امر و نہی کا نہ تھا..... اور اس کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا، اس کا پھل کھانا، اس کی فطرت کی اُس حالت کا بیان ہی جبکہ وہ غیر مکلف سے مکلف ہوا، ہبوط (یعنی اُترنے) کے لفظ کا استعمال ضرورتاً انتقال مکان ہی پر مختص نہیں ہے۔“

پھر بھی کوئی پوچھ سکتا تھا کہ اسی واقعہ میں ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا :-

”قوائے بہیمیہ کو جن کا مبداء حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُن کی فطرت کا بتلانا ہے“
اب پورے واقعہ کا خلاصہ خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے:-

”یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارے میں بیان کی ہے، اس لئے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سن رشد و تمیز کے پہنچنے کو درخت معرفت خیر و شر کو پھل کھانے سے، انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے، مگر شجرہ المخلد کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں ملے۔“

ان اقباسات پر ہم کسی علمی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے، قرآن کریم میں حضرت آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے، اور مذکورہ بالا تاویلات و تخریفات کو اس پر چسپاں

۱۔ تفسیر القرآن از سرسید احمد خان، ص ۵۹ اج ۱،

۲۔ البتہ مذکورہ بالا تخریفات پر ہمیں فرقہ باطنیہ کا مشہور لیڈر عبید اللہ بن الحسن الیقروانی یاد آگیا، جس نے اپنے ایک پیر کو لکھا تھا: اِنِّیْ اَوْصِیْکَ بِتَشْکِیْکِ النَّاسِ فِی الْعِرَاقِ وَالتَّوْرَةِ وَالزُّبُورِ وَالتَّحْمِیْلِ وَبَدْعِیَّتِهِمْ اِلٰی الْبَطَالِ الشَّرَاقِ وَاِلٰی الْبَطَالِ الْمَعَادِ وَالنَّشْرِ مِنَ الْقُبُورِ وَابْطَالِ الْمَلَائِکَةِ فِی السَّمَاءِ وَابْطَالِ الْبَنِّ فِی الْاَرْضِ وَ اَوْصِیْکَ بِاَنْ تَدْعُوْهُمْ اِلٰی الْقَوْلِ بِاَنْہِ قَدْ کَانَ قَبْلَ اَدَمَ بَشَرٌ کَثِیْرٌ فَاَنْ ذَلَّکَ عَوْنٌ عَلٰی قَدَمِ الْعَالَمِ (الفرق بین الفرق، ص ۲۹۶ و ۲۹۷) ”یعنی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ؛ لوگوں کو ترکان، توراۃ، زبور اور انجیل کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار بناؤ، انہیں تمام شرعی قوانین کے باطل ہونے کی طرف دعوت دو، اور آخرت اور حشر و نشر، آسمان میں ملائکہ اور زمین میں جنات کے تصور کو مٹاؤ، نیز میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس اعتقاد کی طرف دعوت دو کہ آدم (علیہ السلام) سے پہلے بھی بہت سے انسان ہو چکے ہیں، کیونکہ یہ اعتقاد دنیا کو غیر فانی ثابت کرنے میں تمہارا مددگار ثابت ہوگا،

کر کے دیکھتے، خود اندازہ ہو جائے گا کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو مسئلہ اصول اور بیان کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر کے کیسی کیسی لغو باتیں فترانِ کریم کی طرف منسوب کی گئی ہیں اسی طرح فترانِ کریم جا بجا جنت کی نعمتوں کے بیان سے بھرا ہوا ہے، اس میں جنت کے ہرے بھرے باغات، بہتے ہوئے دریاؤں، خوبصورت مکانات، حسین اور پاکیزہ شریک زندگی، لذیذ کھانوں اور پھولوں کا بیان اس کثرت سے آیا ہے کہ شمار مشکل ہے، لیکن سرسید احمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ مجاز ہی مجاز ہے، اُن کا اصل مقصد اعلیٰ درجے کی خوشی اور راحت کا بیان ہے، اور مذکورہ بالا اشیاء محض اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ جاہلِ قسم کے لوگ ان لذتوں کے لالچ میں دن رات اٹا میں لگے رہیں،

”ایک تزیینت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ دعدہ و دعیذ دوزخ و بہشت کے جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہ وہی اشیاء مقصود نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عروج، نعیم جنت کی اور ایک ترغیب و امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کو طر مغر، طایا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت آن گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیئیں گے، میوے کھا دیں گے، دودھ و شہد کی ندیوں میں نہلا دیں گے، اور جو دل چاہے گادہ مرنے اڑا دیں گے، اور اس لغو، بیہودہ خیال سے دن رات ادا امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے“

واقعہ یہ ہے کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو اصول اور بیان کیا گیا ہے اگر اس کو

پس پشت ڈال دیا جائے تو کوئی خراب سے خراب عقیدہ اور بُرے سے بُرا عمل ایسا نہیں ہے جسے قرآن کی طرف منسوب نہ کیا جاسکے، آخر باطنی فرقے کے لوگوں نے مجاز و استعارہ کے یہی ہتھیار استعمال کر کے قرآن سے مجوسی عقائد ثابت کر دیئے تھے، اور آج بھی بہت سے عیسائی پادری قرآن کریم ہی کی آیتوں میں دوردراز کی تاویلات کر کے اُسے عیسائی مذہب کا حامی ثابت کرتے رہتے ہیں، اور پھر جب آدھا قرآن مجاز و استعارے پر مشتمل ہو اور اس میں ملائکہ سے مراد درختوں کی قوتِ نمو، دریاؤں کی قوتِ روانی اور آگ کی قوتِ احراق، آدم علیہ السلام سے مراد نوعِ انسانی، ابلیس سے مراد شر کی قوتیں ہو سکتی ہیں تو دوزخ سے مراد دنیوی تکلیفیں اور جنت سے مراد دنیوی راحتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور خدا کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ کسی مستقل وجود کا نام نہیں، بلکہ کائنات کی اصل یعنی مادے یا توانائی کا نام ہے، اور خدا کا تصور جو قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ (معاذ اللہ) آپس نے محض اس لئے بیان فرمایا تاکہ عرب کے بدوؤں کو اس سے ڈرا کر اچھے کاموں کی طرف بلایا جاسکے، لیجئے: اس طرح مجاز و استعارے کے اس ہتھیار نے دین و مذہب کی بالکل ہی چھٹی کر ڈالی، اور قرآن پر عمل کرنے کے لئے خدا کے وجود پر ایمان رکھنا بھی مزدوری نہ رہا، اور یہ بات محض ایک عقلی مفروضہ ہی نہیں ہے، مجاز اور تمثیل کے استعمال کو کھلی چھٹی دے کر فرقہ باطنیہ نے بالکل اسی جیسی دعوے کئے تھے، علامہ عبد القادر بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

”فرقہ باطنیہ کے مشہور لیڈر عبید اللہ بن الحسن قیروانی نے اپنی ایک

کتاب میں لکھا ہے کہ آخرت کی جزاء و سزا لغو باتیں ہیں اور جنت سے

مراد درحقیقت دنیا ہی کا عیش و آرام ہے، اور عذاب سے مراد شریعت پر تنوں

کا سزا روزے اور حج و جہاد کے چکر میں پھنسا رہنا ہے۔“

لہذا اگر قرآن کریم سے اللہ کی کتاب ہدایت کی حیثیت میں فائدہ حاصل کرنا ہے

نویہ طرز عمل انتہائی نامعقول ہے، بیہودہ اور خطرناک ہے، کہ قرآن کریم کی جو بات اپنے کسی نظریہ کے خلاف معلوم ہو اس میں تاویلات کا دروازہ کھول کر یہ کہنا شروع کر دیا جائے کہ اس کے ظاہری اور حقیقی معنی کے بجائے فلاں معنی مراد ہیں، عبد حاضر کے جن مصنفین نے علم تفسیر کی ضروری شرائط بوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر پر قلم اٹھایا ہے، اُن میں یہ اصولی غلطی بکثرت پائی جاتی ہے، اور اُن کے مطالعہ کے دوران اگر مذکورہ بالا اصول کو ذہن میں رکھا جائے تو ایسی تفسائیف کی بہت سی غلطیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں،

۲۔ قرآن کریم اور عقلی دلائل؛

عبد حاضر کے بعض مصنفین قرآن و سنت کے ارشادات میں بعض اوقات یہ کہہ کر دراز کا رتاویلات اختیار کرتے ہیں کہ ان ارشادات کا ظاہری مفہوم عقل کے خلاف ہے، اس لئے اُن کی ایسی تاویل کرنی ضروری ہے جو عقل کے خلاف نہ ہو، اس معاملے میں چونکہ غلط فہمیاں بہت عام ہیں، اس لئے ہم یہاں اس مسئلے کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں،

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن و سنت سے جو باتیں ثابت ہوتی ہیں آگے ہم انہیں ”نقلی دلائل“ سے تعبیر کریں گے، اور عقل سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں انہیں ”عقلی دلائل“ سے، دراصل اس معاملے میں غلط فہمیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے علماء و متکلمین نے اپنی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ اگر نقلی دلائل عقلی دلائل کے خلاف ہوں تو عقلی دلائل پر عمل کیا جائے گا، اور نقلی دلائل اگر سند کے اعتبار سے قابل اعتماد نہ ہوں تو ان کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اور اگر وہ سند کے لحاظ سے ناقابل انکار ہوں تو یہ کہیں گے کہ اُن کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، پھر اگر ان کا کوئی دوسرا مطلب بے تکلف ہو سکتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ مفہوم مراد ہے، اور اگر کوئی بے تکلف مطلب سمجھ میں نہ آئے تو کہیں گے کہ اس کا صحیح مفہوم ہم پر واضح نہیں ہو سکا، اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، نقلی دلائل کی اس آخری قسم ہی کو ”متشابهات“ سے تعبیر کرتے ہیں،

۱۔ امام رازیؒ: اپنی کتاب ”اساس التقدیس فی علم الکلام“ میں تحریر فرماتے ہیں:۔ (باقی لکھ صفحہ پر)

یہ قاعدہ علماء اور متکلمین میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر بعض مصنفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قرآن و سنت کی جو کوئی بات اپنی کسی رائے کے خلاف ہوئی اس میں یہ کہہ کر تاویل شروع کر دی کہ یہ عقل کے خلاف ہے، حالانکہ جن متکلمین نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے انہوں نے اس کی مکمل تشریح بھی کر دی، یہاں اس تشریح کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ”الانتباہات المفیدہ“ میں اس قاعدے کو بہترین انداز میں منضبط فرمایا ہے، پہلے ہم انہی کے الفاظ میں یہ قاعدہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد انشاء اللہ اس کی مفصل تشریح پیش کی جائے گی، حکیم الامت، حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں :-

”ذیل عقلی و نقلی میں تعارض کی چار صورتیں عقلاً محتمل ہیں :-
 ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں، اس کا کہیں وجود نہیں، نہ ہو سکتا
 ہے، اس لئے کہ صادقین میں تعارض محال ہے، دوسرے یہ کہ دونوں
 ظنی ہوں، وہاں جمع کرنے کے لئے گویہ دو میں صرف عن الظاہر کی
 گنجائش ہے، مگر سان کے قاعدے سے کہ اصل الفاظ میں حل علی
 الظاہر ہے، نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور ذیل عقلی کی دلالت کو
 حجت نہ سمجھیں گے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعلم ان الدلائل القطعیۃ العقلیۃ اذا قامت علی ثبوت شئی، ثم جری
 ادلۃ نقلیۃ یشرظاہر باخلاف ذلک، فہناک لا یخلو الحال من احدا مورار لجة.... ولما بطلت
 الاقسام الاربعۃ لم یبق الا ان یقطع بمقتضى الدلائل العقلیۃ القاطعۃ بان ہذہ الدلائل النقلیۃ
 اما ان یقال انہا غیر صحیحۃ، او یقال انہا صحیحۃ الا ان المراد منہا غیر ظاہر ہا، ثم ان جوزنا التاویل و
 اشتغلنا علی سبیل التبرع بذکر تلک التاویلات علی التفصیل، وان لم یجز التاویل فوضنا العلم بہا
 الی اللہ تعالیٰ، فہذا ہذا القانون الکلی المرجوع الیہ فی جمیع المتشاہات، (اساس التقدیس)
 ص ۲۷۳ اد ۳۱۷ فصل ۳۲، مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۲ھ)

تیسرے یہ کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی، یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں گے
چوتھے یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو، ثبوتاً یا دلالتاً، یہاں عقلی کو
مقدم رکھیں گے، نقلی میں تاویل کریں گے، پس صرف یہ ایک موقع ہی
درایت کی تقدیم کا روایت پڑنے یہ کہ ہر جگہ اس کا دعویٰ یا استعمال
کیا جاوے گا۔

اس قاعدے کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عقلی دلائل تین

قسم کے ہو سکتے ہیں :-

۱۔ قطعی عقلی دلائل | یعنی ایسے عقلی دلائل جو سو فی صد یقینی ہوں، انہیں تمام انسان
کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر تسلیم کرتے آتے ہوں، اور ان
کے خلاف ہر بات سو فی صد ناممکن ہو، مثلاً یہ بات کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں،
قطعی عقلی دلیل ہے، جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا، یعنی دو اور دو تین کر کبھی
تین یا پانچ نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ بات عقلاً قطعی طور سے ناممکن ہے کہ ایک شخص
ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر موجود بھی ہو اور وہاں سے غائب بھی،

۲۔ ظنی عقلی دلائل | یعنی وہ عقلی باتیں جو سو فی صد یقینی تو نہ ہوں، لیکن عقل اور
تجربے کی رُو سے اُن کی سچائی کا غالب گمان پیدا ہوتا ہو،

ایسی باتوں کی سچائی پر تمام اہل عقل ہمیشہ متفق نہیں رہتے، بلکہ مختلف زمانوں،
مختلف خطوں اور عقل و خرد کے مختلف سانچوں کے اعتبار سے ان معاملات میں
نظریاتی اختلاف پیش آتا رہتا ہے، مثال کے طور پر نیوٹن کا نظریہ تحب اذب
(Theory of Gravity) آئن اسٹائن کا نظریہ انحنافیت

(Theory of Relativity) ڈارون کا نظریہ ارتقاء.....

(Theory of Evolution) وغیرہ، ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی

نظریہ سو فی صد یقینی نہیں تھا، بلکہ ان فلسفیوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربات کو کام میں لا کر ایک رائے قائم کی تھی، جو اُن کو اس وقت کی معلومات اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی تھی، اور اس کی سچائی پر اُن کا گمان غالب ہو گیا تھا، لیکن اس رائے کو یقینی اور قطعی طور سے سو فی صد درست نہیں کہا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوسرے فلاسفہ نے اس سے اختلاف کیا، ایک زمانے میں کوئی نظریہ ذہنوں پر چھایا رہا، اور دوسرے زمانے میں وہی نظریہ عقل سے خارج نظر آنے لگا،

۳۔ وہی عقلی دلائل | یعنی وہ دلائل جن کی بنیاد یقین یا گمان غالب کے بجائے محض دہم و قیاس پر ہو، مثلاً اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ مریخ پر زندگی موجود ہے، ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد کسی قطعی یا ظنی دلیل پر نہیں، بلکہ محض وہی اندازوں پر تھی، اسی طرح نقلی دلائل کی بھی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ قطعی نقلی دلائل | وہ دلائل ہیں جو سو فی صد یقینی ہوں، یعنی کسی مضمون کے متعلق ان کے الفاظ بھی بالکل صریح اور صاف ہوں، اور سند وثبت کے اعتبار سے بھی یقینی طور سے قابل اعتماد ہوں، مثلاً قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لَا تَقْرُبُوا الزِّنَا (زنا کے پاس تک نہ جاؤ) یہ اس بات کی قطعی اور یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں زنا حرام ہے، کیونکہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے کلام الہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس کی مذکورہ آیت سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم زنا سے منع کرنا چاہتا ہے، اسی طرح جو باتیں متواتر احادیث یا اجماع قطعی سے ثابت ہوں

لہ متواتر احادیث کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے ہر دور میں اتنے رہے ہوں کہ عقل اُن سب کے بیک وقت جھوٹا ہونے کو ناممکن سمجھتی ہو، ایسی احادیث تو سند وثبت کے اعتبار سے سو فی صد قطعی اور یقینی ہوتی ہیں، لیکن اخبارِ آحاد (یعنی وہ حدیثیں جن کو روایت کرنے والے کسی زمانے میں صرف ایک یا دو تین رہ گئے ہوں) ظنی ہوتی ہیں، یعنی اُن کے ثبوت کا ایسا یقین (باقی صفحہ ۲۱۱)

وہ بھی اسی قسم میں داخل ہیں،

۲۔ ظنی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جو پہلی قسم کی طرح قطعی تو نہیں ہوتے لیکن اُن سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کے صحیح ہونے کا غالب

گمان قائم ہو جاتا ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جو متواتر نہیں ہیں، لیکن اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہیں، ایسی احادیث اگرچہ واجب العمل ہوتی ہیں، اور ان کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہوتا، لیکن چونکہ ثبوت کے اعتبار سے وہ قرآن اور متواتر احادیث کی طرح قطعی اور یقینی نہیں ہوتیں، اس لئے انھیں دوسرے درجے میں رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی حدیث قرآن کریم یا متواتر احادیث کے خلاف ہو تو اس کی ایسی تشریح کی جائے گی جو قرآن کریم یا متواتر احادیث کے مطابق ہو، اور اگر ایسی تشریح ممکن نہ ہو تو اُسے چھوڑ دیا جائے گا،

۳۔ دہمی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جن کی صحت کا غالب گمان بھی قائم نہ ہوتا، بلکہ وہ محض دہم اور تخمینہ پر مبنی ہوں، مثلاً وہ احادیث جو اصول حدیث کی شرائط پر پوری نہیں اُترتیں،

ان چھ قسموں میں سے دو (یعنی دہمی عقلی دلائل اور دہمی نقلی دلائل) کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں ہے، لہذا وہ خارج از بحث ہیں، البتہ باقی چار اقسام کو مد نظر رکھتے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض و اختلاف کی عقلاً چار صورتیں ہو سکتی ہیں:-
۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی بھی قطعی ہو اور دلیل عقلی بھی قطعی، یہ صورت محض ایک نظر یا قی مفروضہ ہے، عملاً آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی قطعی نقلی دلیل کسی قطعی عقلی دلیل کے مخالف ہو جائے، اگر کہیں بظاہر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں ہوتا جیسے متواتر احادیث کا، البتہ اگر وہ اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہوں تو غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اس لئے پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ اُن پر عمل ضروری ہے،

ایسا نظر آتا بھی ہو تو نقلی دلیل صرف اپنی سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہوگی، لیکن اس کا جو مضمون قطعی دلیل عقل کے مخالف معلوم ہو رہا ہو، اس پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہوگی، اور اگر اس مضمون پر اس کی دلالت قطعی ہوگی تو وہ سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی نہیں ہوگی، ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی دلیل نقلی اپنے ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو، اور پھر وہ کسی قطعی دلیل عقل کے خلاف ہو،

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل ظنی ہو اور عقلی دلیل قطعی، اور دونوں میں تعارض واقع ہو جائے، یہ وہ صورت ہے جس کے بارے میں علماء اور متکلمین نے کہا ہے کہ ایسی صورت میں عقلی دلیل پر اعتماد کیا جائے گا، اور نقلی دلیل کے ایسے معنی بیان کئے جائیں گے جو عقل کی دلیل قطعی کے موافق ہوں مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-
الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی
”مَنْ رَاَ اللہ تعالیٰ، عرش پر سیدھا ہو گیا“

یہ قرآن کریم کی آیت ہے، لہذا ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے، یعنی اس کا کلام الہی ہونا یقینی ہے، لیکن اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ قطعی نہیں، کیونکہ لفظ ”اسْتَوٰی“ کے عربی محاورے میں بہت سے معنی ہو سکتے ہیں، اور جو معنی لئے گئے ہیں وہ قطعی نہیں، لہذا یہ اس نقلی دلیل کی مثال ہے جو دلالت کے اعتبار سے ظنی ہے، دوسری طرف اس کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آرہے ہیں (یعنی عرش پر سیدھا ہو جانا) وہ عقل کی دلیل قطعی کے خلاف ہیں، کیونکہ ”سیدھا ہونا“ جسم کی صفت ہے، اور عقل کے یقینی دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ باری تعالیٰ کوئی جسم نہیں ہے، اس طرح یہ ظنی نقلی دلیل عقل کی دلیل قطعی کے مخالف ہو گئی، چنانچہ مفسرین امت نے باتفاق عقل کی دلیل قطعی کو اختیار کیا، اور اس آیت کے بارے میں تمام علماء نے یہ فرمایا کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، پھر بعض حضرات نے تو اس کو مجاز قرار دیا، اور کہا کہ اس سے مراد غلبہ اور قدرت وغیرہ ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت اُن متشابہات میں سے

ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَلَا يَعْلَمُ تَاْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ (اس کی تائیل و تفسیر اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اسی طرح قرآن کریم میں حضرت ذوالقرنین کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے :-

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ،

”یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) مغرب میں پہنچے تو سورج کو ایک کچڑ والے چشمے میں ڈوبتا پایا،“

یہ بھی قرآن کریم کی آیت ہے، اس لئے اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی مشبہ نہیں، لیکن اس جملے کا جو مفہوم ظاہری طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ سورج واقعی ایک کچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا تھا، وہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل کی رُو سے درست نہیں، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ سورج اور زمین دونوں الگ الگ کرے ہیں، جو کسی بھی مقام پر آپس میں نہیں ملتے، لہذا آیت کا یہ ظاہری مفہوم مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس مقام پر اُس وقت ذوالقرنین پہنچے تھے وہاں آگے کوئی آبادی نہیں تھی، اور حدِ نظر تک دَلَزَل ہی دَلَزَل تھی، اس لئے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سورج اس کچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا ہے، یہ مفہوم اگرچہ آیت کے الفاظ سے پہلے مفہوم کے برابر ظاہر نہیں ہے، لیکن چونکہ آیت کے الفاظ میں اس کی بھی پوری گنجائش ہے، اس لئے یہ آیت پہلے مفہوم پر قطعی الدلالتہ ہے اور جب اس کا مقابلہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل سے ہوا تو یہ قطعی دلائل راجح قرار پائے، اور آیت کے اس مفہوم کو باجماع اختیار کر لیا گیا، جو ان قطعی دلائل کے موافق تھے،

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل ظنی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں نقلی دلیل ہی کو ترجیح ہوگی، کیونکہ ظنی دلیل قطعی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مثال کے طور پر ڈارون نے اپنے نظریہ ارتقاء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ

انسانوں کی نسل بیکایک وجود میں نہیں آئی، بلکہ حیوانات مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ایک سلسلہ ارتقاء سے وابستہ رہے ہیں اور اس ارتقاء کے نتیجے میں انھوں نے بہت سی ہیئتیں بدلی ہیں یہاں تک کہ انسان بننے سے پہلے اُس کی آخری شکل بندر یا بن نہیں تھی، اور انہی بندر روئی یا بن مانسوں کی ایک نسل ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی انسان بن گئی، ظاہر ہے کہ ڈارون کا یہ نظریہ ایک قیاسی نظریہ تھا، اور جو دلائل اس نے پیش کئے تھے، اگر انھیں دلائل کہنا صحیح ہو تو زیادہ سے زیادہ وہ قطعی دلائل تھے، اس کے مقابلے میں قرآن کریم واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا ذَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً
(نساء: ۱)

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے
پیدا کیا اور اُس جان سے اُس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے
بہت سے مرد و عورت (دنیا میں) پھیلا دیئے“

نیز ارشاد فرمایا:-

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَلٍ
مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ
سَاجِدِينَ، فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ،
(الحج: ۳۱ تا ۳۸)

”جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں خیر اُٹھے ہوئے گھارے
سے جو سوکھ کر بجھے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پس جب
میں اس کو بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے
آگے سجدے میں گر پڑنا، پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، الخ“

یہ اور ان جیسی متعدد آیات صراحتاً یہ ثابت کرتی ہیں کہ بنی نوع انسان کی ابتداء ایک

فرد واحد (حضرت آدم علیہ السلام) سے ہوئی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے گارے سے پیدا کیا تھا، قرآن کریم کے یہ دلائل قطعی ہیں، لہذا ان سے ڈارون کے نظریے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے، اور اس نظریہ کی وجہ سے (جسے زیادہ سے زیادہ ظنی کہا جاسکتا ہے) قرآن کریم کے صریح بیانات کو چھوڑ دینا یا ان میں دوران کار تاویلات کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا،

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل بھی ظنی ہو اور عقلی دلیل بھی ظنی، اس صورت میں بھی علماء اور متکلمین کا اس پر اتفاق ہی کہ نقلی دلیل کو ترجیح ہوگی، اور جب تک عقلی دلیل قطعی مشاہدے کی صورت اختیار نہ کر لے اس وقت تک اس کی وجہ سے قرآن و سنت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹانا درست نہیں ہوگا، اس کی وجہ وہی ہے جو ”قرآن کریم اور مجاز“ کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں دنیا کی ہر گفتگو میں اصل یہ ہے کہ وہ حقیقت ہو، مجازی معنی اسی وقت اختیار کئے جائیں گے جب کوئی مجبوری لاہو ہو جائے، اگر عقل کی کوئی دلیل قطعی حقیقی معنی کے معارض ہو تب تو مجبوری واضح ہو، اور اس صورت میں مجازی معنی بھی مراد لینا واضح ہے، لیکن جب عقلی دلیل ظنی ہے تو مجازی یا دور کے معنی اختیار کرنے کی مجبوری ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ عقل کے ظنی دلائل کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی عالمگیر اور ابدی نہیں ہوتے، ایک شخص ظنی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرا اس کا منکر ہے، ایک زمانے میں اسے قبول عام حاصل ہے، اور دوسرے زمانے میں اُسے جہالت سمجھا جاتا ہے، فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اٹھا کر دیکھتے وہ اس قسم کے کتنے بیشتر نظریات سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی زمانے میں ایک فلسفی ایک نظریے کا قائل ہے، اور اپنے ظنی دلائل کو تمام دوسرے دلائل پر فوقیت دیتا ہے، لیکن دوسرا فلسفی ٹھیک اُسی دور میں ایک بالکل متضاد نظریہ کو درست سمجھتا ہے، اور اس کے دلائل کو ترجیح دیتا ہے، پھر جب زمانہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دور کے تمام فلسفیوں کے دلائل بے بنیاد اور غلط تھے، ایسے ظنی عقلی دلائل کا تو شمار

مشکل ہے جنہیں آگے چل کر عقل اور مشاہدے کے قطعی دلائل نے ہمیشہ کے لئے باطل قرار دیدیا، اس کے برخلاف جو وہ سو سال کی مدت میں ایسے ظنی نقلی دلائل اٹکاؤں کا ہی ملیں گے جن کو عقل کے قطعی دلائل یا مشاہدے نے یقینی طور پر غلط قرار دیدیا ہو، لہذا اگر عقل کی ہر ظنی دلیل کی وجہ سے نقلی دلائل میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا تو قرآن و سنت کو باز یچہ اطفال بنانے کے سوا اس کا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ حضرت مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے :-

”ذرا صل اس قسم کے مباحثہ علمیہ کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدے کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحی الہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے کیونکہ مترکن عزیز مشاہدہ اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا، تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بے جا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جاسکے، تو ان کے متعلق قرآن عربیہ کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں، اور خواہ مخواہ اُن کو جدید تحقیقات کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہئے، کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدے اور بداہت کا انکار لازماً آجائے، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مسائل علمیہ کو تو بار بار اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم و شرآئی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی“

لہذا بنیادی اصول تو یہی ہے کہ جب عقل اور نقل کے ظنی دلائل میں تعارض پیش آوے

تو نقل کے ظنی دلائل کو ترجیح ہوگی، اور عقل کے ظنی دلائل کی بنیاد پر نقل دلائل میں دو درجہ کی تاویلات اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ ظنی دلائل بھی سب ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، بلکہ اُن میں بھی مختلف درجات ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ظنی دلائل دوسرے ظنی دلائل کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتے ہیں، مثلاً یہ بات بھی ظنی ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے، اور یہ بھی ظنی ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں "نیاندرتھل" (Neanderthal) کے نام ایک مخلوق پائی جاتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ قوت کا جو درجہ پہلی بات کو حاصل ہے، وہ دوسری بات کو حاصل نہیں، اسی طرح ایک ظنی نقلی دلیل وہ ہے جو صحیح بخاریؓ اور صحیح مسلمؓ اور تمام حدیث کی کتابوں میں موجود ہو، اور ایک وہ ہے جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، لیکن صحاح ستہ اور حدیث کی معروف و متداول کتابوں میں نہیں پائی جاتی ظاہر ہے کہ پہلی قسم دوسری کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس طرح ظنی دلائل میں درجہ تفاوت ہو سکتے ہیں، اب اگر کوئی عقلی دلیل ظنی درجہ اول کی ہو اور نقلی دلیل ظنی درجہ دوم سوم کی ہو تو ایسی صورت میں ایک مجتہد عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر ترجیح دیکر نقلی دلیل کی ایسی توجیہ کر سکتا ہے جو ظاہری الفاظ کے لحاظ سے نسبتاً بعید لیکن عقلی دلائل کے مطابق ہو، البتہ جب تک وہ عقلی دلیل مشاہدے یا قطعیات سے ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک نقلی دلیل کی اس توجیہ کو قطعی اور متعین طریقے سے بیان نہ کرنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جو عقلی دلائل کے لحاظ سے راجح معلوم ہوتا ہے،

لیکن چونکہ ظنی دلائل کے ان درجات کو اپنے قیاسی قواعد کے تحت لانا مشکل ہے اس لئے یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ کونسی دلیل کس درجے کی ظنی ہے، چنانچہ یہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے نقل و عقل کے دلائل پر مکمل عبور اور قرآن و سنت کے علوم میں

پوری بصیرت حاصل ہو، اور اس معاملے میں اہل علم کی آراء میں اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔
یہ بات ایک مثال سے واضح ہو سکے گی، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جب حضر
ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بنائی تو فرمایا:-

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّيْ فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ رَّبِّيْ جَعَلْهُ
دَكَّاءً وَكَانَ وَعْدُ رَّبِّيْ حَقًّا

”یہ (دیوار) میرے پروردگار کی طرف سے ایک رحمت ہی، پس جب
میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئے گا تو وہ اس دیوار کو
توڑ دیگا، اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے“

اس میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ ”پروردگار کا وعدہ“ سے مراد قیامت ہے،
اور مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آجائے گی، اور یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت
ہوگا، اُس وقت یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اگرچہ قرآن کریم نے صرت ”پروردگار کا وعدہ“
کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اُس کی مزید تشریح و تفسیر نہیں فرمائی، لیکن چونکہ قرآن کریم میں
متعدد مقامات پر یہ لفظ قیامت کے معنی میں آیا ہے، اس لئے مفسرین نے یہاں
بھی اُس کے یہی معنی مراد لئے ہیں، لیکن یہ تفسیر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے،
دوسری طرف اب تک جو جغرافیائی اور تاریخی تحقیقات ہوئی ہیں اُن سے گما
یہ ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کا فی عرصہ پہلے ٹوٹ چکی ہے، اگرچہ یہ
تحقیقات بھی ظنی ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کی دیوار کا قطعی اور یقینی تعین جس میں کوئی
شبہ باقی نہ رہے بہت مشکل ہے،

اس کے باوجود ایک شخص جسے عقلی اور نقلی دلائل میں موازنے کا مکمل سلیقہ اور
ان معاملات کی صحیح بصیرت عطا فرمائی ہو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ تاریخی اور جغرافیائی
تحقیقات درجہ اول کی ظنی ہیں اور آیت کی مذکورہ بالا تفسیر درجہ دوم کی ظنی ہے،
لہذا ان تحقیقات کے مطابق یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہو کہ قرآن کریم کی مذکورہ
آیت میں ”پروردگار کے وعدے“ سے مراد قیامت کے بجائے وہ معین وقت بھی

ہو سکتا ہے، جس میں اس دیوار کا ٹوٹنا تقدیر الہی میں طے شدہ ہی، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ عام مفسرین کے غلات اسی تفسیر کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے کہ ذوالقرنین کے اس قول کا منشاء قیامت کی کسی علت کی طرف اشارہ کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک عام بات کہنا چاہتے تھے، کہ جب میرے پروردگار کا حکم ہو گا یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اور قیامت کے قریب یا بوجہ و مابوجہ کے جس خروج کا ذکر قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے اُس کا دیوار ٹوٹنے کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے،

لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قطعی دلائل کی یہ درجہ بندی بڑا نازک کام ہے، اور اس کے لئے نقلی و عقلی علوم میں قسار و واقعی بصیرت و مہارت کی ضرورت ہی، لہذا اس معاملے میں پوری جستیا ط، سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہی، اور محض کسی رائج الوقت نظریے کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ کر لینا اکثر گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، یہ بے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کے وقت صحیح طریق کار جو تمام علماء سلف کا معمول رہا ہے، اور جس کی معقولیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا،

۳۔ احکام شرعیہ اور عقل

قرآن کریم کی تفسیر میں عقل کے استعمال کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صریح اور واضح الفاظ سے جو شرعی حکم ثابت ہو رہا ہو، اُس سے اس بنا پر انکار کیا جاتے کہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آسکی، آجکل مغربی افکار کے تسلط یہ خطرناک و با بھی عام ہو رہی ہے کہ جن شرعی احکام پر چودہ سو سال سے پوری

۱۔ تفصیل کیلئے دیکھئے عقیدۃ الاسلام فی حیاء علیہ علیہ السلام از حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری ص ۱۹ و نغمۃ العبر از حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری ص ۵۸ و قصص ہستہ قرآن،

امت مسلمہ متفق علیٰ آرہی ہے، اور جو قرآن کریم یا احادیث نبویہ سے صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت ہیں، وہ بعض افراد کو اپنے مزاج کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، اس لئے قرآن و سنت کی جن نصوص سے وہ ثابت ہیں ان میں وہ تادیب اور تحریف کا دروازہ کھول دیتے ہیں، اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں یہ احکام شرعیہ (معاذ اللہ) مبنی بر حکمت نہیں رہے،

مثلاً قرآن کریم نے چور کی منزل کے بارے میں واضح حکم دیا ہے کہ :

الْمَارِقُ وَالسَّارِقُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيْهِمْ

چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے

ہاتھ کاٹ دو۔

اب ایک عرصہ سے مغرب کے مصنفین اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزاؤں پر اعتراض کرتے ہیں، اور چوروں پر ترس کھا کر ہاتھ کاٹنے کی سزا کو بہت سخت بلکہ (معاذ اللہ) جشیہ قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ عالم اسلام کے وہ متجددین جو مغرب کے ہر اعتراض کے جواب میں ہاتھ جوڑ کر معذرت پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اسی وقت سے اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزاؤں میں کوئی ایسی ترمیم کی جائے جو اہل مغرب کو راضی کر سکے، چنانچہ وہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت میں توڑ مروڑ کی کوشش کرتے رہے ہیں، ایک معاصر اہل قلم نے اپنے ایک مقالہ میں تو یہاں تک لکھ دیا کہ مذکورہ آیت میں چور سے مراد "سرمایہ دار" ہیں، اور ان کے ہاتھ کاٹنے سے مراد ان کے کارخانے ضبط کر لینا ہے، اور اس آیت میں چور کی سزا بیان نہیں کی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سرمایہ داروں کی تمام صنعتیں قومی تحویل میں لے لی جائیں، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سود، قمار اور شراب وغیرہ کی کسی نہ کسی شکل کو جائز قرار دینے کی فکر میں ہیں، اور اپنے اس طرز عمل کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ عقل کی رو سے موجودہ دور میں ان کی حرمت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لہذا یہاں اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ احکام شرعیہ اور عقل میں کیا نسبت ہے؟ شرعی احکام

کے معاملہ میں عقل سے کام لےنا لایا جاسکتا ہے؟ اور اس کی کیا حدود ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام عقل سلیم کے عین مطابق ہیں، اور ان میں سے ایک ایک کے بارے میں پوری تفصیل سے ناقابل انکار دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں، البتہ اس موضوع سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ چونکہ چند در چند ہیں، اس لئے یہاں اس بحث کو کئی حصوں پر منقسم کرنا پڑے گا، ذیل میں ہم مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کرتے ہیں، ان مقدمات کے اچھی طرح ذہن نشین ہوجانے کے بعد ہی صحیح نتیجہ برآمد ہو سکے گا، لیکن جو حضرات واقعہً اس مسئلہ کی تشفی بخش تحقیق چاہتے ہیں اُن سے گزارش یہ ہے کہ وہ اس بحث کے صرف کسی ایک جز، کو دیکھ کر عجلت میں فیصلہ نہ کریں، بلکہ پوری بحث اور اس کے تمام مقدمات کو ایک مرتبہ پورے غور و خوض اور ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھ لیں، واللہ ولی الہدایۃ والتوفیق،

۱۔ آزاد عقل اور ہدایت دگر ایسی؛

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرآن و سنت کا کوئی حکم عقل سلیم کے مخالف نہیں لیکن سب سے پہلے متعین کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، لہذا اچھے بُرے کی تمیز کے لئے کوئی عقل کو بنیاد بنایا جائے؟ اگر دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ اور قانون سازی اُس خالص عقل کی بنیاد پر کی جانے لگے جو ہر قسم کی دینی پابندیوں سے آزاد ہو تو دنیا میں ایک ایسی فوضویت اور انارکی کا دور دورہ ہوگا، جس کی موجودگی میں انسانیت کی بالکل تباہی یعنی ہر وجہ یہ ہے کہ اگر انسانی عقل کو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد کر دیا جائے تو اس سے وہ پیش پا افتادہ اخلاقی مسلمات اور حقائق بھی ثابت نہیں ہو سکتے جنہیں ایک شریف بچہ بھی درست سمجھتا ہے، مثلاً اپنی بہن کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب ایسا گھناؤنا جرم ہے جسے دنیا کے کسی مذہب و ملت اور کسی قوم میں بھی پسند نہیں کیا جاتا۔۔۔ یہاں تک کہ وہ بدترین لحد جو خدا و رسولؐ کو بھی نہیں مانتے وہ بھی اس فعل کو انتہائی

سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس گھناؤنے فعل کو ناجائز ثابت کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے، کیونکہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کو راحت پہنچانے کے لئے کھانا پکاتی ہے، اس کے سونے کے لئے بستر تیار کرتی ہو، اس کے کپڑے سینتی ہے، اس کی ضروریات کو سنوار کر رکھتی ہے، وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمارداری کرتی ہے، غرض اپنے بھائی کو آرام پہنچانے کے لئے اس قسم کی جو خدمت بھی انجام دیتی ہے، تو معاشرہ اُسے اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اس کی تعریف کرتا ہے، لیکن اگر یہی بہن اپنے بھائی کی جنسی تسکین کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے تو ساری دنیا اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ کر دیتی ہے، اگر ہر معاملہ کا تصفیہ خالص اور آزاد عقل کے حوالے سے کیا جائے تو وہ بالکل بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر ایک بھائی اپنی بہن سے ہر قسم کا آرام حاصل کر سکتا ہے تو جنسی آرام حاصل کرنا کیوں ممنوع ہے؟ یہ سوال اخلاق اور رسم و رواج کی معتبر کی ہوئی حدود کے تحت انتہائی اچنبھا بلکہ گھناؤنا محسوس ہوتا ہے، لیکن جو عقل کسی قسم کی حدود و قیود کی پابند نہ ہو اس کو آپ یہ کہہ کر مطمئن نہیں کر سکتے کہ یہ فعل اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست اور گھناؤنا فعل ہے، سوال یہ ہے کہ خالص عقلی نقطہ نظر سے اس میں کیا خرابی ہے؟ آپ کہیں گے کہ اس سے اختلاط انساب کا فتنہ پیدا ہوتا ہے، لیکن اول تو ہر تھکنسٹر دل کے اس دور میں اس جواب کے کوئی معنی ہی نہیں رہا اور اگر بالفرض اس سے اختلاط انساب ہوتا بھی ہو تو خالص عقل کی بنیاد پر ثابت کیجئے کہ اختلاط انساب بُری چیز ہے، کیونکہ وہاں بھی ایک آزاد عقل یہ کہہ سکتی ہے کہ اختلاط انساب کو بُرائی قرار دینا مذہب و اخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو عقل مذہب و اخلاق کی زنجیروں سے آزاد ہو اس کے لئے کسی بُرائی کو بُرائی ثابت کرنے کے لئے کسی خاص عقلی دلیل کی ضرورت ہی

آپ کہیں گے کہ یہ عمل انتہا درجے کی بے حیائی ہے، لیکن خالص اور آزاد عقل اس کے جواب میں یہ کہو گی کہ ”حیا اور بے حیائی“ کے یہ سارے تصورات

اس گھناؤنی عبارت کی شناخت و خباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجتے رہتے، لیکن ساتھ ہی دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس دلیل کا کوئی جواب آپ دے سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے جو عقل پرست صبح و شام آزاد عقل کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، اگر وہ سب مل کر اس اعتراض کا خالص عقلی جواب دینا چاہیں تب بھی قیامت تک نہیں دے سکتے،

اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ عبید اللہ قیسروانی جس کی عبارت اوپر لکھی گئی ہے قرآن کا کھلا منکر نہیں تھا، بلکہ دوسرے باطنیہ کی طرح قرآن میں عقل کی بنیاد پر تاویلات کیا کرتا تھا، اور یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ قرآن کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں درحقیقت وہ مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجاز و استعارہ اور تمثیل و تشبیہ ہے جس کا حقیقی مطلب کچھ اور ہے،

اسی طرح اگر آپ مطلق زنا کی حرمت آزاد اور خالص عقل سے ثابت کرنا چاہیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ آزاد عقل یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر دو مرد و عورت باہمی رضا مندی سے بدکاری کا ارتکاب کرنا چاہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسی بنا پر مغربی قوانین میں باہمی رضا مندی سے زنا کر لینا کوئی جرم نہیں ہے، کیونکہ ان قانون سازوں کو زنا بالرضا میں کوئی خالص عقلی خرابی نظر نہیں آئی، بلکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کی مجلس قانون ساز نے بھاری اکثریت سے تالیوں کی گونج میں یہ قانون منظور کیا ہے کہ دو مردوں کا باہمی رضا مندی سے لواطت (Homo Sexuality) کا ارتکاب

قانوناً بالکل جائز ہے، اس قانون سازی کی وجہ بھی یہی تھی کہ خالص عقلی طور پر اس عمل میں کوئی قابل سزائے خرابی نظر نہیں آئی،

اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، انسانی ذہن کے بناءے ہوئے قوانین کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ وہ انسانیت کی صحیح تربیت کر کے اس کو امن و سکون سے ہمکنار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، اور ان کے ذریعہ انسان عقل کے نام پر ایسی

ایسی بر عقلیوں کرتا ہے کہ الامان، وجہ یہ ہو کہ جب ”خالص عقل“ قانون سازی کی بنیاد ٹھہری تو اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، زمانے کا کوئی عام چلن اگر ایک زمانے کے افراد کو کسی ایک عمل کی اچھائی یا بُرائی پر متفق کرتا ہے، ہو تو کسی دوسرے زمانے کی عقل اسی عمل کے بارے میں کوئی مختلف رائے دیدیتی ہو کیونکہ ”عقل“ کے پاس کوئی ایسا متفقہ معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر اقدار (Values) کا تعین کیا جاسکے اور اس کی روشنی میں صحیح قوانین بنائے جاسکیں،

چنانچہ عہد حاضر کے ماہرین قانون بھی عقل و فہم کے ہزار دعوؤں کے باوجود سنا سال کی بحثوں کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قانون سازی کا یہ بنیادی مسئلہ ابھی طے نہیں کر سکے کہ قانون سازی کے لئے کسی چیز کو اچھائی یا بُرائی سمجھنے کا کیا معیار ہمیں مقرر کرنا چاہئے؟ ہمارے زمانے کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر جارج (George Whitecross) Paton (اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب ”اسول قانون میں تھوہیں“

”ایک مثالی نظام قانون میں کون سے مفادات کا تحفظ ضروری ہے؟

یہ ایک اتدرا کا سوال ہو جس میں فلسفہ قانون کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے

بنیادی طور پر یہ ”فطری قانون“ (Natural Law) کا مسئلہ ہے

لیکن اس سوال کا جواب ہم جتنا فلسفہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں،

اتنا ہی فلسفہ سے اس کا جواب ملنا مشکل ہے، کیونکہ ابھی تک اقدار کا کوئی

متفقہ پیمانہ نہیں مل سکا، واقعہ یہ ہو کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے کہ

جس میں ہمیں ایسی بنیاد مل سکتی ہے، لیکن مذہب کے حقائق کو اعتقاد یا

وجدان کے ذریعہ تسلیم کرنا ضروری ہے، نہ کہ خالص منطقی دلائل کے ذریعہ

اگر اسی مسنف نے ان آراء و خیالات کی بڑی دلچسپ داستان بیان کی ہے جو قانون

کے مقصد، اس کے فلسفہ اور اس کے اخلاقی بنیادوں سے متعلق مختلف مفکرین نے

ظاہر کی ہیں، لیکن بہ آراء و خیالات اس قدر منقاد ہیں کہ جارح بیٹن لکھتے ہیں :-
 ”قانون کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ اس بارے میں آراء و نظریات تقریباً اتنے
 ہی بے شمار ہیں جتنے اس موضوع سے متعلق رکھنے والے مصنفین کی تعداد،
 کیونکہ ایسے لکھنے والے مشکل ہی سے ملیں گے جنہوں نے قانون کے لئے کوئی
 مثالی مقصد وضع نہ کیا ہو۔“

آئیے انہوں نے تفصیل سے بتایا ہو کہ اس موضوع پر ہر زمانے میں مفکرین قانون
 عقل و فکر کی تگ و تاز سے اس الجھی ہوئی ڈور کو کس طرح مزید پرپرچہ بند کرتے رہے ہیں،
 آخر میں وہ لکھتے ہیں :-

“The orthodox natural law theory based
 its absolutes on the revealed truths of
 religion. If we attempt to secularize
 jurisprudence, where can we find an
 agreed basis of values ? (P. 126)

”راجہ عقیدہ فطری قانون کا نظریہ اپنے عمومی اصولوں کی بنیاد مذہب کے
 الہامی حقائق پر رکھتا تھا، اگر ہم اصول قانون کو لادینی بنانے کی کوشش
 کریں تو اقدار کی متفقہ بنیاد ہم کہاں سے لاسکیں گے؟“

غرض یہ کہ اگر وحی الہی کی رہنمائی سے قطع نظر کر کے عقل کو بالکل مادر پدر
 آزاد چھوڑ دیا جائے تو اچھے برے کی تمیز کرنے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی،
 انسان کو مگر ابھی اور بے عقلی کے لیے ایسے تاریک غاروں میں گرا کر چھوڑتی ہو کہ
 جہاں رشد و ہدایت کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نہیں پڑی، وجہ یہ ہے کہ وحی الہی کی
 رہنمائی کے بغیر جب انسان نری عقل کو استعمال کرتا ہے تو وہ اسے آزاد عقل سمجھتا ہے
 لیکن درحقیقت وہ اس کی نفسانی خواہشات کی غلام ہو کر رہ جاتی ہے جو عقل کی
 غلامی کی بدترین شکل ہے، جو لوگ ہر کام میں خالص عقل کی پیروی کا دعوے

کرتے ہیں وہ درحقیقت انہما درجہ کی خود فریبی میں مبتلا ہیں، اُن کے مقابلہ میں وہ لوگ زیادہ حقیقت پسند اور جرأت مند ہیں جو کھل کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل آزاد نہیں، بلکہ ہماری خواہشات نفس کی غلام ہے، فلسفہ قانون کی بحث میں... ماڈرن مفکرین کے ایک گروہ کا ذکر آتا ہے، جن کا فلسفہ (Noncognitivist Ethical Theory) کے نام سے مشہور ہے، عہد حاضر کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر فریڈمین کے الفاظ میں اس فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

Reason is and ought only to be the slave of the passions and can never pretend to any other office than to serve and obey them.

یعنی ”عقل درحقیقت انسانی جذبات کی غلام ہے، اور اسے صرف انہی جذبات کا غلام ہونا بھی چاہیے، اس کا کام اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اُن جذبات کی خدمت اور اطاعت کرتی رہے“ اس فلسفہ کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فریڈمین لکھتے ہیں:-

”اس کے علاوہ ہر چیز مثلاً ایک سادہ حکم، شرم دھیار جمائی، بلکہ ”اچھے“ بُرے“ جیسے تصورات یا ”فلاں کام ہونا چاہیے“ اور ”فلاں کام اس لائق ہے“ جیسے الفاظ سب خالصتہً خواہشات و جذبات کی پیداوار ہیں اور علم اخلاق نام کی کسی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے“

اس بحث سے قلع نظر کہ اُن لوگوں کا یہ فلسفہ اچھا ہے یا بُرا؟ لیکن بات انہوں نے بالکل سچی کہی ہے، کہ دجی الہی کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد عقل اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی رہ ہی نہیں سکتی، اس کے بعد انسان کے وجود اور اعمال و افعال

پر خالصتہً اس کے جذبات و خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے، اور یہ خواہشات و جذبات اسے جہاں لیجانا چاہیں وہاں اسے جانا پڑتا ہے، پھر اگر کسی کام کو انسان کا ضمیر قبول بھی نہ کرتا ہو تب بھی اس کے پاس خواہشات کو رد کرنے کے لئے کوئی معین بنیاد باقی نہیں رہتی، چنانچہ برطانیہ میں ہم جنس پرستی کو سب جواز دینے کا اقدام اسی بیچارگی کے عالم میں ہوا کہ بعض معزین اُسے ناپسند کرتے تھے، اور خود جائز قرار دینے والے بعض افراد کا ضمیر اس پر مطمئن نہ تھا، لیکن خواہشات کی غلام بننے کے بعد عقل کے پاس اس مطالبہ کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، وولفندٹن کمیٹی (Wolfenden Committee) جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی، اور جس کی سفارشات کی بنیاد پر سہیلی میں یہ فیصلہ ہوا، اس کی رپورٹ کے یہ الفاظ کس درجہ عبرت خیز ہیں :-

”جب تک قانون کے ذریعہ کام کرنے والی سوسائٹی اس بات کی جانی بھی اور سوچی سمجھی کوشش نہ کرے معاشرے میں مجرم کا خوف گناہ کے خوف کے برابر ہو جائے اُس وقت تک پرائیویٹ اخلاق اور بد اخلاقی کے تصدؤ کی حکمرانی باقی رہے گی، جو مختصر مگر صاف لفظوں میں قانون کے دائرہ کار سے باہر ہے۔“

لیکن شرآن کریم جو انسانیت کو خواہشات کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا چھوڑنے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت کا صاف اور سیدھا راستہ بتانے کے لئے آیا ہے اور جس نے واضح طور سے بتایا ہے کہ انسان کی جبلت میں اچھی اور بُری ہر طرح کی خواہشات و دلالت کی گئی ہیں وہ اپنے پیروؤں کو اس ہولناک اندھیرے میں نہیں چھوڑ سکتا، اس کی مصلحت میں وحی کی رہنمائی سے آزاد عقل کا نام ”ہوئی“ ہے، جس کے بارے میں اس کے ارشادات یہ ہیں :-

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَاَ هُمْ كَفَسَدَتِ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ (المؤمنون: ۷۱)

”اور اگر حق اُن کی خواہشات کے پیچھے چلے تو آسمان وزمین اور

ان کی مخلوقات درہم برہم ہو کر رہ جائیں“
أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَنْ زُتِيَ لَهُ سُوءُ
عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (محمّد: ۱۴)

”تو کیا وہ شخص جسے اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی ملی ہو ان لوگوں کی
طرح ہو سکتا ہے جنہیں اپنی بد عملی ابھی لگتی ہے، اور جو اپنی خواہشات

نفس کی اتباع کرتے ہیں“
وَلَا تُفْلِمُ مَنْ أَغْضَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ ذِكْرِ نَا وَاتَّبَعَ
هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا، (کہف: ۲۸)

”اور ہم اس شخص کی اطاعت نہ کر دیں جس کے دل کو ہم نے اپنی
یاد سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے ہو گیا،
اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا“

فَلَا يَصْلُكَ تِلْكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ
فَكَتَرَدَلَىٰ (طہ: ۱۶)

”پس تمہیں آخرت سے ہرگز گریزان نہ کرے وہ شخص جو اس پر
ایمان نہیں رکھتا، اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتا ہے (ایسا
نہ ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ“

وَمَنْ أَهْتَلٰ هَمِّنَ اتَّبَعَ هَوَاهُ يَغْيِرْهُدَىٰ مِّنَ اللّٰهِ،
(القصص: ۵۰)

”اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو گا جو اللہ کی طرف سے آئی
ہوئی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے“

فَلَمَّا آتَاكَ الْقَادِرُ وَاسْتَفْتَمُكَ كَمَا آمَرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ (الشوری: ۱۵)

”پس اسی کی تم دعوت دو، اور جیسا تمہیں حکم دیا ہے اس پر
استقامت اختیار کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو
اَفَلَمْ تَلَمَّ اِجَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ كَمَا لَا تَهْوٰی اَنْفُسُكُمْ
اَسْتَكْبَرْتُمْ“ (البقرہ: ۸۷)

”تو کیا تمہارا حال یہ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہارے پاس اسی
بات لے کر آئے جو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم نے
سرکشی کی“

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد اس عقل پر نہیں جو خواہشاتِ نفس
کی غلام ہو، بلکہ اُس عقل پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہدایات کی پابند
اور اپنے حدودِ کار سے اچھی طرح واقف ہو، اور یہی عقلِ سلیم کی تعریف ہے،
۲۔ اسلامی احکام کی حکمتیں اور دین میں ان کا مقام

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے ذریعہ جو احکام دیئے ہیں
وہ معاذ اللہ عقل و حکمت کے خلاف ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
دیئے ہوئے احکام عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں، اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ
صلاح و فلاح کا اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ اس کے ہر حکم
میں بہت سی حکمتیں مصلحتیں اور انسانیت کے فوائد مضمر ہوتے ہیں، لیکن یہ
ضروری نہیں کہ ہماری محدود عقل اُن تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ بھی
کر سکے، ظاہر ہے کہ وہ خالق کائنات جس کے سامنے زمین و آسمان کی تمام
موجودات اور ماضی و مستقبل کے تمام حالات ہیں، اس کے علم و حکمت کا کون
احاطہ کر سکتا ہے؟ لہذا یہ عین ممکن ہے کہ قرآن و سنت کے کسی حکم کی حقیقی حکمت
و مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آنے کا یہ نتیجہ

ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس حکم ہی کو درست تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ اگر انسان کو اپنے فائدے کی تمام باتیں از خود سمجھ میں آسکتی تھیں تو پیغمبروں کو بھیجے اور سامانی کتابیں نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وحی و رسالت کا مقدر سلسلہ تو جاری ہی اس لئے کیا گیا ہو تاکہ اس کے ذریعہ انسان کو ان باتوں کی تعلیم دیا جاسکے جس کا ادراک نرمی عقل سے ممکن نہیں، اس لئے اگر اللہ پر اس کی قدرت کاملہ پر اس کے علم محیط پر اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان ہے تو لازماً یہ بھی ماننے پڑے گا کہ اس کے نازل کئے ہوئے ہر حکم کی پوری پوری مصلحت کا بالکل سمجھ میں آجانا ضروری نہیں، اور اگر اس کا کوئی حکم ہماری محدود عقل و نظر سے ماوراء ہو تو اُسے ماننے سے انکار کرنا کوئی معقول طرز عمل نہیں، اس بات کو ایک نظریہ سمجھئے، دنیائے جسکی ملک میں کوئی قانون بنایا جاتا ہے وہاں قانون سازوں کے پیش نظر ہر قانون کی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں، اور انہی مصلحتوں کی خاطر وہ قانون نافذ کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ملک کا ہر شہید ملک کے ہر قانون کی پوری پوری مصلحتوں سے باخبر ہو؟ ظاہر ہے کہ ملک میں بسا اوقات اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو قانون اور اس کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے قوانین سے واقف نہیں ہوتے، اب کسی ملک کا جو قانون اُس کے بہترین دماغوں نے تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر بنایا ہو، کیا اُسے اس بنا پر ناکارہ یا غلط کہا جاسکتا ہے کہ چند ان پڑھ دیہاتیوں کو اس کا فائدہ سمجھ میں نہیں آیا؟ اگر کوئی جاہل انسان محض اس بنا پر کسی قانون کی تعمیل سے انکار کرے، کہ اس کی مصلحتیں میری سمجھ سے باہر ہیں تو اس کا مقام جبل خانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر ماہرین قانون اور ایک جاہل انسان کے علم میں تو کسی نسبت کا تصور کیا بھی جاسکتا ہے، خالق کائنات اور ایک بے مقدار انسان کے علم میں تو کوئی نسبت ہی..... متصور نہیں، لہذا ایک انسان کے لئے یہ بات کیونکر معقول ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی صریح اور واضح حکم کو اس بنا پر رد کر دے

یا اس میں تاویل و تحریف کا مرتکب ہو کہ اس کے فوائد اس کی سمجھ میں نہیں آرہے،

۳۔ حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا

اسی بنا پر تمام اہل علم کا ہر دور میں اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شرعی حکم کا دار و مدار ان کی حکمتوں پر نہیں بلکہ علتوں پر ہوتا ہے، چونکہ ہمارے دور میں بہت حضرات ”علت“ اور ”حکمت“ کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے، اس لئے یہاں مختصراً ان دونوں کی حقیقت بھی سمجھ لینا ضروری ہے،

”علت“ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قانون کے واجب لتعمیل ہونے کا لازمی سبب ہوتی ہے، اس کی حیثیت ایک ایسی لازمی علامت کی سی ہے جسے دیکھتے ہی قانون کے متبعین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حکم کی پیروی کریں، اور ”حکمت“ اس فائدے اور مصلحت کو کہتے ہیں جو قانون وضع کرتے وقت قانون ساز کے پیش نظر ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم نے شراب کی حرمت کا حکم دیا ہے، اور ”نشہ“ کو حرمت کی لازمی علامت قرار دیا گیا ہے، کہ جس چیز میں بھی نشہ ہو اس کا پینا ممنوع ہے، اور اس ممانعت کی بہت سی مصلحتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ ہوش و حواس کھو کر ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو انسانی شرف و وقار سے فروتر ہیں۔ اس مثال میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ شراب سے پرہیز کرو، ایک حکم ہے، ”نشہ“ اس حکم کی علت ہے، اور لوگوں کو ہوش و حواس کھو کر بڑے افعال سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب ممانعت کے حکم کا دار و مدار اس کی علت یعنی ”نشہ“ پر ہوگا، اور جس چیز میں بھی ”نشہ“ پایا جائے گا، اُسے حرام کہیں گے، اس حکم کی حکمت پر حکم کا دار و مدار نہیں ہوگا، لہذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب پینے کے باوجود بہکتا نہیں ہوں اور نہ ہوش و حواس کھوتا ہوں، اس لئے شراب میرے لئے جائز ہوئی چاہئے، یا اگر کوئی شخص کہے لگے کہ آجکل شراب تیار کرنے کے زیادہ ترقی یافتہ ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں جنہوں نے اُس کے نقصانات کو کم کر دیا ہے، اور شراب پینے والوں کی ایک بڑی تعداد

شراب نوشی کے باوجود ہوش و حواس کے ساتھ اپنے کام کرتی رہتی ہے، اس لئے آجکل شراب جائز ہونی چاہئے، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ عذر قابل سماعت نہیں ہوگا، اسی طرح قرآن و سنت نے اپنے متبعین کو مشقت سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنے کے بجائے آدمی نماز پڑھا کر وجہ ”قصر“ کہتے ہیں، اس مثال میں ”قصر“ ایک حکم ہے، سفر اس کی علت ہے، اور مشقت سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب حکم کا دار و مدار اس کی علت یعنی سفر پر ہوگا، حکمت پر نہیں، لہذا اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آجکل ہوائی جہازوں اور ریل کے آرام دہ ڈبوں نے سفر کو آسان کر دیا ہے، اور اب پہلی سی مشقت باقی نہیں ہی آسکتی ”قصر“ کا حکم باقی نہیں رہا، تو اس کا یہ کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ کے بندے کی حیثیت میں ہمارا کام حکم کی علت دیکھ کر حکم پر عمل کرنا ہے، اس حکم کی حکمتوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام کی تعمیل ہمارا منصب نہیں،

اور یہ قاعدہ صرف اسلامی شریعت ہی کا نہیں، بلکہ رائج الوقت قوانین میں بھی یہی قاعدہ کارفرما ہے، مثال کے طور پر ٹریفک کے حادثات کی روک تھام کے لئے حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب کسی چورلے پر سُرُخ سگنل نظر آئے ہر گاڑی کے لئے رُک جانا لازمی ہے، اس مثال میں گاڑیوں کا یہ حکم کہ ”رُک جاؤ“ ایک قانون ہے، سُرُخ سگنل اس قانون کی علت ہے، اور تصادم کے خطرات سے بچاؤ کرنا اس کی ”حکمت“ ہے، اب اس حکم کا دار و مدار اس کی ”علت“ یعنی سُرُخ سگنل پر ہے، نہ کہ اس کی ”حکمت“ یعنی تصادم کی روک تھام پر، لہذا اگر کسی وقت حادثے کا کوئی خطرہ نہ ہو تب بھی سگنل دیکھ کر رُک جانا لازمی ہے، اور اگر کوئی ڈرائیور یہ سوچ کر سگنل پار کر جائے کہ اس کی نظر میں حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو قانون کی نظر میں وہ مجرم اور چالان کا مستحق ہے،

غرض رائج الوقت قوانین میں بھی احکام کا دار و مدار ہمیشہ ان کی علتوں پر ہوتا ہے..... حکمتوں پر نہیں ہوتا، اور جب دنیا کے عام قوانین کا معاملہ یہ ہے

توانش کے بنائے ہوئے قوانین میں تو اس قاعدے کی پابندی زیادہ ضروری ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم ہر شرعی حکم کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لئے اگر احکام کا مدار حکمتوں پر رکھا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایک فائدہ کو حکم کی واحد حکمت سمجھ کر اس کے مطابق کوئی اقدام کر بیٹھیں، حالانکہ اس کی دوسری بہت سی حکمتیں اور بھی ہوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ”حکمت“ یا ”مصلحت“ عموماً کوئی لگی بندھی، منضبط اور ایسی واضح چیز نہیں ہوتی جسے دیکھ کر ہر کس و نا کس یہ فیصلہ کر سکے کہ یہاں یہ حکمت حاصل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اگر حکم کا دار و مدار اس کی حکمتوں پر رکھ دیا جائے تو احکام و قوانین کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں حکم پر اس لئے عمل نہیں کیا کہ اس وقت، اس کی حکمت نہیں پائی جا رہی تھی، مثلاً اگر ہر شخص کو یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ چوراہے عبور کرتے وقت خود یہ فیصلہ کرے کہ حادثے کا خطرہ ہے یا نہیں، اگر خطرہ ہو تو رُک جائے اور خطرہ نہ ہو تو آگے بڑھ جائے، تو اس کا نتیجہ شدید بد نظمی اور پبلے درجے کی ابتری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح اگر شراب کی حرمت کو اس کی علت یعنی نشہ کے بجائے اس کی حکمت پر موقوف کر دیا جائے تو ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے شراب سے ایسا نشہ لاحق نہیں ہوتا جو میرے ہوش و حواس گم کر کے میرے کاموں میں خلل انداز ہو، ایسی صورت میں حرمت شراب کا حکم محض ایک کھلونا بننے کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے؟

اس کے برعکس احکام کی علتیں ایسی لگی بندھی اور منضبط ہوتی ہیں کہ ہر شخص انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہاں علت پائی جا رہی ہے، لہذا ان کے ذریعہ احکام کی خلاف ورزی پر گرفت بھی باسانی ہو سکتی ہے، اور ان پر قوانین کا دار و مدار قرار دے کر ہی دنیا میں نظم و ضبط، امن و سکون اور قانون کا احترام پیدا کیا جاسکتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے بہت سے علماء نے اسلامی احکام کی حکمتیں اور

مصلحتیں واضح کرنے کے لئے باقاعدہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اور ہر حکم کے بارے میں بتایا ہے کہ اس سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اسلامی احکام کی تمام حکمتوں کو بایں ہے، اور نہ یہ غلط فہمی کسی کو ہوتی ہے کہ آئندہ ان احکام کی تعمیل حکمتوں اور مصلحتوں کو دیکھ دیکھ کر کی جائے گی، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ اسی مقصد کے لئے لکھی ہے کہ اس کے ذریعہ شریعت کی حکمتوں کو تفصیل سے واضح کریں، اور انھوں نے ایسے لوگوں کی سخت تردید کی ہے جو احکام شریعت کی حکمتوں کا انکار کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تحریر فرماتے ہیں :-

لا یحل أن یتوقف فی امتثال احکام الشرع اذا صحت بہا
الروایۃ علی معرفۃ تلك المصالح لعدم استقلال عقول
کثیر من الناس فی معرفۃ کثیر من المصالح ولکون النبی
صلی اللہ علیہ وسلم اوثق عندنا من عقولنا ولذلک
لم یزل لہذا العلم مضمونا بہ علی غیر اہلہؑ

”یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ شریعت کے جو احکام صحیح روایت سے ثابت ہیں ان کی تعمیل میں اس بنا پر پس پوچھ لیا جائے کہ ان کی مصلحتیں ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں بہت سی مصلحتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتیں اور کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نزدیک ہماری عقلوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں اسی لئے اس علم (یعنی حکمت دین کے علم) کو ہمیشہ نا اہل لوگوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے“

۱۵ حجۃ اللہ البالغہ ص ۶ ج ۱ مطبوعہ مکتبۃ سلفیہ لاہور ۱۳۹۵ھ، اسی کی مزید تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب مذکور، ص ۱۲۹ ج ۱ باب الفرق بین المصالح والشرائع ۱۲

۴۔ احکام شریعت کا اصل مقصد اتباع کا امتحان ہے،

ایک اور چیز جو احکام شریعت کے معاملہ میں پیش نظر رہنی چاہئے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد ”اللہ کی بندگی“ ہے، ارشاد ہے :-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ
(الذاریات : ۵۶)

اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ

وہ میری بندگی کریں

اور اس بندگی کا طریقہ بھی قرآن کریم نے واضح فرما دیا ہے، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکمل اتباع میں منحصر ہے، ارشاد ہے :-

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا
مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ، (الاعراف : ۷)

جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اُس کا اتباع کرو، اور اس کے علاوہ دوسرے (خود ساختہ) شرکا کا اتباع نہ کرو

يَقُومُوا اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ، اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَأْسَأُكُمْ
أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ (النس : ۲۰ و ۲۱)

اے میری قوم! (اللہ کے) پیغمبروں کی اتباع کرو، اُن کی اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگے، اور وہ ہدایت پر ہیں،
وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ،
(الزمر : ۵۵)

اُن بہترین باتوں کی اتباع کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہیں

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبَارَكًا فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا
تَعْلَمُوا تَرْحَمُونَ (الانعام: ۱۵۳)

”اور یہ برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، پس تم اس کے
اتباع کرو، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے“

فَأَمَّا مَن يُؤَايِئِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَمَا يَأْتِهِ مِنَ الْغَنِيِّ الَّذِي يَكُونُ مِنَ اللَّهِ
وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ (الاعراف: ۱۵۵)

پس تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جو اُمّی ہے، اور خود
اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھنا ہے اور اس کی اتباع کرو“

قرآن کریم ہی نے یہ واضح فرمایا ہے کہ انسان کو پیرا کرنے اور اُسے مختلف احکام کا پابند
بنانے کا مقصد اس بات کی آزمائش ہے کہ کون اللہ اور اس کے رسول کی اتباع
کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَسْبُوَكُمْ أَتَعْلَمُونَ
أَحْسَنُ عَمَلًا (المملک: ۲)

”اللہ وہ ذات ہے جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا
تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے؟“

وَمَا جَعَلْنَا الْفَيْبَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن
يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ (البقرہ: ۱۲۳)

”اور (اے نبی!) جس قبلے پر آپ پہلے تھے اس کو ہم نے صرف اسی
لئے قبلہ بنایا تھا تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ کون رسول کی اتباع

کرتا ہے اور کون لٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے“

اور جب بندے کا کام ہی اللہ اور اس کے رسول کی اتباع ہوا، اور اسی میں اس کی
ساری آزمائش ہے، تو اللہ اور اس کے رسول کا کوئی صریح حکم آجانے کے بعد انسان
کا کام بس تسلیم خم کر دینا ہے، اُس کے بعد اُسے یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ حکم

اسے اچھا لگے تو قبول کرے اور اچھا نہ لگے تو اسے رد کر دے؛
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ
أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمْ الْخَيْرَ مِنْ أَمْرِ هَبْ،

(الاحزاب: ۳۶)

”اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا
رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار
باقی رہے۔“

لہذا اللہ اور اس کے رسول کا واضح حکم سننے کے بعد اگر کوئی شخص اس بناء پر اسے
ماننے میں تامل کرے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تو درحقیقت
وہ عقل کا نہیں، بلکہ اپنی خواہشات نفس یا شیطان کا اتباع کر رہا ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ
كُلَّ شَيْطَانٍ مَرِيدٍ، (الحج: ۳)

”اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں (صحیح) علم کے بغیر
جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔“
ایسے شخص کو آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی خسارہ اٹھانا پڑے گا:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَ
خَيْرٌ لِّطَمَآنٍ بِهِ ۖ وَلَوْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ ۖ انْقَلَبَ
عَلَىٰ وَجْهِهِ ۖ فَنَحْسَهُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ ۚ طٰ ذٰلِكَ هُوَ
الْخَسِرَانِ ۝ (الحج: ۱۱)

”اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (اس طرح) کرتا ہے (جیسے) کنار
پر دھڑا ہو) پس اگر اسے کوئی (دنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ
سے مطمئن ہو گیا، اور اگر کوئی آزمائش پڑ گئی تو مٹا اٹھا کر چل دیا،
(ایسا شخص) دنیا اور آخرت (دونوں) کے خسارے میں ہو اور یہ

لہذا اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہر حکم اگرچہ اپنے پیچھے بیشمار حکمتیں اور مصالح رکھتا ہے، لیکن انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس حکم کی اطاعت کا مقصدِ اصلی اُن حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ بنائے، بلکہ اس کا اصل مطمح نظر ایک حقیقی بندے کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی خوشنودی اور اس کے احکام کا اتباع ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کریم میں سیرت کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور اس پر کفار نے یہ اعتراض کیا کہ:-

قَالُوا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا،

”انھوں نے کہا کہ بیع سود ہی کی طرح تو ہے“

تو اس کے جواب میں بہت سی عقلی دلیلیں بھی دی جاسکتی تھیں، اور یہ بھی بتایا جاسکتا تھا کہ بیع و شراہ اور سودی لین دین میں کیا فرق ہے؟ لیکن ان ساری عقلی توجیہات کو چھوڑ کر قرآن حکیم نے ایک ہی ٹکسالی جواب دیا:-

وَ اَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ: ۲۷۵)

”حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام“

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ایک چیز کو حلال اور ایک کو حرام کر دیا تو اب انھیں عقلی دلیلیں طلب کرنے کی گنجائش نہیں، تمہارے لئے دونوں کے درمیان یہی فرق کیا کم ہے کہ اللہ نے دونوں کا حکم یکساں نہیں رکھا، بلکہ ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیدیا ہے،

قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ دسیوں مقامات پر مذکور فرمایا ہے، اس واقعہ میں مذکور ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی تھی کہ ”میں آدم سے بہتر ہوں“ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو کیچڑ سے“ غور فرمائیے کہ خالص اور آزاد عقل کے نقطہ نظر سے اس دلیل میں کیا خرابی تھی؟ لیکن یہی ”عقلی دلیل“ ابلیس کے راندہ درگاہ ہونے کا سبب بن گئی، وجہ وہی تھی کہ واضح اور صریح حکم آجانے

کے بعد اس کے خلاف عقل کی پیروی درحقیقت عقل کی نہیں خواہشات کی غلامی ہے
 شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے یہی بات بڑے لطیف پیرایہ میں کہی ہے ۔
 صبح ازل یہ مجھ سے کہا جرتیل نے ۛ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
 ۛ۔ قرآن و سنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ

اور جب انسان کا قریضہ احکام الہی کا اتباع ہے تو اس کا صاف اور
 سادہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کا جو حکم صریح اور واضح ہو اسے اپنے واضح معنی
 میں ہی خستیا کر کیا جائے، اور محض اس بنا پر اس میں توڑ مروڑ اور تاویل و تحریف
 کا ارتکاب نہ کیا جائے کہ یہ واضح معنی ہمارے نفس کو پسند نہیں آرہے، اللہ تعالیٰ
 نے اپنی کتاب ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمائی ہے، اور اس لئے نازل فرمائی ہے
 کہ اس کے احکام کا ادراک ہم محض اپنی عقل سے نہیں کر سکتے تھے، لہذا اُس کی
 تشریح و تفسیر میں اگر ہم اپنی خواہشات کی بنا پر رد و راز کار تاویلات اختیار
 کریں گے، تو یہ اُن احکام کا نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا اتباع ہوگا، اور اس
 سے کتاب الہی کا مقصد نزول ہی تلیٹ ہو کر رہ جائے گا،

قرآن کریم کا معاملہ تو انتہائی ارفع و اعلیٰ ہے، خود انسانی ذہن کے تراشے
 ہوئے قوانین کا حال یہ ہے کہ جب پارلیمنٹ کوئی قانون منظور کر لیتی ہے تو جج
 کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اس قانون کی لفظی پیروی کرے، اگر اسے اپنے علم اور
 تجربے کی روشنی میں وہ قانون غلط معلوم ہوتا ہو تب بھی وہ اس کے اتباع
 پر مجبور ہے، اور اس کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہو کہ اپنی ذاتی رائے کی
 بنیاد پر قانون کی ایسی تعبیر و تشریح کرے جو اس کے الفاظ اور عبارتوں کے لحاظ
 سے دور از کار ہو، موجودہ ”اصول قانون“ میں ایک مستقل بحث ”تعبیر قانون“

(Interpretation of statutes.) سے متعلق

ہوتی ہے، اس بحث کا خلاصہ ڈاکٹر حاج پیٹن کے الفاظ میں یہ ہے :-
 ”انگریزی مقدمات میں تعبیر قانون کے تین بنیادی اصول تجویز کئے گئے ہیں

پہلا اصول لفظی اصول کہلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قانونی دفعہ کا مطلب واضح ہو تو ہر حال میں اسی پر عمل کیا جائے گا، نتائج خواہ کچھ ہوں، دوسرا اصول ”سنہرا اصول“ کہلاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قانون کے الفاظ کو ہمیشہ اُن کے معمولی معنی پہنائے جائیں گے، تا وقتیکہ ایسا کرنے سے کوئی اہمال یا قانون کی باقی دفعات سے واضح تضاد پیدا نہ ہوتا ہو، تیسرا اصول ’فسادی اصول‘ (Mischief Rule) ہے جو اس

بات پر زور دیتا ہے کہ اس قانون کی عمومی پالیسی کیا ہے؟ اور کس خرابی کو کرنا اس کے پیش نظر ہے؟

آگے اس تیسرے اصول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

”یہ نظریہ کہ پارلیمنٹ کی نیت اور اس کے مقصد کی پیروی کرنی چاہئے، ہمیں (الفاظ قانون سے) زیادہ دور نکلنے کی گنجائش نہیں دیتا، کیونکہ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ تعبیر قانون کے وقت پارلیمنٹ کی داخلہ نیت۔

(Subjective Intention) پر غور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ

پارلیمنٹ کی نیت بھی لازماً اس کے وضع کردہ قانون ہی سے نکالی جاسکتی ہے۔

یہ اس قانون کا حال ہے جسے انسانی ذہن جنم دیتا ہے، اور جس کے بارے میں پیٹن کے الفاظ میں خود ماہرین قانون کا اعتراف یہ ہے کہ :-

”یہ سمجھنا مبالغہ ہوگا کہ افسان اپنے ہر عمل کی کوئی معقول وجہ رکھتا ہے، اس

کے بجائے ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ہم کوئی کام پہلے کر لیتے ہیں اور سوچتے

بعد میں ہیں، ہمارا یہ طرز عمل صرف اسی قسم کی صورت حال سے مخصوص نہیں

جب ہم کسی تیز رفتار کار سے اپنی جان بچانے کے لئے چھلانگ لگاتے ہیں،

بلکہ یہ طرز عمل بسا اوقات اس وقت بھی ہوتا ہے، جب ہم معاشرتی رسوم و

عاماً کو جنم دیتے ہیں، بلکہ اگر کسی ادارے یا قانون کی تشکیل کے وقت کوئی معقول پالیسی پہلے سے متعین رہی ہو تب بھی ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ قانون کا حاصل ہونے والا نتیجہ اُس مقصد سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کی خواہش نے وہ قانون بنوایا تھا۔

لیکن ایک نچ یہ جاننے کے باوجود کہ قانون کے موجودہ ڈھانچے سے اس کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، اُسی قانون کی لفظی پیروی پر مجبور رہی، اور اسے دروازہ کار تادیلا گھڑنے کا حق حاصل نہیں، خواہ وہ اس کی نظر میں مطلوبہ نتائج سے زیادہ قریب ہوں بلکہ بقول پیٹن :-

”اگر کہیں غیر منصفانہ قوانین نافذ ہوں تو لیمپلچر (قانون ساز ادارہ) تو انہیں منسوخ کر سکتا ہے، لیکن جج پر ایسے قانون کی پیردی لازم ہے، خواہ وہ اس قانون کے اصولوں کو کتنا ہی ناپسند کرتا ہو۔“

کیونکہ جج درحقیقت قانون ساز نہیں، بلکہ شارح قانون ہے، اس کا منصب قانون وضع کرنا نہیں، بلکہ قانون کا اتباع کرنا ہے، اور وہ قانون کی تشریح بھی اپنی حدود میں رہ کر کر سکتا ہے، جو ”اتباع“ کے دائرے میں سما سکتی ہوں، اُسے ”اتباع“ کی حدود پھلانگ کر ”اصلاح و ترمیم“ کے منصب پر پہنچ جانے کا اختیار نہیں ہے، یہ حال انسان کے بنائے ہوئے اُن قوانین کا ہے جن میں فکری غلطیوں کے ہزار امکانات موجود ہیں، جن میں نہ قانون سازوں کی امانت و دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے، نہ اُن کی عقل و فکر کو غلطیوں سے پاک کہا جاسکتا ہے، اور نہ اس بات کی کوئی ضمانت ہے کہ انھوں نے واقعہً اس قانون کے تمام ممکنہ نتائج پر مکافقہ غور کر لیا ہوگا،

پھر یہ ان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جنہیں آنے والے دن کا بھی کچھ

پتہ نہیں کہ وہ حالات میں کیا تبدیلی لے کر نمودار ہوگا؟ اور نہ اس بات کا کوئی علم ہے کہ ہمارے مطلوبہ نتائج اس قانون سے حاصل ہو سکیں گے یا نہیں؟ جب محض قیاسات اور تخمینوں کے اندھیروں میں بنے ہوئے قوانین کا اتباع اس درجے میں لازم ہے تو وہ خالق کائنات جس کے علم محیط سے موجودات کا کوئی ذرہ مخفی نہیں جو زمانے کے تمام بدلنے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے جو انسان کے نفع و نقصان اور اس کی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، اس کے ہنائے ہوتے قوانین میں محض اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر دو راز کا رتا دیلات تلاش کرنا آخر کونسی عقل، کونسی دیانت اور کونسی انصاف کی رُوسے درست ہو سکتا ہے؟

۶۔ زلمے کی تبدیلی اور احکام شرعیہ

پھر یہاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے، آجکل یہ بات تقریباً ہر "حجرت پسند" کی زبان پر رہتی ہے کہ کسی بھی نظام قانون کو جامد (Static) نہیں ہونا چاہئے، بلکہ حالات کے لحاظ سے تغیر پذیر (Dynamic) ہونا چاہئے، اور یہ بات "حجرت پسند" ذہن کی خاصیت ہے کہ اس کی نظر میں جب کوئی چیز بُری قرار پاتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا بُری ہوتی ہے، اور اس کا نام ہی گالی بن جاتا ہے، اور جب کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا خیر بن جاتی ہے، اور جگہ بے جگہ اس کا استعمال ایک فیشن بن جاتا ہے، یہی حال جامد (Static) اور تغیر پذیر (Dynamic) کی اصطلاحات کا ہے کہ اول الذکر کی بُرائی کرنا، اور مؤخر الذکر کی تعریف کرنا آج کا علمی فیشن بن چکا ہے، اور جس "حجرت پسند" کو دیکھئے، دنیا کی ہر چیز میں "جامد" اور "قابل تغیر" کے نام سے مُنہ بنانے اور "تغیر پذیر" کے نام سے خوش ہونے کا عادی بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کے فکری نظام میں کوئی بڑے سے بڑا اخلاقی یا دینی اصول ناقابل تغیر باقی نہیں رہا، بلکہ انھوں نے زندگی کی ہر چیز کو "تغیر پذیر" کی خداداد پرکھس دیا ہے، اور اس کی دست برد سے نہ کوئی دینی عقیدہ محفوظ ہے اور نہ کوئی اخلاقی اصول صحیح سالم رہا ہے،

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ ہر چیز کا ہر حال میں "نا قابل تغیر" رہنا انسانیت کے لئے مفید ہے اور نہ ہر چیز کا ہر حال میں "تغیر پذیر" رہنا، انسان کو اس دنیا میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے جہاں اس بات کی ضرورت ہو کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کرتا رہے وہاں اس بات کی بھی شدید ضرورت ہو کہ اس کے پاس کچھ اصول و احکام ہر حال اور ہر زمانے میں آن مٹ اور نا قابل ترمیم ہوں، اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان میں تبدیلی نہ کر سکے، ورنہ اس کی بہیمی اور نفسانی خواہشات "زمانے کی تبدیلی" کی آڑ لے کر اس کو شر و فساد اور اخلاقی دیوالیہ پن کی اس آخری سرحد تک پہنچا سکتی ہیں جہاں وہ "انسانیت" کے ہر جملے سے آزاد ہو کر جانوروں کی صف میں شامل ہو جائے، اگر دنیا کے ہر فکری اصول، ہر اخلاقی ضابطے اور ہر قانونی حکم کو "تغیر پذیر" قرار دے کر جب جی چاہے بدل دینے کی آزادی ہو تو اس کا انجام اُس حلاق باختل، انسانیت کشی اور اضطراب و بے چینی کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، جو ہمارے زمانے میں مغربی معاشرے کا مقدر بن چکی ہے اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ تمام فکری اصول اور قانونی احکام قابل ترمیم و تغیر نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ کچھ احکام ایسے بھی رہنے ضروری ہیں جو کسی حال تبدیل ہوں تو اب صرف مسئلہ باقی رہتا ہے کہ قانون کے کون سے احکام کو نا قابل تغیر قرار دیا جائے اور کون سے احکام کو قابل تغیر؟ اگر اس مسئلے کو "عقل خالص" کے حوالے کیا جائے تو اس کی نارسائی کا مفصل حال آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اس کے علاوہ اس مسئلے کو "نری عقل" کے حوالہ کر کے آپ کبھی ایسے نا قابل تغیر اصول و احکام حاصل نہیں کر سکتے، جو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان متفق علیہ ہوں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کی عقل کا فیصلہ اور سوچ کے نتائج دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص یا جماعت کسی ایک اصول کو نا قابل تغیر قرار دے گی اور دوسرا شخص یا جماعت کسی دوسرے اصول کو اور مسئلہ جوں کا توں باقی رہے گا، لہذا اس مسئلہ کا حل بھی بجز اس کے کوئی نہیں کہ جس ذات نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو انسان کی تمام

واقعی ضروریات سے بھی باخبر ہے اور اس کے نفس کی چوریوں سے بھی آگاہ ہے، اسی سے اس معاملہ میں رہنمائی طلب کی جائے، اور اس سے رہنمائی طلب کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اُس کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی طرف رجوع کیا جائے، جو بالترتیب قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہیں جب ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور سے نظر آتا ہے کہ ان میں بعض احکام صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور بعض احکام میں ان دونوں نے محض چند موٹے موٹے اصول بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے، اور ان کی جزوی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں، قرآن کریم کے ارشادات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت چونکہ کسی خطے یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے عام ہے، اس لئے جن احکام پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اُن کو قرآن و حدیث میں صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اور بعض اوقات اُن کی جزوی تفصیلات بھی معین فرمادی گئی ہیں، اس کے برعکس جو احکام زمانے کی تبدیلی سے متاثر ہو سکتے تھے قرآن و حدیث نے اُن کی جزوی تفصیلات معین کرنے کے بجائے کچھ عام اور ہمہ گیر اصول بیان فرمادیئے ہیں، جن کی روشنی میں ہر دور کے اہل علم جزوی تفصیلات معین کر سکیں،

لہذا قرآن و حدیث میں جو احکام منصوص ہیں اور جن پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے وہ قطعی طور پر ناقابل تغیر اور ہر دور کے لئے واجب العمل ہیں، کیونکہ اگر زمانے کے بدلنے سے اُن میں فرق پڑتا تو انھیں قرآن و حدیث میں منصوص نہ کیا جاتا، ہاں جو احکام قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں، اور نہ اُن پر امت کا اجماع منعقد ہوا ہے اُن میں قرآن و سنت کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہے، اسی قسم کے احکام پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی ہے، اور ایسے ہی احکام کے بارے میں فقہاء کا یہ مقولہ ہے کہ:

الاحکام تتغیّر بتغیّر الزمان

احکام زمانے کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں

در نہ اگر قرآن و سنت کے واضح اور صریح احکام میں بھی زمانے کی تبدیلی سے ترمیم و تغیر کی گنجائش ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو آسمانی کتاب نازل کرنے اور پیغمبروں کو مبعوث فرمانے کی کوئی ضرورت نہی تھی، بس ایک ہی حکم کافی تھا، کہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عقل سے احکام وضع کر لیا کر دو، لہذا جو شخص قرآن و سنت کے صریح اور واضح احکام سننے کے بعد بھی ”زمانے کی تبدیلی“ کا عند پیش کرتا ہے، یا زمانے کی تبدیلی کی بنیاد پر قرآن و سنت کے واضح احکام کو من مانے معنی پہنانے اور ان میں ترمیم و تحریف کے لئے تیار رہتا ہے، وہ آسمانی کتابوں کے نزول اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بنیادی مقصد تک سے بے خبر ہے،

۷۔ زمانے کی تبدیلی کا مطلب

پھر یہاں ”زمانے کی تبدیلی“ کا مطلب سمجھ لینا بھی ضروری ہے، زمانے کی جو تبدیلی احکام شرعیہ پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ تبدیلی جس سے حکم کی علت بدل جائے، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گھوڑا کرایہ پر لے اور گھوڑے کے مالک سے یہ طے نہ کرے کہ کتنی دور اس پر سفر کرنا ہے اور اس کی کل اجرت کیا ہوگی، تو یہ اجارہ فاسد اور ناجائز ہے، لیکن آج جبکہ میٹر والی ٹیکسیاں ایجاد ہو چکی ہیں تو یہ حکم باقی نہیں رہا، آج لوگ ٹیکسی میں بیٹھنے سے قبل ڈرائیور سے کوئی معاملہ نہیں کرتے، اور فریقین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں مہوتا کہ سفر کی مجموعی اجرت کیا ہوگی، لیکن اس کے باوجود یہ اجارہ جائز اور درست ہی، وجہ یہ ہو کہ پہلے زمانہ کے فقہاء نے جو مسئلہ بیان کیا تھا اس کی علت خود اپنی کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ اجرت طے نہ ہونے کی صورت میں فریقین کے درمیان جھگڑنے کا قومی امکان تھا، اب اس علت کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے گزشتہ قریبی صفحات میں عنوان ”حکمتوں پر حکم کا مدرا نہیں ہوتا“ ضرور ملاحظہ فرمایا جائے،

زمانہ بدل گیا اور میٹروں کی ایجاد کے بعد عرف عام یہ ہو گیا کہ میٹر جو اجرت بتا دیتا ہے اس پر فریقین متفق ہو جاتے ہیں، اس لئے جھگڑے کا وہ قوی امکان باقی نہیں رہا جو معاملہ کے ناجائز ہونے کی علت تھا، چنانچہ زمانے کی اس تبدیلی سے حکم بھی بدل گیا، اس کے برعکس جہاں حکم کی علت برقرار ہو وہاں محض زمانے کے عام چلن کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسلام میں اس اصول کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کہ زمانے میں جس جس برائی کا رواج پھیلتا جائے اس کو جائز و حلال اور جس جس نیکی کو لوگ چھوڑتے جائیں اُسے غیر ضروری قرار دیتے جاؤ، کیونکہ اس شکست خوردہ ذہنیت کی تان بالآخر اُسی ”خواہش پرستی“ پر جا کر ٹوٹتی ہے جس سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا ہے اور جس کی غلامی سے نجات دینے کے لئے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں،

۸۔ عقل کا صحیح دائرہ کار،

مذکورہ بحث کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ جو احکام قرآن و سنت میں منصوص ہیں اُن کے بارے میں زمانے کے کسی مروجہ نظریہ یا اہل زمانہ کے عام چلن سے مرعوب و متاثر ہو کر عقلی گھوڑے دوڑانا اور قرآن و سنت کو نوڑ مڑ کر ان میں دوڑاز کا رتا و یلات تلاش کرنا یا زمانے کی تبدیلی کا عذر پیش کرنا کسی طرح درست نہیں، کیونکہ قرآن و سنت میں جو احکام منصوص ہیں وہ ایسے ہی ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی سے کوئی حقیقی اثر نہیں پڑتا، خواہ زمانے کے شور و شغب اور خواہشات کی رُوند نے انہیں کتنا ہی اجنبی اور اچنبھا بنا دیا ہو، لہذا ایسے مواقع پر عقلی تاویل یا ”کو احکام شرعیہ میں دخل دینا درحقیقت عقل سلیم کا نہیں بلکہ اُس ”عقل“ کا اتباع ہے جو خواہشات نفس کی غلام ہوتی ہے، اور جس کے بارے میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا نتیجہ بدترین گمراہی اور انسانیت، اخلاق اور شرافت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں،

حقیقت یہ ہے کہ خود ”عقل سلیم“ ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی دماغ کی حدود

کو بچانا جائے، اور اس پر وہ بوجھ نہ ڈالا جائے جس کا وہ تحمل نہیں ہے، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کی صلاحیت کی کچھ حدود ہیں، جن سے آگے وہ کام نہیں جیتی، ”عقل“ بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہے، اور اس کی صلاحیتیں بھی غیر محدود نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی حقائق و احکام کی طرف انسان کی رہنمائی فرمائی ہے، جن کے ادراک میں عقل ٹھوکریں کھاتی تھی، لہذا ان آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی مصراحتوں کے مقابلہ میں عقلی حکمتوں کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق ہوائی جہاز کے انجن کو ریل گاڑی کے اصولوں کے مطابق ٹیسٹ کرنا شروع کرے،

آخر میں یہ بات ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن و سنت پر ایمان لانے کے بعد عقل کا کوئی کام باقی ہی نہیں رہتا، وجہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی میں جن کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے ایسے افعال بہت کم ہیں جنہیں شریعت نے فرض و واجب یا مسنون و مستحب یا حرام و مکروہ قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں ایسے افعال بے شمار ہیں جنہیں ”مباح“ قرار دیا گیا ہے، یہ ”مباحات“ کا دائرہ عقل کی وسیع جولانگاہ ہے، جس میں شریعت کوئی مداخلت نہیں کرتی، ان ”مباحات“ میں سے کسی کو اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا عقل ہی کے سپرد کیا گیا ہے، اس وسیع جولانگاہ میں عقل کو استعمال کر کے انسان مادی ترقی اور سائنٹفک انکشافات کے باوجود تک بھی پہنچ سکتا ہے، اور ان ترقیات و انکشافات کا صحیح فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے، اس کے برعکس احکام الہیہ میں دخل اندازی کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ ترقیات جن کو انسانیت کیلئے باعثِ رحمت ہونا چاہئے تھا، اُن کا نہ صرف صحیح فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہو رہا، بلکہ بسا اوقات وہ انسان کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیار کر گئی ہیں، یہ تمام ترتیب اس بات کا ہے کہ ”عقل“ پر وہ بوجھ لا دیا گیا ہے جو اس کی برداشت سے باہر تھا، اور جس کا تحمل انسان سے وحی الہی کے مکمل اتباع کے بغیر

ہو ہی نہیں سکتا،
 فلسفہ تبارک کے مشہور امام علامہ ابن خلدونؒ نے اس سلسلے میں بڑی نفیس بات
 لکھی ہے، فرماتے ہیں:

فانهم ادراكك ومدراكك في الحصر، واتبع ما امرك الشارع
 من اعتقادك وعملك، فهو حرص على سعادتك، واعلم
 بما ينفعك لانه من طور فوق ادراكك ومن نطاق اوسع
 من نطاق عقلك وليس ذلك بقادر في العقل ومداركه
 بل العقل ميزان صحيح، فاحكامه يقينية لا كذب فيها
 غير انك لا تطمع ان تزن به امور التوحيد والاخرة وحقيقة
 النبوة وحقائق الصفات الالهية وكل ما وراء طوره، فان
 ذلك لم يعم في محال، ومثال ذلك مثال رجل رأى الميزان
 الذي يوزن به الذهب، فيطمع ان يزن به الجبال، هذا
 لا يدرك على ان الميزان في احكامه غير صادق،
 لكن العقل يقف عنده ولا يتعصى طوره،

”لہذا تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں غطا وار سمجھو، (جو کچھ تم
 جانتے ہیں تمام موجودات ان میں منحصر ہیں) اور شارع علیہ السلام کے بتائے
 ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے
 ہی خواہ اور سود و بہبود کو سمجھنے والے ہیں۔ ان کا علم تمہارے علم سے بلند اور وسیع
 ذریعے سے حاصل ہونے والا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے،
 اور یہ بات عقل اور اس کی معلومات کے لئے کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ عقل
 درحقیقت ایک صحیح میزان ہی، جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں

۱۰ معتمد ابن خلدونؒ،

لیکن یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توجید و آخرت کے امور نبوت و صفات اکہیدہ یا کسی اور ایسی چیز کا وزن کرنے لگو جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا تولنے کا کاشا دیکھے اور پھر اس پھاڑوں کو تولنے کی خواہش کرنے لگے ظاہر ہے کہ (جب اس میں پہاڑ نہ مل سکیں تو) یہ نہیں کہا جائے گا کہ ترازو جھوٹی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر میزان کی ایک حد ہوتی ہے، جس سے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے، اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اسی طرح قرآن و سنت نے بہت سی باتیں خود بیان کرنے کے بجائے فقہائے اجتہاد و استنباط پر چھوڑ دی ہیں، چنانچہ جو لوگ اس کام کے اہل ہوں، ان کے لئے قرآن و سنت اور اصول شرعی کی روشنی میں احکام کا استنباط عقل کے استعمال کا دوسرا بڑا میدان ہے، جس میں ہر زمانے کے فقہاء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں، لیکن قرآن و سنت کی صراحتوں کو چھوڑ کر یا اصول شرعیہ کو پامال کر کے محض عقل کی بنیاد پر قرآن و سنت میں توڑ پھوڑ کی کوشش کرنے کے کانٹے سے پہاڑوں کو تولنے کے مرادف ہے، آخر میں اس بحث کو ہم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں :-

”یہ منشاء ہرگز نہیں کہ فکر و استدلال ایک محض عبت اور لغو چیز ہے، یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے، لیکن ہاں کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں کہتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک و صاف، صحیح و صادق اور بلند مرتبہ تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا صغیر بھی خود اندر سے نفرتیں کر رہا ہو، اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر

اپنی عقلی معلومات کو ان کے تالچ بنادے، اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امرا میں
روحانی کے حق میں اکیسہ شفا تصور کر کے سمعاً و طاعت کہتا ہوا بلا حجت و تکرار سر اور
آنکھوں پر رکھے،

والذین عاجزون فی اللہ من بعد ما استجیب لہ حجۃہم
دا حصۃ عنہم و علیہم غضب و لہم عن اب شدید
”اور جو لوگ اللہ کے بارے میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ آدمی اس کی بات
قبول کر چکے تو ان کی حجت باطل ہو، اور اُن پر خدا تعالیٰ کا غضب ہے، اور
اُن کے لئے سخت عذاب ہے“

————— بن بن بن بن بن بن بن بن بن —————

قرُونِ اُولٰی کے بعض مفسرین

ہمارا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل اور مبسوط تاریخ بھی ذکر کی جائے، لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا، اس کے علاوہ اس موضوع پر مستقل کتابیں منظر عام پر آنے لگی ہیں، لہذا علم تفسیر کی مکمل تاریخ کے بجائے اس باب میں ہم صرف قرونِ اُولٰی کے بعض ایسے مفسرین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کے حوالے تفسیر کی کتابوں میں انتہائی کثرت سے آتے ہیں، مقصد یہ ہو کہ تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت مندرجہ ذیل مباحث ذہن میں رہیں تو ان حضرات کے اقوال سے صحیح نتیجے تک پہنچنے میں انشاء اللہ آسانی ہوگی،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ یوں تو صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت علم تفسیر کی خدمت کے لئے معروض ہے، لیکن ان حضرات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بطور خاص ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے حق میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم تفسیر کی مہارت کی دعا فرمائی تھی، متعدد روایات میں وارد ہے کہ آپؐ نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیر کر یہ دعا فرمائی کہ :

اللہم فقهہ فی الدین وعلمہ التاویل

یا اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انھیں تفسیرِ قرآن کا

علم عطا فرما،

لہ مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ القرآن و تاریخ التفسیر مؤلفہ پروفیسر عبدالصمد صائم صاحب،

اور ایک مرتبہ یہ دُعا فرمائی کہ:-

اللهم بارک فیہ ونشر منہ

یا اللہ! ان کو برکت عطا فرما اور ان کے ذریعہ

علم دین کو عام فرما

اور بعض روایات میں ہو کہ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

نعم ترجمان القرآن انت

”تم قرآن کریم کے اچھے ترجمان ہو“

چنانچہ ان کو صحابہ کرامؓ ”ترجمانِ قرآن“ اور ”البحر“ (زبردست عالم) اور ”البحر“ (دریائے علم) کے القاب سے یاد کرتے تھے، چنانچہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان کی کم ہنی کے باوجود تفسیری معاملات میں ان کی طرٹ رجوع کرتے اور ان کے قول کو خاص وزن دیتے تھے،

خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے انصار کے صاحب سے کہا کہ ابھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ باقی ہیں، آؤ ہم ان سے (علم کی باتیں) معلوم کیا کریں، اُن صاحب نے کہا: ”کیا آپ کا خیال ہے کہ کسی وقت لوگ علم کے معاملہ میں آپ کے محتاج ہوں گے؟ (جو اُس وقت کی تیاری ابھی سے کرنا چاہتے ہیں)۔“ چنانچہ انھوں نے میری تجویز منظور نہ کی، اور میں نے تنہا یہ کام شروع کر دیا، کہ صحابہؓ کے پاس جاتا اور ان سے علم کی باتیں معلوم کرتا رہا، اگر مجھے کسی شخص کے حوالہ سے کوئی حدیث پہنچتی تو میں اُس کے دروازے پر پہنچ جاتا، معلوم ہوتا کہ وہ دوپہر کے وقت آ، ام میں ہیں تو میں اپنی چادر کو ٹیکہ بنا کر وہیں دروازہ

۱۔ الاصابہ، للحافظ ابن حجر، ص ۲۲۳ ج ۲،

۲۔ الاتقان، ص ۱۸۷ ج ۲ بحوالہ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم،

۳۔ ایضاً بحوالہ مذکور،

پر بیٹھ رہتا، بڑے جھگڑے میرے چہرے پر مٹی لالاکر ڈالتے رہتے، جب وہ صاحبِ باہرکل کو مجھے دیکھتے تو کہتے: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چا زاد بھائی! آپ کیوں تشریف لاتے؟ میرے پاس پیغام بھیج دیا ہوتا، میں آپ کے پاس چلا آتا“ میں جواب میں کہتا: ”ہمیں! یہ میرا فرض تھا کہ آپ کے پاس آؤں“ چنانچہ میں اُن سے اس حدیث کے بارے میں پوچھتا (یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا) وہ انصاری بزرگ (حنبلوں نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا) بعد میں کافی دن تک زندہ رہے، یہاں تک کہ انھوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ لوگ میرے ارد گرد جمع ہیں، اور مجھ سے سوالات کر رہے ہیں اس وقت انھوں نے کہا کہ ”یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا!“

عبید اللہ بن علی بن ابی رافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ، ابو رافعؓ کے پاس آتے اور ان سے پوچھتے کہ فلاں دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا؟ اور ابن عباسؓ نے پاس ایک آدمی اور ہوتا جو (ابو رافعؓ کا جواب) لکھ لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ہر وقت طلبہ علم کا جھگڑا لگا رہتا تھا، اور آپ اُن کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر، احادیثِ نبویہ اور فقہی مسائل وغیرہ بیان فرماتے رہتے۔ تھے۔

ابنہی وجوہ کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو امامِ مفسرینؒ کہا جاتا ہے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں سب سے زیادہ روایات ابنہی سے مروی ہیں، البتہ اُن سے جو روایات مروی ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ضعیف بھی ہے، لہذا اُن کی روایات سے استفادہ کے لئے انھیں اسوٰلِ حدیث کی شرائط پر جانچنا

۱۔ الاصابہ، ص ۳۲۳ ج ۲، بحوالہ مسند دارمی و مسند حارث بن ابی اسامہ، مزید ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ص ۳۸ ج ۱ طبع دکن، ۲۔ ایضاً بحوالہ مسند روایانی، ۳۔ ملاحظہ ہو الاصابہ، ص ۳۲۵ ج ۲ والاستیعاب علی ہامش الاصابہ ص ۳۴۷ ج ۲،

مزدوری ہے، اس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنے کی ہیں :-

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں سب سے زیادہ قوی اور قابل اعتماد وہ روایات ہیں جو ”ابوصالح عن معاذ بن جبل عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ“ کے طریق سے مروی ہیں، امام احمدؒ کے زمانہ میں مصر میں حضرت ابن عباسؓ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ اسی سند کے ساتھ موجود تھا، امام احمدؒ اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کا قصد کرے کہ صرف اس سفر کے لیے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی، یہ نسخہ تو بعد میں نایاب ہو گیا، لیکن بہت سے محدثین اور مفسرین نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی بہت سی روایات تعلیقاً ہی ہیں، نیز حافظ ابن جریرؒ ابن ابی حاتمؒ اور ابن المنذرؒ نے متعدد واسطوں سے بہت سی روایات اسی طریق سے نقل فرمائی ہیں۔

یہاں ایک مغالطہ کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا، مشہور گولڈزبرہر کا ایک مغالطہ | مستشرق گولڈزبرہر (Goldziher) نے اپنی کتاب ”مذاهب التفسیر الاسلامی“ میں حسب عادت یہ مغالطہ انگیزی کی ہے کہ :-

”خود مسلمان ناقدین حدیث اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے وہ تفسیری اقوال خود نہیں سنے جو انھوں نے اس کتاب میں نقل کئے ہیں، خود اسلامی نقد حدیث کا یہ فیصلہ ابن عباسؓ کی تفاسیر کے اُس مجموعہ کے بارے میں ہے جو سب سے زیادہ قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔“

لیکن گولڈزبرہر نے یہ ذکر نہیں کیا کہ نقد حدیث کے ماہر علماء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ علی بن ابی طلحہؓ نے یہ تفسیری اقوال حضرت ابن عباسؓ سے نہیں سنے، وہاں انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ روایات علی بن ابی طلحہؓ نے کچھ مجاہدؒ سے لی ہیں

لہ الاتقان، ص ۸۸ ج ۲ نوع نمبر ۸

لہ مذہب التفسیر الاسلامی از گولڈزبرہر ترجمہ عربی، ڈاکٹر عبدالحلیم البخاری، ص ۹۸،

اور کچھ سعید بن جبیر سے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :-
 بعد ان عرفت الواسطة وهي ثقة فلا ضير في ذلك
 ”جب بیچ کا واسطہ معلوم ہو گیا، اور وہ ثقہ ہے، تو اب کوئی حرج
 باقی نہیں رہا“

علی بن ابی طلحہؒ کے اس طریق کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کی روایات کے اور بھی متعدد صحیح
 یا حسن طریق ہیں مثلاً ابو ثور عن ابن جریر عن ابن عباسؓ یا حجاج بن محمد عن
 ابن جریر عن ابن عباسؓ یا قیس بن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر
 عن ابن عباسؓ یا ابن اسحاق عن محمد بن ابی محمد عن عکرمہ او
 سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ وغیرہ (الاتقان)

(۳) حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات مندرجہ ذیل اسانید سے آئی ہیں وہ ضعیف ہیں۔
 (الف) محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ
 اور جب کلبی سے محمد بن مروان السدسی الصغیر روایت کریں تو
 اس سند کو محدثین سلسلۃ الکذب قرار دیتے ہیں، مفسرین میں سے تعلبی اور
 واحدی نے اس سلسلے سے بکثرت روایات نقل کی ہیں،

(ب) ضحاک بن مزاحم عن ابن عباسؓ، یہ طریق اس لئے ضعیف
 ہے کہ ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں، اور اگر ضحاک
 سے روایت کرنے والے بش بن عمارہ عن ابی روق ہوں تو یہ سلسلہ
 اور ضعیف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بشر بن عمارہ ضعیف ہیں اور اگر ضحاک
 سے روایت کرنے والے جوہر ہوں تو اس کا ضعف اور زیادہ ہو جاتا ہے،
 کیونکہ جوہر نہایت ضعیف ہیں،

(ج) عطیۃ العوفی عن ابن عباسؓ، یہ طریق بھی عطیۃ العوفی کے ضعف

کی بنا پر ضعیف ہی البتہ بعض حضرات اُسے حسن کہتے ہیں، کیونکہ امام ترمذیؒ نے عطیہ کی روایات کی تحسین کی ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث عطیہ العونی کے تذکرہ میں آرہی ہے،

(د) مقاتل بن سلیمان عن ابن عباسؓ، یہ طریق بھی مقاتل بن سلیمانؓ کے ضعف کی بنا پر مجرد ہے، مقاتل کا پورا حال بھی آگے آرہا ہے،

مروجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حیثیت (۴) ہمارے زمانے میں ایک کتاب.....
 ”تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ“ کے نام سے شائع ہوئی ہے جسے آجکل عموماً ”تفسیر ابن عباسؓ“ کہا اور سمجھا جاتا ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں کیونکہ یہ کتاب محمد بن مروان السدسی عن محمد بن المسائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ اس سے کو محدثین نے ”سلسلۃ الکذب“ (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے، لہذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

حضرت علیؓ تفسیر قرآن کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام انتہائی بلند ہے، پہلے تین خلفاء کی وفات چونکہ جلدی ہو گئی تھی اس لئے اُن سے تفسیری روایات بہت کم مروی ہیں، اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ دراز تک افادۂ علم میں مشغول رہے، اس لئے ان سے بہت سی روایات منقول ہیں، علم تفسیر میں اُن کے مقام بلند کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابو الطفیلؓ کہتے ہیں:-
 ”میں نے حضرت علیؓ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، وہ فرما رہے تھے کہ.....
 مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوالات کیا کرو، کیونکہ خدا کی قسم! قرآن کریم

۱۔ یہ پوری بحث الاتفاق ص ۸۸ و ۸۹ ج ۲ نور نمبر ۸۰ سے ماخوذ ہے، مزید تفصیل کے لئے ان راویوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیے جو آگے آرہا ہے، ۲۔ دیکھئے تنویر المقیاس صفحہ اول،

کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل

ہوئی یا دن کو، میدان میں اُتری یا پہاڑ پر؟

حضرت علیؓ نے چونکہ آخر میں کوفہ کو اپنا مستقر بنالیا تھا، اس لئے آپ کا علم زیادہ تر اسی علاقے میں پھیلا، اور آپ کی بیشتر روایات اہل کوفہ سے مروی ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن سے قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر منقول ہیں، بلکہ اُن کی مرویات حضرت علیؓ سے بھی زیادہ ہیں، حافظ ابن جریرؒ وغیرہ نے

اُن کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:-

والذی لا الہ غیرہ ما نزلت الیہ من کتاب اللہ الا وانا

اعلم فیمن نزلت واین نزلت، ولو اعلم مکان احد اعلم

بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا لا یتہ

”قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کہ کتاب اللہ کی جو آیت

بھی نازل ہوئی ہے، اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے

بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا

پتہ معلوم ہو جائے جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہو تو میں اُس کے

پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ اس کی جگہ تک اونٹنیاں جاسکتی ہوں۔“

مشہور تابعی حضرت مسروق بن الابدعؒ فرماتے ہیں کہ:-

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمارے سلمے ایک سورت پڑھتے، اور د

کا بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بارے میں احادیث بیان کرنے

میں صرف فرمادیتے تھے

۱۔ الاتقان، ص ۸۷، ج ۲، نوع نمبر ۸۰، ۲۔ ایضاً،

۳۔ تفسیر ابن جریرؒ، ص ۲۷، ج ۱،

اور حضرت مسروقؒ ہی کا قول ہو کہ میں نے بہت سے صحابہ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہؓ کے علوم چھ آدمیوں میں جمع تھے :-
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین، پھر میں نے غور کیا تو ان چھ حضرات کے علوم دو حضرات کے درمیان منحصر پائے، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔

حضرت ابی بن کعبؓ حضرت ابی بن کعبؓ بھی ان صحابہ میں سے ہیں جو تفسیر اور قرآن کے علم میں معروف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا:

اقروہم ابی بن کعبؓ

”صحابہ میں سب سے بڑی قاری ابی بن کعبؓ ہیں“

آپ کی جلالت، قدر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے امام المفسرین نے آپ سے استفادہ کیا ہے، حضرت معمرؓ فرماتے ہیں:-
عامۃ علما بن عباس من ثلثة: عمرؓ و
علیؓ و ابی بن کعبؓ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیشتر علوم تین حضرات سے
ماخوذ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ پہلے مفسر ہیں، جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتب ہوئی، ان کی تفسیر کا ایک بڑا نسخہ تھا، جس کو ابو جعفر رازیؒ نے ربیع بن انس عن ابی العالیہ روایت کرتے تھے، امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ، امام

۱۔ مقدمۃ نصب الرایۃ، للکوثریؒ، ص ۳۰ ج ۱

۲۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ، ص ۳۸ ج ۱

احمد بن حنبلؒ اور امام حاکمؒ نے اس روایات لی ہیں، امام حاکمؒ کی وفات ۴۰۵ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسخہ پانچویں صدی تک موجود تھا، مذکورہ حضرات کے علاوہ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیر قرآن کے سلسلے میں روایات منقول ہیں،

صحابہؓ کے بعد

صحابہ کرامؓ نے مختلف مقامات پر قرآن کریم کے درس کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا اُن کی تعلیم و تربیت سے تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی، جس نے علم تفسیر کو محفوظ رکھنے کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں سے اُن چند حضرات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے، جن کا حوالہ کتب تفسیر میں بہ کثرت آتا ہے،

(۱) حضرت مجاہدؒ | ان کا پورا نام ابو النجّاج مجاہد بن جبر الخزومیؒ ہے، ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۵ھ، یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں، جن سے انھوں نے تیس مرتبہ قرآن کریم کا دور کیا ہے، اور تین مرتبہ تفسیر پڑھی ہے، قتادہؒ اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ

اعلم من بقى بالتفسير مجاهد
 "تفسیر کے جو علماء باقی ہیں اُن میں مجاہدؒ سب سے بڑے عالم ہیں"

۱۔ الاتقان، ص ۱۸۹ ج ۲

۲۔ ان کے والد کا صحیح نام جبر (بر وزن نصر) ہے، اور بعض حضرات جبر (بر وزن لبر) بھی کہتے ہیں، (تہذیب اللسان واللغات للنووی ص ۸۳ ج ۲)

۳۔ تہذیب التہذیب، ص ۴۳ ج ۱۰

اور خصیف کا قول ہے :-

اعلمہم بالتفسیر مجاہدؒ

”مجاہد تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں“

کہا جاتا ہے کہ ان کی تفسیر کا ایک مجموعہ مقرر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے،
حضرت مجاہدؒ اگرچہ تابعین میں سے ہیں، لیکن صحابہ کرامؓ بھی ان کی تدریس
کرتے تھے، حضرت مجاہدؒ خود فرماتے ہیں :-

صحبت ابن عمر وانی اری ان اخذ منہ فکان ھو
یخد منیؒ

”میں حضرت ابن عمرؓ کی صحبت میں رہا، اور میں ان کی خدمت
کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میری خدمت کرتے تھے“

چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ ان کی رکاب پکڑ کر فرمایا :-

”کاش کہ میرا بیٹا سالم اور میرا غلام نافع حافظہ میں

تم جیسے ہو جائیں“

حضرت مجاہدؒ کی وفات ۳۸ھ میں سجدہ کی حالت میں ہوئی، (البدایۃ والنہایۃ

لابن کثیرؒ، ص ۲۲۴ ج ۹)

(۲) حضرت سعید بن جبیرؒ | مشہور تابعی ہیں، اور انھوں نے حضرت عبداللہؒ

بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت انسؓ،

حضرت عبداللہ بن مخفلؓ، حضرت ابوسعود البدریؓ جیسے صحابہ سے استفادہ کیا ہےؒ

۱۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص ۸۶ ج ۱ ترجمہ ۸۳،

۲۔ تاریخ التفسیر از عبدالصمد صآرم، ص ۸، مطبوعہ دہلی ۱۳۵۵ھ،

۳۔ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم، ص ۲۸۵ و ۲۸۶ ج ۳،

۴۔ تہذیب الاسماء واللغات للنوویؒ ص ۲۱۶ ج ۱

عبادت اور زہد میں معروف ہیں، رات کو نماز میں کثرت سے رونے کی بنا پر انکی بیانی میں نقص آگیا تھا، حجاج بن یوسف سلاطین میں شہید کیا، اس کا واقعہ معروف ہے، انھوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر ایک تفسیر لکھی تھی، خلیفہ نے اس کو شاہی خزانہ میں محفوظ کر دیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی ۳۱۲ھ) کے ہاتھ آگئی، چنانچہ وہ اس نسخہ کی بنا پر اس تفسیر کی روایات کو حضرت سعید بن جبیر سے مرسل روایت کیا کرتے تھے، لہذا عطاء بن دینار سے حضرت سعید بن جبیر کی جو روایات منقول ہیں وہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق ”وجاہہ“ ہیں، اور زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں،

حضرت سعید بن جبیر کی بہت سی روایات مرسل ہیں، (یعنی ان میں صحابی کا واسطہ محذوف ہے) لیکن ان کی مراسیل قابل اعتماد ہیں، حضرت یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ:-

”سعید بن جبیرؒ کی مراسلات مجھے عطاءؒ اور مجاہدؒ کی مراسیل سے زیادہ پسند ہیں“

(۳) حضرت عکرمہؒ | یہ عکرمہ مونی ابن عباسؓ کے نام سے مشہور ہیں، یہ بربری غلام تھے حصین بن ابی الحزاعہ نے انھیں بطور ہدیہ حضرت ابن عباسؓ کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو انتہائی محنت سے تعلیم دی، اور انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عقیب بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت معاویہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی روایات نقل کی ہیں،

۱۵ حلیۃ الاولیاء، ص ۲۷۲ ج ۴ ترجمہ ۲۵۵

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۱۶۸ و ۱۶۹ ج ۴، ترجمہ عطاء بن دینار،

۱۷ ایضاً، ص ۱۳ ج ۴ ترجمہ سعید بن جبیرؒ،

۱۸ تہذیب التہذیب ص ۲۶۳ ج ۴،

عکرمہؒ خود فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گزارے ہیں، چنانچہ انھوں نے مصر، شام، عراق، اور افریقہ تک کے سفر کئے ہیں، امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ: ”ہمارے زمانے میں کتاب اللہ کا کوئی عالم عکرمہؒ سے بڑا باقی نہیں رہا“ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ”تابعین میں چار آدمی سب سے زیادہ عالم تھے، عطاء، سعید بن جبیر، عکرمہؒ اور حسن بصریؒ“

عکرمہؒ پر اعتراضات کی حقیقت | بعض محدثین نے عکرمہؒ پر کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں، مشہور مستشرق گولڈزیہر نے اپنی اعتراضات کو بھیا نک بنا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے یہ مشہور شاگرد بھی تفسیری روایات کے مقابلے میں ناقابل اعتماد ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ محقق علماء نے ان اعتراضات کو پوری تحقیق و تفتیش کے بعد رد کیا ہے، اس مسئلہ پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ فتح الباری میں نہایت مبسوط اور کافی روشنی بحث کی ہے، انھوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ متعدد دائمہ حدیث نے عکرمہؒ کے حالات کی تحقیق پر ادرآن پر تائد کئے جانے والے اعتراضات کی تفتیش کے لئے مستقبل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں حافظ ابن جریر طبریؒ، امام محمد بن نصر مروزیؒ، ابو عبد اللہ بن مندہؒ، ابو حاتم بن حبانؒ، اور ابو عمر بن عبد البرؒ جیسے حضرات شامل ہیں، اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے بتایا ہے کہ عکرمہؒ پر جو اعتراضات وارد ہو چکے ہیں

۱۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص ۹۰ ج ۱

۲۔ البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ص ۲۴۵ ج ۹

۳۔ تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ ج ۲، و مفتاح السعاده، ص ۴۱۰ ج ۱

۴۔ تہذیب التہذیب، حوالہ بالا،

۵۔ دیکھئے مذاہب التفسیر الاسلامی از گولڈزیہر ترجمہ عربی ڈاکٹر عبد الحلیم النجار، ص ۹۵،

۶۔ ہدی الساری (مقدمہ فتح الباری) للماظ ابن حجرؒ، ص ۱۹۲ ج ۲، فصل ۹، حرف العین،

اُن کا دار و مدار تین اعتراضات پر ہے، ایک یہ کہ انھوں بعض غلط باتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر دی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ عقیدۂ خارجی تھے، اور تیسرے یہ کہ وہ امراء و حکام سے انعامات وصول کر لیتے تھے،

جہاں تک اس تیسرے الزام کا تعلق ہے کہ انھوں نے امراء سے انعامات وصول کئے ہیں، سبوتاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بناء پر اُن کی روایات کو رد کر دیا جائے، رہے باقی دو اعتراضات، سو حافظ ابن حجرؒ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اُن میں سے کوئی الزام اُن پر ثابت نہیں ہوا، اس سلسلے میں جتنے قصے اُن کی طرف منسوب ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے ان میں سے ایک ایک کو نقل کر کے اس کی مدلل تردید یا توجیہ کی ہے، مثلاً اُن پر جھوٹ کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا منشاء ایک غلط فہمی ہے، اور وہ یہ کہ بسا اوقات انھوں نے ایک حدیث دو آدمیوں سے سنی ہوتی تھی، ایک موقع پر وہ ایک شخص سے روایت کرتے، پھر کوئی اُسی حدیث کے بارے میں پوچھتا تو دوسرے آدمی سے روایت کر دیتے، اس سے بعض لوگ یہ سمجھ گئے کہ یہ حدیث گھڑنے ہیں، حالانکہ دونوں مرتبہ اُن کی روایت درست تھی، چنانچہ خود انھوں نے فرمایا ہے کہ :-

أُرایت هؤلاء الذين يكذبون من خلفي، أفلا

يكذبون في وجهي؟

”بھلا یہ لوگ جو میرے پیچھے میری تکذیب کرتے ہیں میرے سامنے

کیوں تکذیب نہیں کرتے؟“

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ میرے سامنے تکذیب کریں تو میں اُن کو حقیقتِ حال سے

آگاہ کر دوں،

اسی طرح اُن پر خارجی ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہوا، البتہ ہوا یہ ہے کہ انھوں نے بعض جزوی (فقہی) مسائل میں ایسا مسلک اختیار کیا تھا جو خارجیوں کے مطابق

تھا، اس سے بعض لوگوں نے انھیں خارجیت کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ امام عجلؑ فرماتے ہیں:

عكرمة مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما مکی تابعی
ثقة بريعی ہمایر میہ بہ الناس بہ من الحرورية،
”عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ ہیں، مکہ کے رہنے والے ہیں، ثقہ
تابعی ہیں، اور لوگ اُن پر خارجیت کا جو الزام لگاتے ہیں اس سب سے بری ہیں“
اور حافظ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

اگر وہ شخص جس کی طرف غلط مذہب منسوب کر دیا گیا ہو اس نسبت
کی وجہ سے ساقط العدالت قرار دیا جانے لگے تو اکثر محدثین کو چھوڑنا پڑے گا
کیونکہ اُن میں سے تقریباً ہر ایک کی طرف ایسی باتیں منسوب ہیں جنہیں وہ
پسند نہیں کرتے“ لہ

یہی وجہ ہو کہ تقریباً تمام ائمہ حدیث نے اُن سے روایات لی ہیں، امام بخاریؒ
جو نقد رجال کے معاملے میں بہت سخت ہیں، اور جنہوں نے مشتبہ راویوں تک کو چھوڑ دیا
ہے انہوں نے بھی اپنی صحیح میں اُن کی روایات نقل کی ہیں، امام مسلمؒ کی طرف منسوب ہو
کہ وہ عکرمہؒ پر طعن کرتے تھے، لیکن انہوں نے بھی اپنی صحیح میں عکرمہؒ کی روایت مرقوفاً
ذکر کی ہے، امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ عکرمہؒ کو ناپسند کرتے تھے،
لیکن خود انہوں نے موطا کی کتاب الحج میں عکرمہؒ کی روایت نقل کی ہے، امام محمد
ابن سیرینؒ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ اُن پر طعن کرتے تھے، لیکن خالد الحذادیؒ سے
مردی ہے کہ:

لہ یہ تمام اقوال حافظ ابن حجرؒ نے نقل فرمائے ہیں، تفصیل کے ملاحظہ ہو ہدی الساری،

ص ۱۹۲ تا ۱۹۶ ج ۲ فصل نمبر ۹،

لہ التاريخ الكبير للبخاري، ص ۴۹ ج ۴ ترجمہ نمبر ۲۱۸،

”ہر وہ حدیث جس کے بارے میں محمد بن سیرینؒ یہ کہیں کہ ثبت عن
ابن عباسؓ، یعنی ابن عباسؓ سے یہ بات ثابت ہو وہ انھوں نے
عکرمہؒ سے سُنی ہوتی ہے، نام وہ اس لئے نہیں لیتے کہ وہ انھیں
ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے“

غرض تحقیقی بات یہی ہے کہ عکرمہؒ کی روایات قابل قبول ہیں، اور اکثر ائمہ حدیث نے
اُن کی روایات بے خوف و خطر ذکر کی ہیں،

گولڈزبرہ کا ایک مغالطہ | آخر میں گولڈزبرہ کے ایک اور ضمنی مغالطہ کی نشاندہی
مناسب ہوگی، اس نے یہ قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت
عکرمہؒ کی وفات ہوئی تو اُن کے جنازے میں شریک ہونے والے اتنے بھی نہیں تھے
کہ اُن کا جنازہ اٹھانے کے لئے کافی ہوں، دوسری طرف اسی روز مشہور شاعر
کثیر عروتہؒ کا انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں قریشیوں کا ایک بڑا مجمع شریک تھا،
اس سے گولڈزبرہ نے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اُس زمانے میں عام مسلمانوں کے دل میں
ایک عوامی شاعر کا احترام حاملین سنت کے مقابلے میں زیادہ تھا، اور دوسرے یہ کہ شریک
جنازہ کی اس کمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ ایک نسلی غلام کو مرنے کے بعد بھی ایک اسیل
عرب کے مقابلے میں حقیر سمجھتے تھے،

لیکن گولڈزبرہ کی یہ خیال آفرینی اسی بغض و عناد پر مبنی ہے جو ہر غیر تحقیقی بات کو
قبول کر کے اس پر بے بنیاد خیالات کے محل تعمیر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی،
واقعہ یہ ہے کہ اول تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے کہ کثیر کے جنازے میں بڑا مجمع شریک
ہوا اور حضرت عکرمہؒ کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:-
”والذی نقل انھم شہد ولجنازة کثیر وترکوا عکرمہ“

۱۔ البدایۃ والنہایۃ ص ۲۳۵ ج ۹ وھدی الساری، ص ۱۹۴ ج ۲،

۲۔ مذاہب التفسیر الاسلامی، از گولڈزبرہ، ص ۹۵ و ۹۶،

لم یثبت، لأن ناقله لم یسم^۱۔
 آدر یہ جو منقول ہے کہ لوگ کثیر کے جنازے میں تو شریک ہوئے لیکن
 عکرمہ کو چھوڑ دیا، یہ بات ثابت نہیں، اس لئے کہ یہ قصہ ایک جمہول
 شخص نے بیان کیا ہے،

اور اگر بالفرض عکرمہ کے جنازے میں واقعہ لوگ کم شریک ہوئے ہوں تب بھی
 جن حالات میں عکرمہ کی وفات ہوئی ہے اُن کے پیش نظریہ کچھ بعید نہیں، کیونکہ تمام
 تواریخ میں تصریح ہے کہ ایک عرصہ سے حکومت نے اُن کے خلاف گرفتاری کے احکام
 جاری کئے ہوئے تھے، جن کی بناء پر وہ ردپوش ہو گئے تھے، اور اسی ردپوشی کی حالت
 میں ان کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو ان کی وفات کا پورا علم
 نہ ہو سکا ہوگا، اس لئے اُن کے جنازے میں شرکت زیادہ نہ ہو سکی، اس سے یہ نتیجہ
 کون عقلمند نکال سکتا ہے کہ لوگوں کے دل میں اُن کا احترام ایک شاعر سے بھی کم تھا؟
 بلکہ صحیح تاریخوں میں تو یہ منقول ہے کہ جب لوگوں کو ان کی اور کثیر کی وفات کا علم ہوا
 تو عام لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ تھا کہ :-

مات أفقه الناس وأشعر الناس^۲،

آج سب بڑے فقیہ کا بھی انتقال ہو گیا اور سب سے بڑے

شاعر کا بھی۔

پھر مستشرقین کا یہ انداز تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک چھوٹے سے غیر مستند
 واقعے کی بنیاد پر کس ڈھٹائی کی بنا پر بڑے بڑے عمومی نتائج نکال لیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ
 عوام کے دلوں میں ”حالیین سنت“ کا احترام جانچنے کے لئے صرف ایک حضرت عکرمہ
 کا جنازہ ہی رہ گیا تھا؟ ان کے علاوہ جو لاکھوں ”حالیین سنت“ گزرے ہیں اُن کی زندگی

۱۔ تہذیب التہذیب، ص ۳۴۲ ج ۲،

۲۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۴۵ ج ۲، ۹

اور وفات کے بے شمار واقعات سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی؟ اسی طرح غلام نسل کے علماء کے ساتھ عام لوگوں کا سلوک معلوم کرنے کے لئے بھی ایک ہی قصہ ان کو تاریخ میں مل سکا ہے؟ حضرت عکرمہؓ کے علاوہ جو ہزار با غلام علم حاصل کرنے کے بعد شہرت و عزت کے بام عروج تک پہنچے ہیں، اور خود حضرت عکرمہؓ کو اپنی زندگی میں جو عزت و احترام نصیب ہوا اُن ... واقعات سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ملتی؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی علی کتاب میں مستشرقین کے اس قسم کے بے سرو پا الزامات کا ذکر کرتے ہوئے بھی جی ملتا ہے، لیکن یہ بات اس لئے ذکر کر دی گئی کہ اُن حضرات کا معیار تحقیق اور انداز فکر و نظر بھی قارئین کے سامنے آجائے جو ”تحقیق“ کے نام پر اپنے بغض و حسد کے جذبات ٹھنڈے کرنے میں مصروف ہیں،

(۴) حضرت طاؤسؓ اُن کا پورا نام ابو عبد الرحمن طاؤس بن کیسان الحمیری البجذی ہے، یہ یمن کے شہر جند کے باشندے تھے، اور یہ بھی غلام تھے، انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت زید بن ارتؓ، اور دوسرے متعدد صحابہؓ سے علم حاصل کیا تھا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت معاذ بن جبلؓ اور خلفائے راشدینؓ سے اُن کی روایات مرسل ہیں، یہ اپنے زمانے میں علم و فضل کے علاوہ عبادت و زہد میں بھی بہت شہور تھے، انھوں نے چالیس حج کئے ہیں، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ”اگر تم طاؤسؓ کو دیکھتے تو یقین کر لیتے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے“، عمرو بن دینارؓ کا قول ہے کہ ”میں نے لوگوں کے مال و دولت کے محلے میں طاؤسؓ سے زیادہ سیر چشم کوئی نہیں دیکھا“،

۱۔ خود حضرت طاؤسؓ کے جنازے کا حال آگے آرہا ہے، نیز آگے جن ”حاطین سنت“ کے حالات آرہے ہیں، اُن میں سے بیشتر غلام تھے،
۲۔ یہاں تک کے تمام اقوال تہذیب التہذیب، ص ۹ و ۱۰ ج ۵ سے ماخوذ ہیں،

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: اُن کی جلالتِ قدر اُن کی فضیلت، وفورِ علم، صلاح و تقویٰ، قوتِ حافظہ، اور احتیاطِ پر علماء کا اتفاق ہے۔^۱ حافظ ابو نعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں اُن کے صلاح و تقویٰ کے واقعات اور ملفوظات تفصیل سے ذکر کئے ہیں، سنیہ میں منیٰ یا مزدلفہ میں اُن کی وفات ہوئی، جنازے میں ارکانِ حکومت سے لے کر علماء و صلحاء تک ہر طبقہ کے افراد شریک تھے، یہاں تک کہ ہجوم کی وجہ سے خلیفہ کو پولیس بھیجی پڑی، حضرت عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالبؒ نے ان کا جنازہ مسلسل اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھا، یہاں تک کہ اُن کی ٹوپی گر گئی اور چادر پھٹ گئی،^۲ ۵۔ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ تابعین کے دور میں عطاء نام کے چار بزرگ بہت مشہور ہیں، عطاء بن ابی رباحؒ، عطاء بن یسارؒ، عطاء بن السائبؒ، اور عطاء بن الخراسانیؒ، ان میں سے پہلے دو باتفاق ثقہ ہیں، اور آخری دو کے بارے میں کچھ کلام ہوا ہے، لیکن دینی علوم کی کتابوں میں صرف عطاء لکھا جاتا ہے تو عموماً عطاء بن ابی رباحؒ ہی مراد ہوتے ہیں، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کا پورا نام ابو محمد عطاء بن ابی رباح المکی القریشی ہے، یہ ابنِ عیینہ القریشی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ولادت ہوئی، اور مکہ میں وفات پائی، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہؓ و تابعینؓ سے علم حاصل کیا، اور خاص طور پر علمِ فقہ میں بہت مشہور ہوئے، کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانے میں مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم تھے، عبادت و زہد میں نہایت معروف تھے، ابنِ جریرؒ کہتے ہیں کہ ”بین سال تک مسجد کا فرش اُن کا بستریا ہی“ محمد بن عبداللہ الدیباجؒ کہتے ہیں کہ ”میں نے کوئی مفتی عطاءؒ سے بہتر نہیں دیکھا،

۱۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۵۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۶۹،

۲۔ حلیۃ الاولیاء، ص ۳ ج ۳ ترجمہ نمبر ۲۲۹،

۳۔ تہذیب الاسماء، ص ۳۳۳ و ۳۳۴ ج ۳ ترجمہ نمبر ۴۰۹،

اُن کی مجلس مسلسل ذکر اللہ سے معمور رہتی تھی، جن کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں تھا، اسی دور اُن سے (فقہی) سوال کیا جاتا تو بہترین جواب دیتے تھے

البتہ حضرت عطاء بن ابی رباحؓ جن صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں اُن سب سے اُن کا سماع ثابت نہیں ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ جن سے وہ بکثرت روایات نقل کرتے ہیں اُن سے بھی اُن کا بلا واسطہ سماع نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت زید بن خالدؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت اُم ہانیؓ، حضرت ام کرزہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت اُسامہؓ، حضرت جابر بن مطعمؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت فضل بن عباسؓ سے بھی انھوں نے بلا واسطہ روایات نہیں سُنیں، لہذا ان تمام حضرات سے اُن کی بلا واسطہ روایتیں مرسل ہیں، اور امام احمدؒ وغیرہ اُن کی مراسیل کو ”اضعاف المراسیل“ (سبک کمزور مراسیل) کہتے ہیں، کیونکہ وہ ہر کس و ناکس سے روایات لے لیتے تھے

(۶) حضرت سعید بن المسیبؓ | آپ کا پورا نام سعید بن المسیبؓ بن حزن لغزشی المخزومی ہے، آپ حضرت ابوہریرہؓ کے داماد تھے، اس لئے حضرت ابوہریرہؓ کی بہت سی روایات آپ ہی سے مروی ہیں، عبادت و زہد کا حال یہ تھا کہ چالیس سال تک کوئی اذان ایسی نہیں ہوئی جو انھوں نے مسجد میں نہ سنی ہو، مسلسل روزے رکھتے تھے، اور عمر میں چالیس مرتبہ حج کیا ہے، کبھی کسی امیر کا کوئی انعام

۱۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۹ ص ۹۲ ۲۔ تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۱
 ۳۔ مسیبؓ میں یا پر زبر اور زیر دونوں پڑھے جاسکتے ہیں، زبر کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں، لیکن مروی ہے کہ حضرت سعیدؓ خود یا پر زبر پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ اہل مدینہ میں عام رواج زیر کے ساتھ پڑھنے کا تھا، (تہذیب الاسماء للنووی، ص ۲۱۹ ج ۱)
 ۴۔ ایضاً ص ۸۷ ج ۲

قبول نہیں کیا، گذر بسریل وغیرہ کی تجارت پر تھی، امام مالکؒ نے ان کا قول روایت کیا ہے کہ ”میں بعض اوقات صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی دن رات سفر کیا کرتا تھا، آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے تیسرے سال ہوئی، اس لئے آپ نے بہت سے صحابہ کرام سے احادیث سنی ہیں، جن حضرات صحابہؓ سے انھوں نے براہ راست احادیث نہیں سنیں ان کو یہ بکثرت بلا واسطہ (مرسل) روایت کرتے ہیں، لیکن ان کی مراسیل بہت ایسے علماء کے نزدیک بھی مقبول ہیں، جو مرسل کو حجت نہیں مانتے، مثلاً امام شافعیؒ مرسل کو قابل استدلال نہیں سمجھتے، لیکن فرماتے ہیں کہ ارسال ابن المسیب عندنا حسن وابن مسیب کی مرسل روایات ہمارے نزدیک حسن ہیں، اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ ہمیشہ ثقہ راویوں ہی سے روایات نقل کرتے تھے، غیر ثقہ راویوں کی روایات بیان نہیں فرماتے تھے۔“

لیکن امام نوویؒ نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے، کہ شافعیہ کے نزدیک ان کی مراسیل علی الاطلاق قابل قبول ہیں، اس کے بجائے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان کی مراسلات کا حکم بھی وہی ہے جو دوسرے کبار تابعین کی مراسلات کا، یعنی اگر کسی مسند روایت سے یا کسی اور مرسل سے یا بعض صحابہ کے اقوال سے یا صحابہ کے بعد اکثر فقہاء کے اقوال سے اس کی تائید ہو جائے تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں، بہر کیف یہ گفتگو امام شافعیؒ کے مسلک پر ہے، حنفیہ کے نزدیک ان کی مراسیل علی الاطلاق قابل اعتماد ہیں، آپ کی سن وفات کے بارے میں سلسلہ سے لیکر شافعی تک مختلف اقوال ہیں،

(۷) محمد بن سیرین | آپ کا پورا نام ابو بکر محمد بن سیرینؒ ہے، آپ کے والد سیرین

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۵۱ و ۵۲ ج ۱،

۲۔ تہذیب التہذیب، ص ۸۵ تا ۸۷ ج ۴،

۳۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۲۱ ج ۱ و مقدمۃ المجموع شرح المہذب ص ۱۰۰ ج ۱ مطبعۃ القاہرہ

حضرت انسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ صفیہؓ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ کنیز تھیں، جب یہ حضرت ابوبکرؓ کی ملکیت میں آئیں تو تین ازواجِ مطہراتؓ نے اُن کو خوشبو لگائی، اور اس تقریب میں اٹھارہ بدری صحابہؓ شریک ہوئے، جن میں حضرت اُبی بن کعبؓ بھی شریک تھے، جنہوں نے دعا کرائی اور باقی صحابہؓ نے آمین کہی، حضرت سیرینؓ کی اولاد میں چھ افراد محمد، معبد، انس، یحییٰ، حفصہ اور کریمہ معروف ہیں، اور چچہ کے چچہ حدیث کے ثقہ راوی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر صاحبزادے حضرت محمد بن سیرینؓ ہیں، جن کے عجیب و غریب حالات مستنقل تصنیف چاہتے ہیں، آپ کا ورع و تقویٰ ضرب المثل ہے، حضرت ہشام بن حسانؓ کہتے ہیں کہ ”ہم ابن سیرینؓ کے گھر میں مقیم رہے تو ہم دن کے وقت ان کے ہنسنے کی آوازیں سنتے تھے (کیونکہ آپ شگفتہ مزاج اور ظریف بزرگ تھے) اور رات کے وقت اُن کے رونے کی“ ورع و تقویٰ ہی کی بنا پر آپ قید بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، اسی گرفتاری کے دوران قید خانے کے دربان نے اُن کو پیش کش کی، کہ آپ روزانہ رات کو اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو واپس آجایا کریں! لیکن انہوں نے جواب دیا: نہیں! خدا کی قسم، میں سلطان کی خیانت پر تمہاری اعانت نہیں کروں گا!

اسی گرفتاری کے دوران مشہور صحابی اور ان کے والد کے آقا حضرت انسؓ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے وصیت کی تھی کہ محمد بن سیرینؓ مجھے غسل دیں، لوگ اُن کے پاس آئے اور اس وصیت کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ”میں قید میں ہوں“ لوگوں نے کہا کہ: ہم نے امیر سے اجازت لے لی ہے، حضرت محمد بن سیرینؓ نے جواب دیا کہ ”مجھے قید کرنے والا امیر نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس کا حق مجھ پر واجب ہے“ چنانچہ لوگوں نے اس شخص سے اجازت لی، تب انہوں نے جا کر حضرت انسؓ کو غسل دیا،

۱۔ یہاں تک کے تمام حالات تہذیب الاسماء واللغات ص ۸۳ و ۸۴ ج ۱ سے ماخوذ ہیں،

۲۔ حلیۃ الاولیاء لابن نعیم ص ۲۶۷ ج ۲،

بہر حال! حضرت محمد بن سیرینؒ مسلم طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ کے امام ہیں، صحابہؓ میں سے حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے ان کا سماع ثابت ہے، جن صحابہؓ سے ان کا سماع نہیں ہے ان سے بھی یہ بلاد اسطہ (مرسلہ) روایت کرتے ہیں، لیکن انکی مراسیل بہت سے وہ حضرات بھی قبول کرتے ہیں جو مرسل کو حجت نہیں مانتے مثلاً علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ومحمد بن سيرين من اوسع الناس في منطقه

مراسيلة من اصح المراسيل

محمد بن سیرینؒ اپنی گفتگو میں محتاط ترین انسان ہیں اور ان کی

مراسیل صحیح ترین مراسیل میں سے ہیں۔

آپ کی وفات بصرہ میں ۹ شوال ۱۸۸ھ کو ہوئی،

(۸) حضرت زید بن اسلمؓ | ان کا پورا نام ابو عبداللہ زید بن اسلم انعمی (متوفی ۱۱۲ھ) ہے، یہ مدینہ طیبہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، انھوں نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہ سے روایات نقل کی ہیں، یہ علم تفسیر کے بڑے عالم تھے، اور باتفاق ثقہ ہیں، مسجد نبویؐ میں ان کا حلقہ درس ہوتا تھا، اور ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے عبدالرحمنؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد کبھی مجھے اپنے کسی شاگرد کے پاس بھیجتے تو وہ میرے سر کو بوسہ دے کر فرماتے: ”خدا کی قسم! تمھارے والد ہمیں اپنے اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہیں، اور اگر ہمیں یہ خبر دی جائے کہ یا ہمارے اہل و عیال کو موت آئے گی یا زید بن اسلمؓ کو اور ہمیں یہ اختیار ملے کہ جس کی موت کچھاپیں خستیار کر لیں تو ہماری خواہش یہ ہوگی کہ زید بن اسلمؓ زندہ رہیں“

۱۵ منہاج السنہ ص ۸۶ ج ۳، ۱۶ تہذیب التہذیب ص ۲۱۶ ج ۹،

۱۷ تہذیب التہذیب مع حاشیہ ص ۳۹۵ و ۳۹۶ ج ۳،

حضرت ابو حازمؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت زید بن اسلمؓ کی مجلس میں چالیس فقہاء کی
کے ساتھ رہتے تھے، ہم سب کی ادنیٰ خلعت یہ تھی کہ اپنی املاک سے ایک دوسرے کی
غجواری کرتے تھے اور اس مجلس میں مجھ کو بھی دو آدمی بھی ایسے نظر نہیں آئے جو کسی بے فائدہ
گفتگو پر بحث یا جھگڑا کر رہے ہوں،

حضرت زید بن اسلمؓ کو عموماً ثقہ قرار دیا گیا ہے، البتہ عبید اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:
”مجھے ان میں کسی خرابی کا علم نہیں، البتہ وہ قرآن کریم کی تفسیر بکثرت اپنی رائے سے
کرتے ہیں، اور سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے کہ: ”زید بن اسلمؓ صالح آدمی تھے، لیکن
ان کے حافظہ میں کچھ نقص تھا“ (تہذیب التہذیب) ان دو حضرات کے علاوہ کسی
اور سے اُن پر جرح نظر سے نہیں گزری،

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن اسلمؓ کی ایک تفسیر تھی جسے اُن کے صاحبزادے
عبدالرحمن بن زید بن اسلمؓ روایت کرتے تھے، لیکن واضح رہی کہ عبدالرحمن بن زید بن اسلمؓ
اپنے صلاح و تقویٰ کے باوجود ضعیف ہیں، اور اکثر محدثین نے اُن کی روایات کو
ناقابل اعتبار کہا ہے، لہذا حضرت زید بن اسلمؓ کی جو تفسیری روایات ان کے صاحبزادے
عبدالرحمن سے مروی ہیں وہ پوری طرح قابل اعتماد نہیں ہیں، ان کے صاحبزادے
کا حال آگے آ رہا ہے،

(۹) حضرت ابو العالیہؒ | ان کا پورا نام ابو القاریع و بر وزن زُبیر، بن ہرمان الریاحی ہے
یہ بصرہ کے باشندے ہیں، زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات کے دو سال بعد مسلمان ہوئے، حضرت ابو بکرؓ سے ملاقات کی
ہے، اور صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ،

۱۵ تہذیب الاسماء، ص ۲۰۰ ج ۱،

۱۶ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۵ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۳،

۱۷ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۱۷۸ و ۱۷۹،

حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، قرآن کریم کے بہترین قاری تھے، یہ بھی بنی رباع کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے؛ لیکن حضرت ابن عباسؓ ان کو اپنے ساتھ چار پائی پر بیٹھاتے تھے، جبکہ دوسرے قریشی لوگ نیچے بیٹھے ہوتے، اور فرماتے تھے: ”علم اسی طرح انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے“ ان کے ثقہ ہونے پر علماء کا اتفاق ہے، ۳۱ھ میں وفات ہوئی، مادرِ ارباب النہر کے علاقہ میں سب سے پہلے اذان دینے والے یہی تھے،

(۱) حضرت عروہ بن الزبیرؓ آپ حضرت زبیر بن عوامؓ کے صاحبزادے ہیں، مدینہ طیبہ کے مشہور فقہاء سبعہ میں سے ہیں، حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں، اس لئے حضرت عائشہؓ سے انھوں نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں ان کو سب سے زیادہ ثقہ قرار دیا گیا ہے، ان کی جلالتِ قدر، علم و فضل، اور وثاقت پر اجماع ہے، ان کے صاحبزادے ہشامؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ روزے رکھتے تھے، اور روزے ہی کی حالت میں (۳۱ھ میں) وفات پائی،

ابن شوزج کہتے ہیں کہ ”عروہؓ ہر روز چوتھائی قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اور رات کو تہجد میں بھی قرآن پڑھتے تھے، یہ معمول ساری عمر میں صرف اُس رات قضا ہوا جس رات میں آپ کی ٹانگ (ایک بیماری کی وجہ سے) کاٹی گئی تھی

(۱۱) حضرت حسن بصریؒ آپ کا پورا نام ابو سعید الحسن بن ابی الحسن یسار بصریؒ ہو

۱۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۵۱ ج ۲،

۲۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۵۸ ج ۱ ترجمہ نمبر ۵۰،

۳۔ تہذیب التہذیب ص ۲۸۲ ج ۳،

۴۔ حلیۃ الاولیاء ص ۲۲۱ ج ۲،

۵۔ تہذیب الاسماء ص ۳۳۱ و ۳۳۲ ج ۳ ترجمہ نمبر ۴۰،

۶۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۵۹ ج ۱ ترجمہ ۵۱،

آپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے (اور بعض حضرات کے قول کے مطابق جمیل بن قطبہ کے) آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز تھیں، چنانچہ کبھی کبھی آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا دودھ بھی پیا ہوگا، آپ کی ولادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے دو سال پہلے ہوئی، اور آپ نے بہت سے صحابہؓ کی زیارت بھی کی اور ان سے علم بھی حاصل کیا، علم و فضل کے اعتبار سے آپ کی جلالت قدر مسلم ہے، اور آپ کی عبارت و زہد اور پرجحمت ملفوظات مشہور ہیں، اس کے ساتھ ہی آپ نہایت بہادر مجاہد بھی تھے، متعدد جنگوں میں شریک ہوئے، اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں خراسان کے گورنر رقیع بن زیاد کے کاتب بھی رہے ہیں،

آپ نے بہت سی احادیث مرسلہ روایت کی ہیں، (یعنی جن صحابی سے آپ نے وہ حدیث سنی تھی ان کا واسطہ ذکر نہیں کیا) ایسی احادیث کے بارے میں محدثین کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے، کہ وہ قابل قبول ہیں یا نہیں، بعض حضرات انھیں قبول کرتے ہیں اور بعض حضرات انھیں ضعیف قرار دیتے ہیں، امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ ”حسن کی مرسلات اگر ثقہ راویوں سے مروی ہوں تو وہ صحیح ہیں اور بہت کم ساقط الاعتبار ہیں“ اور امام ابو زرہؒ کا قول ہے کہ ”وہ تمام احادیث جو حسن بہرہ نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر (بلا واسطہ) روایت کی ہیں میں نے تحقیق سے اُن کو ثابت پایا، سوائے چار احادیث کے (جن کی بنیاد مجھے نہیں ملی) لیکن امام احمدؒ نے اُن کی اور حضرت عطاء کی مراسیل کو ”اضعفت المراسیل“ (کمزور ترین مراسیل) کہا ہے، آپ کی وفات ۳۸ھ میں ہوئی،

(۱۲) حضرت قتادہؓ آپ کا پورا نام ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ (بکسر الدال)

۱۵ تہذیب الاسماء ص ۱۶۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۱۲۲،

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ ج ۳ ترجمہ عطاء بن ابی رباح ابن المدینیؒ اور ابو زرہؒ کے اقوال

یز اس مسئلہ مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ تا ۲۷۰ ج ۲،

اسد دسی البصری ہی، آپ مادر زاد نابینا تھے، اس کے باوجود قوتِ حافظہ کا عالم یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں: ”میں نے کبھی کسی محدث سے حدیث کو دوبارہ سُنانے کی فرمائش نہیں کی، اور میرے کانوں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جسے میرے دل نے یاد نہ کر لیا ہو“ نیز فرماتے ہیں ”قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں نے کچھ نہ کچھ (یعنی کوئی نہ کوئی روایت) سُن نہ رکھی ہو“ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ”قتادہؒ تفسیر کے زیادہ بڑے عالم ہیں“، اس کے علاوہ اُن کو عربی لغت و ادب اور تاریخ و انساب میں بھی بڑا درک حاصل تھا، البتہ محدثین نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات روایات میں تدلیس کیا کرتے تھے، آپ کا انتقال ۱۱۷ھ میں طاعون کی وبا سے شہر واسط میں ہوا، (۱۳) محمد بن کعب قرظیؒ آپ کا نام محمد بن کعب بن سلیم بن اسد القرظی ہے، کنیت ابو حمزہ یا ابو عبد اللہ ہے، آپ کے والد بنو قریظہ میں سے تھے، اور غزوہ بنو قریظہ کے وقت نابالغ ہونے کی بنا پر انھیں امان دی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد بن کعب قرظیؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں پیدا ہو چکے تھے، آپ نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ، حضرت براہ بن عازبؓ، حضرت معاذؓ، حضرت کعب بن عجرہؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ سے روایات نقل کی ہیں، امام ابن سعدؒ فرماتے ہیں ”ثقة اور کثیر الحدیث عالم تھے“ امام علیؓ کا قول ہے کہ ”ثقة اور صالح ہیں اور قرآن کریم کے عالم ہیں“ عون بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ: ”میں نے تفسیر قرآن کا اُن سے بڑا عالم نہیں دیکھا، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ”ان کے ثقة ہونے پر اتفاق ہے“

آپ شروع میں کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، بعد میں پھر مدینہ طیبہ واپس آ گئے،

۱۵ یہ تمام باتیں تذکرۃ الحفاظ ص ۵۱۵ تا ۵۱۷ طبقہ نمبر ۴ ترجمہ نمبر ۱۲ سے ماخوذ ہیں،

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۲۲۰ تا ۲۲۲ ج ۹،

سلسلہ اور سلسلہ کے درمیان وفات پائی،

(۱۴) **حضرت علقمہؓ** آپ کا پورا نام ابو ثنیس علقمہ بن قیس بن عبد اللہ نخعی ہے، آپ کو فہ کے باشندے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے تھے، یوں تو آپ نے بہت سے صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن آپ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد تھے، یہاں تک کہ صورت و سیرت میں بھی اُن سے مشابہ تھے، اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کی روایات کے معاملہ میں آپ پر اور حضرت اسودؓ پر بطور خاص اعتماد کیا جاتا ہے، نہایت خوش الحان قاری تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ آپ کو بلا کر آپ سے قرآن کریم سنا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک رات میں آپ نے پورا قرآن ختم کر لیا، باتفاق ثقہ ہیں، اور خاص طور سے علم فقہ میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ کی وفات کے بارے میں سلسلہ سے لے کر سلسلہ تک مختلف اقوال ملتے ہیں کہ آپ انتہائی متواضع بزرگ تھے، اپنے گھریلو کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور اپنا باقاعدہ حلقہ درس بنانا پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ ”مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے چلیں اور ایک دوسرے کہیں کہ یہ علقمہ ہیں“ آپ نے اپنے مکان کے علاوہ صرف ایک قرآن کریم کا نسخہ اور ایک گھوڑا ورنہ میں چھوڑا،

(۱۵) **حضرت اسودؓ** آپ کا پورا نام ابو عمرو اسود بن یزید بن قیس نخعی ہے، آپ بھی کو فہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں، حضرت علقمہؓ کے بھتیجے اور حضرت ابراہیم نخعیؓ کے ماموں ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ”آپ کی وثاقت اور جلالت قدر پر اتفاق ہے“ عبادت و زہد میں بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ نے عمر میں اسی مرتبہ حج یا عمرے کے لئے حرمین کا سفر کیا ہے،

۱۔ تہذیب الاسماء، ص ۹۰ ج ۱،

۲۔ تہذیب التہذیب ص ۲۷۸ ج ۲،

۳۔ حلیۃ الاولیاء لابن نعیمؒ، ص ۱۰۰ ج ۲،

آپ کے صاحبزادے عبدالرحمنؑ سات سو رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے، اس کے باوجود کہا جاتا تھا کہ وہ حضرت اسودؑ کے گھروالوں میں (عبادت کے اندر) سب سے کم محنت کرتے ہیں!

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ: ”حضرت اسودؑ رمضان میں دو راتوں کے اندر قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور مغرب اور عشاء کے درمیان سوتے تھے، اور رمضان کے علاوہ چھ راتوں میں قرآن ختم کرتے تھے“ روزے اتنی کثرت سے رکھتے تھے کہ جسم نیلا پیلا ہو جاتا، حضرت علقمہؒ اُن سے کہتے کہ ”اپنے جسم کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہو؟ تو جواب میں فرماتے کہ ”اسی جسم کی (خردی) راحت چاہتا ہوں“ اور کبھی جواب میں فرماتے: ”ابو شبل! (آخرت کا) معاملہ بڑا سنگین ہے، شہ ۴ کے لگ بھگ آپ کی وفات ہوئی،

(۱۷) مرۃ الہمدانیؒ | آپ کا پورا نام ابو اسمعیل مرۃ بن شراحیل الہمدانی الکسکی الکوفی ہے، اور آپ اپنے زمانے میں ”مرۃ الطیب“ اور ”مرۃ الخیر“ کے القاب سے معروف تھے، یوں تو آپ محض مین میں سے ہیں، اس لئے بہت سے صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابو ذرؓ وغیرہ، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ علم حاصل کیا ہے، چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں حضرت ابن مسعودؓ کی تفسیری روایات ان سے بکثرت مروی ہیں، باتفاق ثقہ ہیں آپ کی کثرت عبادت کا حال یہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں ”آپ نے اتنے سجدے کئے ہیں کہ مٹی آپ کی پیشانی کو کھا گئی تھی“ اور آپ کی یومیہ رکعات کی تعداد بعض حضرات

۱۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸ ج ۱ و تہذیب الاسماء، ص ۱۲۲ ج ۱،

۱۶ حلیۃ الاولیاء ص ۱۰۳ و ۱۰۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۶۵

۱۷ محض مین ان حضرات کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا، لیکن زیارت نہیں کی،

پانچ سو اور بعض نے چھ سو بتائی ہے، حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں: ”آپ تفسیر میں صاحب بصیرت تھے، تقریباً سترہ سو میں وفات پائی“ لیکن واضح رہے کہ کتب تفسیر میں آپ کی تفاسیر کثرت سدی سے مروی ہیں، جن کا حال ”ضعفاء“ کے عنوان کے تحت آگے آ رہا ہے،

۷۔ حضرت نافعؓ آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ نافع بن ہرملہ ہے، اور بعض حضرات نے نافع بن کاؤس بتایا ہے، آپ نیشاپور کے باشندے اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ جلیل القدر تابعی ہیں، آپ نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابولبابہؓ، حضرت نافع بن خدیجؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا، حضرت ابن عمرؓ کے شاگردوں میں دو حضرات کو سب سے زیادہ قابل اعتماد قرار دیا گیا ہے، ایک حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے سالم بن عبد اللہ اور دوسرے ان کے غلام نافعؓ، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ”ان کی جلالتِ قدر اور توثیق پر اجماع ہے“، اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ”تمام اسانید میں سب سے زیادہ صحیح سند مالک عن نافع عن ابن عمرؓ ہے“، خود حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ”لقد نفعنا علیہما بنافع“، اللہ تعالیٰ نے نافعؓ کے ذریعہ ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ”لا یصح لہ خطأ فی جمیع ما رواہ“، درجی احادیث انھوں نے روایت کی ہیں ان میں کوئی غلطی دریافت نہیں ہوئی، امام مالکؒ حضرت نافعؓ کے خاص شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ بہت متواضع بزرگ تھے، عموماً ایک سیاہ چادر اوڑھتی تھے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے، حضرت نافعؓ خود فرماتے ہیں کہ ”میں نے حضرت ابن عمرؓ کی تیس سال خدمت کی، اس کے بعد ابن عامرؓ نے انھیں پیشکش کی کہ وہ مجھے تیس ہزار درہم میں ان کے ہاتھ فروخت کر دیں، حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا مجھے خطرہ ہے

۱۔ تہذیب التہذیب، ص ۸۸ ج ۱۰ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۶۳ ج ۱

۳۔ تہذیب الاسماء، ص ۲۳ و ۲۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۸۷،

۴۔ تہذیب التہذیب ص ۴۱۳ تا ۴۱۵ ج ۱۰

کہ کہیں ابن عامر کے در اہم مجھے فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں، جاؤ تم آزاد ہو، اللہ میں
آپ کی وفات ہوئی،

(۱۸) حضرت شعبیؒ | آپ کا پورا نام ابو عمرو عامر بن بشر اہل الشبی الحیرہ ہے، آپ
کوفہ کے مشہور فقہاء تابعین میں سے ہیں، تقریباً پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے، حافظہ
غیر معمولی طور پر قوی تھا، کبھی عمر بھر احادیث لکھ کر یاد نہیں کیں، فرماتے تھے کہ
جو شخص مجھے کوئی بات سنا تا ہے مجھے فوراً یاد ہو جاتی ہے، انہی کا قول ہے کہ ”مجھے سب
کم جو چیز یاد ہو وہ اشعار ہیں، اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو ہینہ بھر تک شعر سناتا
رہوں، اور کوئی شعر مکرر نہ ہو“ آپ امام ابو حنیفہؒ کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور
آپ کی جلالت قدر پر اتفاق ہے، امام احمد اور امام عجلؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مراسیل
بھی صحیح ہیں، کیونکہ وہ صرف صحیح روایات ہی کو مسلاً روایت کرتے ہیں،

(۱۹) حضرت ابن ابی ملیکہؒ | آپ کا پورا نام ابو محمد عبداللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ
الیمنی المکی ہے، آپ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے عہد خلافت میں مکہ مکرمہ کے قاضی اور
مسجد حرام کے موزن تھے، بعد میں حضرت ابن زبیرؓ نے آپ کو طائف کا قاضی بنا دیا تھا
آپ نے بہت سے صحابہؓ سے احادیث روایت کی ہیں، خود فرماتے ہیں کہ: میں نے تیس
صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے، طائف کے قیام کے دوران آپ نے حضرت ابن عباسؓ
سے بھی استفادہ کیا ہے، حافظ زہبیؒ فرماتے ہیں: کان اسامہا فقیہا حجة فسیحاً
مفوها متفقاً علی ثقہ، خلاصہ یہ کہ آپ کی امامت اور وثاقت پر اتفاق ہے،
اللہ میں وفات پائی،

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۹۴ ج ۱،

۲۔ ایضاً، ص ۸۲ تا ۸۳ ج ۱،

۳۔ تہذیب التہذیب، ص ۳۰۷ ج ۵،

۴۔ تذکرۃ الحفاظ، ص ۹۵ و ۹۶ ج ۱،

(۲۰) حضرت ابن جریرؒ | آپ کا پورا نام ابو الولید عبد الملک بن عبد العزیز بن جریر القریشی المکی ہے، آپ تبع تابعین میں سے ہیں، اور حضرت طاؤسؒ، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت ابن ابی ملیکہؒ اور حضرت نافعؒ وغیرہ کے شاگرد ہیں، خاص طور سے حضرت عطاءؒ کے ساتھ سترہ سال رہے، میں، حضرت عطاءؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں، تو حضرت عطاءؒ نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”اگر یہ نوجوان زندہ رہے تو ان سے“ اسی لئے آپ کو حضرت عطاءؒ کی روایات کے معاملہ میں اثبت الناس (تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد) کہا گیا ہے، آپ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ اپنی علوم کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں، جنہوں نے علوم کی پہلی بار تدوین کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: ”مَادَنَّ الْعُلَمَاءُ دِينِي أَحَدًا“ (مجھ سے پہلے میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی تھی، عبادت و زہد میں بھی آپ نہایت بلند پایہ بزرگ تھے، مہینہ میں صرف تین دن روزے کے بغیر رہتے تھے، ورنہ سارے مہینے روزے رکھتے تھے) امام عبد الرزاقؒ فرماتے ہیں کہ: ”جب کبھی میں ابن جریرؒ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ آپ کا دل خشیت اللہ سے معمور ہے۔“

بیشتر محدثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ بعض علماء سے آپ پر معمولی جرح و تنقید بھی مردی ہے، مثلاً امام مالکؒ سے منقول ہے کہ: ”ابن جریرؒ عاطب اللیل ہیں“ (یعنی رطب و یابس ہر طرح کی روایات لے لیتے ہیں) حجتی بن معینؒ فرماتے ہیں کہ ”وہ زہریؒ کی روایات کے معاملے میں کچھ نہیں ہیں“ (یعنی ناقابل اعتبار ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بعض اوقات ضعیف راویوں سے تدریس کر جاتے تھے، اسی لئے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ جو روایات انہوں نے صراحۃً حدّ ثنی یا اخبرنی کے الفاظ سے نقل کی ہیں

وہ تو ٹھیک ہیں، البتہ جو روایات عن کے لفظ سے نقل کی ہیں وہ مشتبہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی آپ قابل اعتماد راوی ہیں، چنانچہ صحاح ستہ میں آپ کی روایات بکثرت مروی ہیں،

(۲۱) حضرت ضحاکؒ آپ کا پورا نام ابو القاسم الضحاک بن مزاحم البعلالی ہے آپ خراسان کے باشندے ہیں، ضحاک کے معنی ہیں ”بہت ہنسنے والا“ اور آپ کا نام ضحاک اس لئے رکھا گیا کہ آپ دو سال بطنِ مادر میں رہے، اور جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے دانت نکل چکے تھے، اور آپ ہنس رہے تھے؟ آپ صحابہؓ کے درمیں پیدا ہو چکے تھے، لیکن کسی صحابی سے آپ کا روایت کرنا مشکوک ہی، یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی آپ کی روایات صحیح قول کی بنا پر مرسل ہیں، عبد الملک بن عبیدہ فرماتے ہیں کہ ”ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی، البتہ رے کے مقام پر حضرت سعید بن جبیرؓ سے ملاقات ہوئی ہے، اور انہی سے انھوں نے تفسیر حاصل کی ہے، اکثر علماء نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، صرف حضرت شعبہؓ اور یحییٰ بن سعید القطانؓ ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لیکن اول تو یہ دونوں حضرات رجال پر جرح کرنے کے معاملہ میں دوسروں سے زیادہ متشدد ہیں، دوسرے غالباً ان کی جرح کا منشاء یہی ہے کہ ضحاک کی ملاقات کسی صحابی سے نہیں ہوئی، اس کے باوجود وہ صحابہؓ سے براہِ راست روایت کرتے تھے، ورنہ ہذا بخود وہ ثقہ ہی ہیں، حافظ ذہبی نے ان کا تذکرہ کر کے لکھا ہے: رتقہ احمد وابن معین وابوزعۃ وغیرہم،

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۴۰۳ تا ۴۰۶ ج ۶،

۲۔ مفتاح السعاده، طاش کبریٰ زادہ ص ۴۰۴ ج ۱، والبدایۃ والنہایۃ لابن کثیرؒ،

ص ۲۲۳ ج ۹، احوال کالم ص ۲۵۳ ج ۴،

۳۔ دیکھئے الاجوبۃ الفاضلۃ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ، ص ۶۱ تا ص ۸۰ (مطبوعہ شام، بتحقیق ایشخ عبد الفتاح ابو نعۃ)،

وضعه یحیی القطان وشعبة ایضا، وهو قوی فی التفسیر را امام احمد
وابن معینؒ اور ابو زرعهؒ وغیرہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے، اور یحیی القطانؒ اور شعبہؒ
نے ان کی تضعیف کی ہے اور وہ تفسیر میں قوی ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے
ہیں: ”حدوث کثیر الاموال، سال رپچے ہیں، مگر مُرسل روایات کثرت سے ذکر کرتے
ہیں، یہ بات تو ہم پیچھے لکھ ہی چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات ان کے
طریق سے آئی ہیں انھیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، البتہ خود ان کے اپنی تفسیری
اقوال قابل قبول ہیں، اُن کی وفات ۱۷۸ھ اور ۱۸۸ھ کے درمیان ہوئی ہے،

قرونِ اولیٰ کے ضُعفاء یا مختلف فیہ مفسرین

مذکورہ بالا حضرات تو وہ تھے جن کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے پر علماء محدثین کا
تقریباً اتفاق رہا ہے، اور جن کا ذکر تفسیری اقوال و روایات میں بکثرت آتا رہتا ہے
ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت دہب بن منبہؒ، اور کعب الاحبارؒ کا
مفصل تذکرہ ”اسرائیلیات“ کے عنوان کے تحت آچکا ہے، اب تابعین اور تبع تابعین
کے عہد کے بعض ان حضرات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جنھیں یا تو ضعیف
قرار دیا گیا ہے یا جن کے قابل اعتماد ہونے میں قابل لحاظ اختلاف رہا ہے،

سُدی کبیر | تفسیر کی کتابوں میں ”سُدی“ کے نام سے دو صاحب معروف ہیں،
دونوں کا تذکرہ الگ الگ مناسب ہوگا،

(۱) ابو محمد اسماعیل بن عبدالرحمن بن ابی کریمۃ السُدی الکوفی (متوفی ۲۰۸ھ)
”السُدی الکبیر“ کہا جاتا ہے، اور تفسیر کی کتابوں میں جب صرف ”سُدی“ لکھا جاتا ہے

۱۵ المغنی فی الضعفاء للذہبی، ص ۳۱۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۹۱۲،

۱۶ تقریب الہتذیب، ص ۲۷۳ ج ۱ مطبوعہ مدینہ منورہ،

تو عموماً یہی مراد ہوتے ہیں، اُن کو ”سُدی“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر ایک چبوترہ سا تھا، یہ اُس پر بیٹھ کر اوڑھنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے، دروازے کے ایسے چبوترے کو عربی میں ”سُدہ“ کہتے ہیں، اس لئے اُن کو سُدی کہا جانے لگا۔ اُن کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاص ذوق تھا، چنانچہ تفسیر کی کتابیں اُن کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں، البتہ علم تفسیر اور روایات کے معاملہ میں یہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، اس مسئلہ میں محققین کی آراء مختلف ہیں، بعض حضرات نے اُن کی توثیق کی ہے، مثلاً حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں: ”لا بأس به ما سمعت احداً يذكره الا بشيء“ (اُن کی روایات میں کوئی حرج نہیں، میں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا) امام حسنؒ فرماتے ہیں کہ ”وہ ثقہ ہیں“ امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں: ”لہ احادیث و هو عندي مستقيم الحديث صدق لا بأس به“ (میری نظر میں حدیث کے معاملے میں وہ ٹھیک ہیں، سچے ہیں، ان میں کوئی حرج نہیں) امام عجلؒ فرماتے ہیں ”ثقة عالم بالتفسير رواية له“ (وہ تفسیر کے ثقہ عالم اور راوی ہیں)، امام نسائیؒ انھیں صالح کہتے ہیں، امام بخاریؒ کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں قابل اعتبار سمجھتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں کوئی جرح نقل نہیں فرمائی، بلکہ اسمعیل بن ابی خالدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”سُدی قرآن کریم کے شعبیؒ سے زیادہ بڑے عالم ہیں“ اور یحییٰ بن سعید القطانؒ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جو اوپر گزرا کہ ”میں نے جس کسی کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا“ ان دو اقوال کو نقل فرما کر انھوں نے خود کو

۱۔ محدثین کے ان اقوال کا ہم نے تقریبی ترجمہ محض سہولت کے لئے کر دیا ہے، ورنہ یہ تمام فقرے اصطلاحی ہیں، اور ان کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اصول حدیث پر نظر رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں اس پورے مفہوم کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں،
 ۲۔ تہذیب التہذیب، ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱،

جرح نہیں فرمائی؛ امام مسلمؒ کے نزدیک بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی صحیح میں اُن سے حدیث لی ہے،

اس کے برخلاف دوسرے بہت سے علماء نے اُن پر جرح بھی فرمائی ہے، مثلاً امام شعبیؒ سے کسی نے کہا کہ ان السَّنَنُ فِيهَا عَثَلٌ عَظِيمٌ، علماء ائمہ ان (سُدی کو قرآن کریم کے علم کا بڑا حصہ ملا ہے) اس کے جواب میں امام شعبیؒ نے فرمایا ”قَدْ اعْطِيَ حِظًّا مِنْ جِهْلٍ بِالْأَقْرَانِ“ (ان کو قرآن کریم سے جاہل ہونے کا بڑا حصہ ملا ہے) حضرت یحییٰ بن معین انھیں ضعیف قرار دینے لگے اور فرماتے تھے ”فِي حَدِيثِهِ ضَعْفٌ“ (اُن کی احادیث میں ضعف ہے) امام ابو زرعہؒ انھیں لیث (زعم) کہتے تھے، جوافیٰ درجہ کی توثیق ہے، امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں ”يَكْتَبُ حَدِيثَهُ وَلَا يَسْتَحِبُّ بِهِ رَأْيَ كِي حَدِيثٍ لَكْهِي جَانِبٍ مَكْرَانَ سَهْ تَدَلَالِ دَرَسْتِ نَهِيں، سَاجِي“ فرماتے ہیں ”صَدُوقٌ فِيهِ نَظَرٌ“ (سچے ہیں مگر محل نظر ہیں) امام عقیلیؒ کا قول ہے ”ضَعِيفٌ وَكَانَ يَتَنَاوَلُ الشَّيْخِينَ“ (ضعیف ہیں اور شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی بدگویی کرتے تھے) امام طبریؒ کہتے ہیں ”لَا يَمْتَنِعُ بَعْدَ يَثَ“ (ان کی حدیث سے استدلال درست نہیں) امام جوزجانیؒ فرماتے ہیں ”كَذَّابٌ شَنَامٌ“ (وہ جھوٹے اور تبرّاز ہیں) امام فلاسؒ نے حضرت عبدالرحمن بن مہدیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ”وہ ضعیف ہیں“ اور حسین بن واذا المروزیؒ کہتے ہیں کہ ”سَمِعْتُ مِنَ السَّنَنِ فَمَا قَمْتُ حَتَّى سَمِعْتَهُ يَشْتُمُ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ فَلَمَّا عَلِيَ إِلَيْهِ“ (میں نے سُدی سے احادیث سنی ہیں، اور اُن کو اس وقت چھوڑا میں نے اُن کو سنا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے خلاف بدزبانی کر رہے ہیں، اس کے بعد میں اُن کے پاس نہیں گیا)۔

۱۵ النابغ الكبير للبخاري ص ۳۶۱ قسم ا جلد ۱ ترجمہ نمبر ۱۱۴، طبع بیروت،

۱۶ تہذیب التہذیب ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱

۱۷ میزان الاعتدال للذہبی ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ترجمہ نمبر ۹۰۷،

اُن کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے یہ نکالا ہے کہ ”صدوق
بھم ورمی بالتشیع“ (وہ سچے ہیں، مگر ان کو یہ روایت میں دھم ہو جاتا ہے، اور ان پر
تشیع کا بھی الزام ہے) لفظ ”صدوق“ محدثین کی اصطلاح میں اُس شخص کے لئے
بولاجاتا ہے جو جھوٹا تو نہ ہو لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہو، لہذا ان کی صحیح
حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے یہ محدثین کے معیار پر پورے نہیں اُترتے
دوسرے اُن پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے، لیکن ان کو کذاب صرف امام جو زجانی
نے کہا ہے،

سَدِّی صَغِيرٌ | (۲) دوسرے صاحب جو سَدِّی کے نام سے مشہور ہیں محدثین مروا
اَلسَدِّی ہیں، جو عبد الرحمن ابن زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ
غلام تھے، اُن کی روایات سَدِّی کبیر کے مقابلہ میں کم ہیں، اور اُن کو سَدِّی کبیر سے
ممتاز کرنے کے لئے ”اَلسَدِّی الصَّغِيرُ“ کہا جاتا ہے، یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور
ان کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، یہ مشہور مورخ کلبیؒ کے شاگرد ہیں
(جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) امام بخاریؒ فرماتے ہیں ”لَا يَكُنْب حَدِيثُهُ الْبَسْتَةُ،
رَأَى فِي احَادِيثِ هِرْكَوْهَ بَعْضُ مَا يَكُنْبُ“ (اس کی احادیث ہرگز نہ بھی جائیں، امام ابن معینؒ کا ارشاد ہے: ”یس بشفة“
(وہ ثقہ نہیں) امام حسنؒ فرماتے ہیں ”ادركنه وقد كبر فتركه (میں نے
اُن کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لہذا میں نے انہیں چھوڑ دیا) حافظ
ذہبیؒ اُن کے بارے میں فرماتے ہیں: ”تركوه واتهمه بعضهم بالكذب“ (محدثین
نے انہیں چھوڑ دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اُن پر جھوٹ کا الزام بھی لگایا ہے)۔
اور ایک دوسرے مقام پر اُن کے بارے میں لکھتے ہیں ”واہ بمرۃ“ (دانتھائی و اہمیات

۱۵ تہذیب التہذیب ص ۲۷۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۵۳۲ طبع المدینۃ المنورۃ،

۱۶ تاریخ بغداد للخطیبؒ، ص ۲۹۱ ج ۳،

۱۷ میزان الاعتدال ص ۳۲ و ۳۳ ج ۲ والمغنی فی الضعفاء ص ۶۳۱ ج ۲ ترجمہ نمبر ۵۹۶،

راوی ہیں) امام نسائیؒ فرماتے ہیں متروک الحدیث، ابو علی صالح بن محمد کہتے ہیں
”کأن ضعیفا، وكان يضع الحديث أيضا“ (ضعیف تھے اور حدیثیں گھڑا بھی کرتے
تھے)

پیچھے حضرت ابن عباسؓ کے تذکرے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ”تنویر المقیاس فی
تفسیر ابن عباس“ کا رد و جرح نسخہ اپنی سے مروی ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے اس کی سند
کو ”سلسلۃ الکذب“ قرار دیا ہے، اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛

مقاتل | مقاتل نام کے بھی دو صاحب معروف ہیں، ایک ابوبسطام مقاتل بن
حیانؒ اور دوسرا ابوالحسن مقاتل بن سلیمان، دونوں ایک ہی شہر کے
یعنی بلخ کے باشندے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے کے ہیں اور ایک ہی طرح کے اساتذہ
سے روایت کرتے ہیں، اس لئے بسا اوقات ان میں التباس ہو جاتا ہے، ان میں سے
اول الذکر (یعنی مقاتل بن حیان) راجح قول کی بنا پر ثقہ ہیں، اور حلیل القدر علماء
میں سے ہیں، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ان کا حوالہ کم آتا ہے، تفسیر کی کتابوں میں جب
صرف ”مقاتل“ لکھا جاتا ہو، تو اس سے مراد دوسرے صاحب (یعنی مقاتل بن سلیمان)
ہوتے ہیں، کیونکہ وہی مفسر کے لقب سے مشہور ہیں، اور انہی کی روایات اور اقوال
کتب تفسیر میں زیادہ ہیں، لہذا یہاں ان کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ پیش خدمت ہے؛
مقاتل بن سلیمان (متوفی ۷۵ھ) نے ایک تفسیر لکھی تھی، جس کے حوالے کتب
تفسیر میں بکثرت آتے ہیں، چند علماء نے ان کی تعریف کی ہے، لیکن اکثر محدثین نے
انہیں مجروح اور ناقابل اعتبار بتایا ہے، تعریف کرنے والوں میں امام شافعیؒ ہیں جو

۱۔ میزان الاعتدال ص ۲۳۷ ج ۱ بہ ذیل ترجمہ اسماعیل بن عبد الرحمن السدسی الکبیر

۲۔ کتاب الضعفاء والمنزکین للنسائیؒ مع التایخ الصغیر للبخاریؒ ص ۳۰۳ مطبوعہ شیخ پورہ

۳۔ تاریخ بغداد للخطیبؒ ص ۲۹۲ ج ۳ طبع بیروت

۴۔ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲

فرماتے ہیں: ”الناس عيال على مقاتل في التفسير“ (لوگ تفسیر کے معاملہ میں مقاتل کے محتاج ہیں) نیز حضرت بقیہؒ کہتے ہیں کہ ”حضرت شعبہؒ سے مقاتل کے بارے میں ہجرت سوال کیا جاتا تھا، میں نے ہمیشہ ان کو مقاتل کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہی پایا“ اور حضرت مقاتل بن حیانؒ ان کو علم کا سمندر کہا کرتے تھے،

لیکن اُن چند تعریفی کلمات کو چھوڑ کر بیشتر ائمہؒ حدیث نے اُن پر شدید جرح اور تنقید کی ہے۔ اُن پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ بے اصل روایات نقل کرتے ہیں حضرت ذکیعؒ فرماتے ہیں: ”ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقاتل کے پاس جائیں، لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر میں آگئے، ہم اُن کے پاس پہنچے، مگر ہم نے انھیں کذاب پایا، اس لئے ان سے کچھ نہیں لکھا“ امام جوزجانیؒ اُن کے بارے میں کہتے ہیں ”کان کذاباً جسوراً ربڑاً ڈھیٹ کذاباً“ امام ابن معینؒ فرماتے ہیں ”لیس بنقۃ“ (وہ ثقہ نہیں ہے) اور ایک اور موقع پر انھوں نے کہا ”لیس بشی“ (وہ کچھ بھی نہیں) عمرو بن عسلی (فلاسؒ) فرماتے ہیں ”من رآہ الحدیث کذاباً“ امام ابن سعدؒ کہتے ہیں: ”أصْحَابُ الْحَدِيثِ بَنَفُونَ حَدِيثَهُ وَيُنَادُونَہُ“ (علماء حدیث اس کی حدیث سے بچتے اور اُسے منکر سمجھتے ہیں)، عبد الرحمن بن حکمؒ کہتے ہیں: ”وہ قصہ گو تھا، لوگوں نے اس کی حدیثیں ترک کر دی ہیں“ ابو حاتمؒ اور امام عجلؒ فرماتے ہیں: ”متروک الحدیث“ امام نسائیؒ نے انھیں کذاب قرار دیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں گھڑ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک مقاتل بھی ہیں“ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں ”یکذب“ (وہ جھوٹ بولتے ہیں)، امام حاکمؒ لکھتے ہیں: ”لیس بالقوی عندہم“ (وہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں)، عبد الصمد بن عبد الوارثؒ فرماتے ہیں کہ: ”مقاتل ہمارے پاس آئے اور ہمیں عطاؒ کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنانے لگے، پھر وہی حدیثیں صَحَّاحؒ کے واسطے سنائیں، پھر وہی احادیث عمرو بن شعیبؒ کے واسطے سے سنائیں، ہم نے ان سے کہا کہ یہ روایات آپ نے کس سے سنی ہیں؟ تو پہلے تو انھوں نے

کہا کہ ان سب سے سنی ہیں، مگر پھر کہنے لگے، نہیں خدا کی قسم مجھے یاد نہیں کسی سنی ہیں
 اور امام بخاری فرماتے ہیں، ”لا شئ البتہ“ ”وہ ہرگز کوئی شے نہیں“
 عبداللہ بن مبارک اُن کی عبادت گزاری کی تعریف کرتے تھے، لیکن اُن کی روایات قبول
 نہیں کرتے تھے۔

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ عقائد کے اعتبار سے فرقہ مجسمہ میں سے تھے یعنی
 اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے
 اعضاء وغیرہ کے قائل تھے، عباس بن مصعب مروزی کہتے ہیں کہ: ”مقاتل بن سلیمان اسلاً
 بلخ کے باشندے تھے، پھر مرویں آگئے، یہاں انھوں نے جامع مسجد میں قصہ گوئی شروع
 کر دی، یہیں پر اُن کے اور حیم بن صفوان (بانی فرقہ جہم) کے درمیان مباحثے شروع
 ہو گئے، چنانچہ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں، اور امام ابو حنیفہ
 فرماتے ہیں: ”ہمارے یہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے خبیث نظریات گھس آئے
 ہیں، ایک جہم (کا نظریہ) جو معتزلہ میں سے تھا، اور ایک مقاتل (کا نظریہ) جو مشبہ
 میں سے تھا، نیز امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: ”جہم نے نفی (صفات) میں غلو سے کام لیا،
 یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کالعدم بنا دیا، اور مقاتل نے اثبات (صفات) میں غلو کیا،
 یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات کے مشابہ قرار دینا، چنانچہ حافظ شمس الدین
 ذہبی نے اُن کو ضعفاء میں شمار کر کے لکھا ہے: ”مقاتل بن سلیمان البلخی المفسر“
 ہالک، کن بہ وکیع والنسائی (مقاتل بن سلیمان بلخی مفسر تباہ حال ہیں، وکیع
 اور نسائی نے انھیں کذاب کہا ہے)۔

۱۔ یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ ج ۱۰ سے ماخوذ ہیں،

۲۔ التباہ الکبیر ص ۱۴ قسم ۲ ج ۴ ترجمہ نمبر ۱۹۶،

۳۔ مفتاح السعادة، طاش کبریٰ زاوہ (ص ۴۰۴ ج ۱ مطبوعہ دکن،

۴۔ تہذیب التہذیب حوالہ بالا،

۵۔ المغنی فی الضعفاء، للذہبی ص ۶۵، ۶۶ ج ۲،

اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کے احوال کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ”کن بوہ وھجروہ ورجھا بالتجسیم“ (علماء نے ان کی تکذیب کی ہے اور اُن کی روایات کو چھوڑ دیا ہے، اور ان پر فرقہ مجسمہ میں سے ہونے کا الزام بھی ہے)

اتنی شدید جرح و تنقید کے باوجود تفسیر کی کتابوں میں اُن کے اقوال بڑی کثرت سے ذکر کئے جاتے ہیں، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اگرچہ روایت حدیث میں اُن پر بھروسہ نہیں ہو لیکن وہ وسیع المعلومات آدمی تھے، اور چونکہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا مشغلہ تفسیر ہی کو بنایا تھا، اور اس بارے میں مختلف طریقوں سے معلومات جمع کی تھیں، اس لئے اُن کی تفسیر میں بعض کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں، اس لئے ان کی معلومات بھی مفسرین نے ذکر کر دی ہیں، تاکہ محقق علماء اُن میں سے کوئی بات مفید اور صحیح پائیں تو قبول کر لیں ورنہ رد کر دیں، اس سلسلے میں بعض علماء کے اقوال یہ ہیں:-
امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ: ”اُن کے پاس کچھ کتابیں تھیں جنہیں دیکھتے رہتے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ قرآن کا کچھ علم اُن کے پاس تھا، حضرت ابراہیمؑ بھی فرماتے ہیں کہ: انساجم مقاتل تفسیر الناس وفسر علیہ، من غیر سماع (مقاتل نے مختلف لوگوں کی تفسیریں جمع کر کے اُن کے مطابق تفسیر کی ہے، مگر کسی سے ان تفسیر کو براہ راست نہیں سنا)، عباس بن مصعب مروزیؒ فرماتے ہیں: ”کان حافظاً للتفسیر لا یضبط الاسناد“ (انھیں تفسیر تو یاد تھیں مگر سند یاد نہ تھی)

۱۵ تقریب النہذیب، ص ۲۷۲ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۳۴

۱۶ تاریخ بغداد للخطیب، ص ۱۶۱ ج ۱۳، خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن خلیفہ منصور بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی بار بار آکر اس کے چہرے پر بیٹھ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ پریشان ہو گیا، اتنے میں مقاتل بن سلیمان آگئے، منصور نے ان سے پوچھا: ”تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے؟“ مقاتل نے کہا: ہاں! اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ جابر قسم کے لوگوں کو ذلیل کرے۔“ منصور خاموش ہو گیا، (ص ۱۶۱ ج ۱۳)۔

نعیم بن حمارؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان بن عیینہؓ کے پاس مقاتل کی ایک کتاب دیکھی تو ان سے پوچھا کہ کیا آپ تفسیر میں مقاتل کی روایات نقل کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا: ”نہیں، لیکن میں اس سے مدد لیتا ہوں“ حضرت عبداللہ بن المبارکؓ نے اُن کی تفسیر دیکھی تو کہا ”اس میں علم تو بڑا عجیب ہے، کاش کہ اس کی اسناد بھی (صحیح) ہوتیں“ حضرت حاد بن عمروؓ نے فرمایا ”جو باتیں یہ بیان کرتے ہیں اگر انھیں علم کہنا صحیح ہو تو یہ کتنے بڑے عالم ہیں“ امام ابن حبانؓ فرماتے ہیں کہ: وہ یہود و نصاریٰ سے قرآن کا علم حاصل کرتے تھے جو اُن کی کتابوں کے موافق ہے، اور خلیلؓ کہتے ہیں: اہل تفسیر کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے، اور وہ وسیع العلم تھے، لیکن حفاظ حدیث نے روایت میں اُن کو ضعیف قرار دیا ہے۔

لہذا مقاتل کی تفسیروں پر روایتی نقطہ نظر سے تو ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے البتہ لغت و ادب، تاریخ و قصص، کتب سابقہ کے حوالوں اور عام معلومات کے لحاظ سے اُن کی تفسیر میں کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں، جن سے محقق اہل علم کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے ان کو نقل کرنے میں قباحت نہیں سمجھی،

ربیع بن انسؓ | ان کا نام ربیع بن انس لہکری الحنفی ہے، یہ اصلاً بصرہ کے باشندے ہیں، پھر خراسان چلے گئے تھے، اس لئے ان کو بصری بھی کہا جاتا ہے اور خراسانی بھی، انھوں نے حضرت انسؓ، حضرت ابو العالیہؓ اور حضرت حسن بصریؓ وغیرہ سے روایات لی ہیں، امام عجلؓ، ابو حاتمؓ اور امام نسائیؓ نے ان کے لئے ”صدوق“ یا ”لیس بہ بأس“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے۔

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۲۸۰ تا ۲۸۴ ج ۱۰ و میزان الاعتدال ص ۴۳ ج ۴، طبع مصر، مقاتل بن سلیمان کے بارے میں جتنے اقوال ہم نے تہذیب التہذیب سے بلا سند نقل کئے ہیں ان کی سند کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیب ج ۶۰ تا ۱۶۹،

۲۔ تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳ و المجرع والتحریر، لابن ابی حاتمؓ ص ۴۵۴ ج ۱ قسم ۲ ترجمہ نمبر ۲۰۵ طبع دکن،

ابنہ حضرت یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں: ”کان یشیع فیفرط“ (وہ شیعہ تھے اور تشیع میں) (افراط سے کام لیتے تھے) اور امام ابن حبانؒ نے انھیں ”ثقات“ میں شمار کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ ابو جعفر رازیؒ نے ان کی جو روایات ذکر کی ہیں لوگ اُن سے احتراز کرتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی روایات میں اضطراب بہت ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے اُن کے بارے میں خلاصہ یہ ذکر کیا ہے کہ: ”مصدق له ادھام رحمی بالتشیع“ (وہ سچ بولتے ہیں، مگر ایک تو ان کو روایات میں دہم بھی ہو جاتا ہے دوسرے اُن پر تشیع کا الزام ہے)

عَلِيَّةُ الْعَوْنِي | ان کا پورا نام ابو الحسن عطیہ بن سعد بن جنادۃ العونی الحبلی (متوفی ۲۸۸ھ) ہے، یہ کوفہ کے باشندے تھے، تابعین میں سے ہیں، اور حضرت ابو سعید خدریؒ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں، ان کو امام نسائیؒ نے ”ضعیف“ کہا ہے، نیز امام حسدؒ یحییٰ بن سعید القطانؒ، بشیمؒ، ابو حاتمؒ، ابن عدیؒ جو زجانیؒ، ابن حبانؒ، امام ابو داؤد اور ساجیؒ وغیرہ نے بھی اُن کی تضعیف کی ہے، ابن سعدؒ نے اتنا لکھا ہے کہ: ”لہ احادیث صالحۃ ومن الناس من لا یجتہ بہ“ (وہ ٹھیک حدیثیں روایت کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے) اور امام ابو زرعہؒ نے انھیں ”لیثین“ کہا ہے جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے، اور یحییٰ بن معینؒ ان کو ”صالح“ کہتے ہیں، یہ بھی ہلکی قسم کی توثیق ہے، دراصل ان پر چار قسم کے اعتراض ہیں، پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انھوں نے روایات کی سند میں مغالطہ انگیزی کا ارتکاب کیا ہے، امام احمدؒ اور امام ابن حبانؒ نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ کھلی کے

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳،

۲۔ تقریب التہذیب ص ۲۴۳ ج ۱،

۳۔ کتاب الضعفاء والمتروکین، للنسائیؒ، مع تاریخ الصغیر للبخاریؒ، ص ۴۰۱،

پاس جا کر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور اُن سے روایات لیتے تھے، لیکن چونکہ کلبی ضعیف اور بدنام ہیں (جیسا کہ آگے آرہا ہے) اس لئے انھوں نے انکی کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی، اور جو روایات یہ کلبی سے سنتے اُن کو کلبی کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کر دیتے، اور چونکہ عطیۃ العونی مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے بعض احادیث سُنی تھیں، اس لئے ناواقف لوگ یہ سمجھتے... کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہوگی، حالانکہ درحقیقت وہ کلبی کی روایت ہوتی تھی؛

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے، اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات نقل کرنے میں غلطیاں کرتے تھے، اور چونکہ اعتراض یہ ہے کہ مدلس تھے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ”صدوق یعطیٰ کثیراً، کان شیعياً مدلساً“ (سچ بولنے والے ہیں مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں، شیعہ تھے اور مدلس تھے) اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ ضعیف ہیں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”تابعی مشہور مجمع علیٰ ضعفہ“ (مشہور تابعی ہیں، اُن کے ضعف پر اجماع ہے) البتہ امام ترمذیؒ نے اُن کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے، لیکن امام ترمذیؒ کی اصطلاح میں حسن سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی مہتمم بالکذب (جھوٹ کا مُلَزَم) نہ ہو، اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مروی ہو، اس لئے ان کی تحسین سے اُن اعتراضات کا دفعیہ نہیں ہوتا جو عطیۃ العونی پر وارد کئے گئے ہیں،

۱۵ تہذیب التہذیب ص ۲۲۵ و ۲۲۶ ج ۲

۱۶ تقریب التہذیب ص ۲۲۳ ج ۲

۱۷ المغنی فی الضعفاء ص ۲۳۶ ج ۲ ترجمہ نمبر ۴۱۳۹

۱۸ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲ نوع ۵

۱۹ دیکھئے کتاب العلل للترمذیؒ

عبدالرحمن بن زید بن اسلم | ان کا پورا نام عبدالرحمن بن زید بن اسلم العدوی المدنی (متوفی ۲۵۷ھ) ہے، یہ حضرت زید بن اسلمؓ کے

صاحبزادے ہیں جن کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، ان کو بیشتر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، صرف امام بن عدیؒ کا قول ہے کہ ”لہ احادیث حسان“، وہو ممن احتمل الناس وصدقہ بعضہم وہو ممن یکتب حدیثہ“، ان سے حسن احادیث مروی ہیں وہ ان راویوں میں سے ہیں جنہیں لوگوں نے گوارا کیلئے ہے، اور بعض حضرات نے ان کی تصدیق کی ہے، ان کی حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں، باقی تمام علماء جرح نے ان کی تضعیف کی ہے، امام بخاریؒ لکھتے ہیں: ”ضعفہ علیّ بن عبد اللہ بن المذہبی نے ان کو بہت ضعیف کہا ہے، امام نسائیؒ لکھتے ہیں: ”ضعیف“، امام احمدؒ اور امام ابو زرعہؒ نے بھی ان کی تضعیف کی ہے، امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ ”زید بن اسلمؓ کے تمام بیٹے ضعیف ہیں“، امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ”اپنی ذات میں صالح آدمی تھے، مگر حدیث میں بہت کمزور“، امام ابن خزمیرہؒ کہتے ہیں: ”لیس، ہو ممن یحتج اہل العلم بحديثہ لسوء حفظہ“، وہ رجل سناعتہ العبادۃ والنقش“ (وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی حدیث سے اہل علم استدلال کر سکیں، کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا، ان کا اصل کام عبادت وزہد ہے)۔ امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: ”کان یقلب الاخبار وھو لا یعلم حتی کثر ذلک فی روایتہ من رفع المراسیل وباسناد الموقوف فاستحق الترتک“ (وہ روایات کو غیر شعوری طور پر پلٹ دیتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی روایت میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل کو مرفوع بنایا اور موقوف کو مسند کر دیا، اس لئے وہ مستحق ترک ہیں)، امام طحاویؒ فرماتے ہیں: ”حدیثہ عند اہل العلم بالحدیث فی النہایۃ من الضعف“ (علمائے

۱۔ التایخ الکبیر للبخاری، ص ۲۸۴ ج ۳ قسم ۱ ترجمہ نمبر ۹۲۲،

۲۔ کتاب الغنۃ والمتروکین، مع التایخ الصغیر ص ۲۹۶،

حدیث کی نظر میں ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں) اس کے علاوہ امام مالکؒ، امام ابن عیینہؒ، در اور دیؒ، معنؒ، امام ابن سعدؒ، ساجیؒ، حاکمؒ، ابونعیمؒ اور جوزجانیؒ سے بھی اُن پر سخت جرح منقول ہو، اور علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے: ”اجمعوا علی ضعفہ“ (ان کے ضعف پر اجماع ہے) چنانچہ ابن حجرؒ نے ان کے بارے میں فیصلہ یہی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیںؒ

کلبیؒ | ان کا پورا نام ابوالنضر محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبدالعزیٰ الکلبی (متوفی ۱۴۸ھ) ہے، یہ قبیلہ بنو کلب کی طرف منسوب ہیں، کوفہ کے باشندے تھے، اور تاریخ و انساب اور تفسیر میں مشہور ہیں، علماء اُن کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں، صرف امام ابن عدیؒ نے اتنا لکھا ہے کہ ”لہ غیر ما ذکر ت احادیث صالحة، وخاصة عن ابی صالح، و هو معروف بالتفسیر و لیس لاحد اطول من تفسیرہ، و حدث عنه ثقات من الناس و رضوه فی التفسیر و اما فی الحدیث فلد مناکیر“ (ان کی جو حدیثیں میں نے ذکر کی ہیں اُن کے سوا ان کی حدیثیں ٹھیک ہیں، خاص طور سے وہ احادیث جو ابوصالح سے مروی ہیں، وہ تفسیر میں مشہور ہیں، اور کسی کی تفسیر ان کی تفسیر سے زیادہ طویل نہیں ہے، اور ان سے بعض ثقہ لوگوں نے بھی حدیثیں لی ہیں اور تفسیر میں انھیں گوارا کیا ہے، البتہ حدیث میں اُن کی روایات منکر ہیں)، لیکن باقی تمام اہل علم نے اُن پر شدید جرح کی ہے،

ان پر سب سے سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے، معتمر بن سلیمانؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: ”کوفہ میں دو کذاب تھے، ان میں سے ایک کلبی ہیں، تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابوصالح سے مروی ہیں، لیکن ابوجناب کلبیؒ بیان کرتے ہیں

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴

کہ ابوصالح نے قسم کھا کر کہا ہو کہ میں نے کبھی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سُنائی، اور سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کبھی نے ایک مرتبہ خود اعتراض کیا کہ ”میں نے ابوصالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں ہم انھیں روایت نہ کرو“ حضرت سفیان ثوریؒ سے بعض احادیث کبھی کی سند سے مروی ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب سفیان ثوریؒ جیسا محدث کبھی سے روایت کرتا ہے تو وہ ثقہ ہی ہوں گے، لیکن اسکی حقیقت حضرت ابوحاتمؒ نے بیان فرمائی ہے کہ ”حضرت سفیان ثوریؒ کا مقصد ان سے روایت لینا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے بعض اوقات اہل تہذیب کے لئے کبھی کی روایت مجلس میں سُنائیں، اس پر بعض حاضرین نے ان روایات کو سفیان ثوریؒ سے نقل کر دیا“ اور حضرت قرۃ بن خالدؒ کہتے ہیں کہ ”لوگوں کا خیال عام طور سے یہ تھا کہ کبھی جھوٹ بولتے ہیں“

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے، حضرت ابو جہزؒ کہتے ہیں کہ ”میں نے اُس کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اُٹھ کر چلے گئے، حضرت علیؓ وہاں بیٹھے تھے تو جبرئیل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علیؓ پر نازل کر دی“ ابو جہزؒ کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریعؒ کے سامنے نقل کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ”میں نے کبھی سے یہ بات تو نہیں سُنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں، یہی قول حافظ ذہبیؒ نے ہمامؒ سے بھی نقل کیا ہے کہ ”میں نے اسے کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں سبائی ہوں“ اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں ”کبھی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا

۱۔ یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب نقل کئے جا رہی ہیں، البتہ حافظ ذہبیؒ نے خود سفیان ثوریؒ سے نقل کیا ہو کہ انھوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا ”کبھی سے پھر“ ان سے پوچھا گیا کہ ”آپ تو اس روایت کرتے ہیں؟“ اس پر انھوں نے فرمایا ”میں اس کے جھوٹ پر کو پہچانتا ہوں“ (میزان الاعتدال ص ۵۵۳)

۲۔ تہذیب التہذیب ص ۸۷، ات ۱۸۱،

جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی وفات نہیں ہوئی، وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی یہ لوگ جب کوئی بادل دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: ”ایمر المؤمنین اس میں ہیں“

خلاصہ یہ کہ کبھی قرونِ اولیٰ کے مفسرین میں ضعیف ترین مفسر ہیں، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ: کیا کبھی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ”نہیں“ حافظ ذہبیؒ نے ان کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج بہ؟“ (کتابوں میں اُن کا ذکر ہی درست نہیں، تو ان سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے)

آخر میں تفتنِ طبع کے لئے ان کا ایک لطیفہ پیش خدمت ہو، وہ خود کہتے کہ میں نے یادداشت کا مظاہرہ بھی ایسا کیا ہے کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، اور بھول کا مظاہرہ بھی ایسا کیا کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، یادداشت کا واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے پورا قرآن چھ یا سات دن میں یاد کر لیا تھا، اور بھول کا عالم یہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنا خط بنانے کے لئے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑا، چاہتا یہ تھا کہ مٹھی سے نیچے کے بالوں کو کاٹ دوں، لیکن بھول کر مٹھی کے اوپر سے پوری ڈاڑھی کاٹ ڈالی تھے

یوں تو تفسیر کی کتابوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں، لیکن جن

۱۵ میزان الاعتدال ص ۵۵۸ ج ۳ ، ۱۶ ایضاً صفحہ ۵۵۹ ج ۳ ،

۱۷ الاذنی بالوفیات للصفدی ص ۸۳ ج ۳ مطبعہ ہاشمیہ دمشق ۱۹۵۲ء و میزان الاعتدال ص ۵۵۶ ج ۳ ، لیکن خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ اُن کے بجائے اُن کے بیٹے ہشام ابن الکلبی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے،

(تاریخ بغداد ص ۴۶ ج ۱۲ ترجمہ ہشام ابن الکلبی)

حضرات کا تذکرہ اس باب میں آگیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کے حوالے تفسیر میں انتہائی کثرت سے آئے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ بعد کی تمام تفاسیر کا بنیادی مأخذ یہی حضرات ہیں، اور بیشتر تفاسیر انہی کی روایات اور اقوال کے گرد گھومتی ہیں اس لئے ان حضرات کے احوال معلوم ہونے سے انشاء اللہ ان تمام تفاسیر کے مطالعے میں بصیرت پیدا ہوگی جنہوں نے تفسیر بالروایت کا طریقہ اختیار کیا ہے، مثلاً:-

تفسیر ابن جریر، تفسیر الدر المنثور اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ، یا جن میں سند کے بغیر قدیم ائمہ تفسیر کے اقوال بیان ہوتے ہیں، جیسے روح المعانی، تفسیر بقرطبی اور متاخرین کی دوسری تفاسیر،

متاخرین کی چند تفسیریں

جیسا کہ اس باب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، ہم نے اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل تاریخ بیان کرنے کے بجائے صرف قرونِ اولیٰ کے بعض اُن مفسرین کے تعارف پر اکتفاء کیا ہے جن کی روایات اور اقوال پر پورے علم تفسیر کی بنیاد ہے، بعد میں فترانِ کریم کی جو تفسیریں لکھی گئیں، اور علماء امت نے جس جس پہلو سے قرآن کریم کی خدمت کی وہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، جو مستقل تصنیف چاہتا ہے، یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ تفسیرِ فتران کا حق ادا ہو چکا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ شیعہ رسالت کے پر دانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی خدمت میں صرف محنت و عرق ریزی ہی سے نہیں، جنونِ عشق سے کام لیا ہے، چنانچہ یہ دعویٰ بلا خوفِ تردید کیا جاسکتا ہے، کہ دنیا میں نہ کسی کتاب کی اتنی شرحیں لکھی گئی ہیں نہ اُس کے اتنے ترجمے ہوئے ہیں، اور نہ اس کی مختلف پہلوؤں سے اس قدر خدمت کی گئی ہے، حالانکہ اس مقصد کے لئے کسی بھی دور میں کوئی عالمی تنظیم قائم نہیں رہی،

بہر کیف! آج ان تمام خدمات کی روشنی میں فترانِ کریم سے استفادہ بہت

بہت آسان ہو، اور جو شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے پورے کتب خانے موجود ہیں، اگر صرف اُن تفسیروں کا تعارف کرایا جائے جو آجکل دستیاب ہیں تب بھی اس کے لئے ایک مستقل تالیف چاہئے، لیکن یہاں میں صرف اُن چند تفسیر کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کا احقر پر ذاتی طور سے بڑا ناقابل فراموش احسان ہے، اور جو احقر کو سلف کے تفسیری علوم کا خلاصہ محسوس ہوتی ہیں، اور جب کبھی کسی آیت کی تفسیر میں کوئی الجھن پیش آتی ہے احقر نے سب سے پہلے اپنی ہی طرف رجوع کیا ہے، اور جن کے بارے میں میرا ناچیز خیال یہ ہو کہ ہم جیسے لوگوں کے لئے جو ضخیم تفسیر کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کر پاتے یہ کتابیں بڑی حد تک دوسری کتب کی کمی پوری کر دیتی ہیں،

(۱) تفسیر ابن کثیر | ان میں سرفہرست تفسیر ابن کثیر ہے، یہ حافظ عباد الدین ابوالفداء اسماعیل بن الخطیب ابنی حفص عمر بن کثیر الشافعی (متوفی ۷۴۴ھ) کی تصنیف ہے، اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کو تفسیر ابن جریر کا خلاصہ کہنا چاہئے، حافظ ابن کثیر نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ تفسیر بالروایۃ کا طریقہ ہے، یعنی ہر آیت کے تحت وہ پہلے اس کی تفسیر کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں، پھر اس کے مختلف کلمات یا جملوں کی تفسیر میں انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؓ کی جتنی روایات ملتی ہیں وہ ذکر فرماتے ہیں، لیکن ان سے پہلے کے جن مفسرین نے تفسیر بالروایۃ کا طریقہ اختیار فرمایا ہے، مثلاً حافظ ابن جریر ابن مردودیؒ، اور ابن ماجہؒ وغیرہ، انھوں نے تفسیری روایات کو صرف جمع کرنے کا کام کیا ہے، اُن کی چھان پھٹک نہیں کی، لیکن حافظ ابن کثیرؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل القدر محدث بھی ہیں، اور روایات پر جرح و تنقید کے فن سے واقف ہیں، چنانچہ انھوں نے اول تو اُن ضعیف اور موضوع روایات کو بکثرت چھانٹ دیا ہے جو متقدمین کی کتابوں میں لکھی چلی آرہی تھیں، دوسرے جو کمزور روایات وہ لائے ہیں عموماً اُن کی علل اسناد پر بھی تنبیہ فرمادی ہے، (مثلاً ملاحظہ ہو

ص ۷۷، ص ۲۱۳ ج ۱، ص ۷۱ تا ۲۱۳ ج ۲، ص ۸۹ و ۲۳ ج ۳، ص ۵۰۸ و ۵۱۹ و ۵۲۰ ج ۴، ص ۴۲
تفسیر بالروایۃ کی کتابیں اکثر و بیشتر اسرائیلیات سے لبریز ہیں، لیکن ایسی روایات
کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کا طرز عمل انتہائی محتاط، صاف ستھرا اور خاص قرآن
سنت پر مبنی ہے، جس کی تفصیل خود انہی کے الفاظ میں ”اسرائیلیات“ کے عنوان کے
تحت آچکی ہے، چنانچہ انھوں نے اول تو اپنی کتاب میں اسرائیلی روایات زیادہ نقل
نہیں کیں، اور جہاں نقل کی ہیں وہاں عموماً یہ بتا دیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں،
مثلاً سورۃ صافات میں انھوں نے بعض ایسے آثار نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہو
کہ ذبیح حضرت اسحق علیہ السلام تھے، اور اس کے بعد لکھا ہو کہ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہو“
لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبار سے ماخوذ ہیں، ان روایات میں ہر طرح
کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی
بھی ضرورت نہیں ہے“ (ص ۷۱ ج ۴)

بہر کیف، روایتی لحاظ سے تفسیر ابن کثیرؒ سب سے محتاط اور مستند تفسیر ہے، لیکن
اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس تفسیر میں درج ہر روایت درست ہے، بلکہ
بعض مقامات پر حافظ ابن کثیرؒ بھی ضعیف روایات کو کسی تنبیہ کے بغیر نقل کر گئے
ہیں، مثلاً سورۃ توبہ کی آیت **وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللَّهَ اَلْاِمْ نَہٗ لَا یُحَرِّکُوْا** کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت
ثعلبہؓ کی جو روایت انھوں نے نقل کی ہے (ص ۴۲ ج ۲)، وہ محدثین کے نزدیک
ضعیف ہے،

اس کے علاوہ جن مفسرین کے بارے میں ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ وہ ضعیف
تھے، مثلاً مقاتل، بکلی اور عطیۃ العوفی وغیرہ، اُن کے اقوال بھی انھوں نے بکثرت ذکر
کئے ہیں، لیکن عموماً ان کے وہی اقوال بغیر تنقید کے لئے ہیں جو کسی دلیل شرعی کے خلاف
نہیں ہیں، لہذا ان کی حیثیت مستند روایت کی نہیں بلکہ مفسرین کے اپنی اقوال کی ہوتی
دوسری کتاب امام رازیؒ کی تفسیر کبیر ہے، اس کا اصل نام
”مفاتیح الغیب“ ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے زیادہ مشہور ہو

۲ تفسیر کبیر

یہ امام فخر الدین محمد ابن ضیاء الدین عمر الرازی (متوفی ۷۲۸ھ) کی تصنیف ہے، جس طرح روایات کے اعتبار سے تفسیر ابن کثیرؒ نہایت جامع اور بے نظیر تفسیر ہے، اسی طرح علومِ درایت کے لحاظ سے تفسیر کبیر کا کوئی جواب نہیں، بعض لوگوں نے اس کتاب پر یہ فقرہ چسٹ کیا ہے کہ: "فیہ کل شیء الا التفسیر" اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ اس کتاب پر بڑا زبردست ظلم ہے، اس لئے کہ حلِ قرآن کے لئے اس تفسیر کا کوئی جواب نہیں ہے، اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:-

(۱) ہر آیت کی تفسیر، ترکیبِ نحوی اور شانِ نزول سے متعلق سلف کے جتنے اقوال ہوتے ہیں، امام رازی اُن کو نہایت مرتب اور منضبط انداز میں پوری شرح و وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جس سے آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کتنے اقوال ہیں، اور کیا کیا؟ دوسری تفسیروں میں یہ مباحث عموماً منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جن سے خلاصہ نکالنے میں وقت لگتا ہے، لیکن تفسیر کبیر میں یہ سب باتیں یک جا اور منضبط طریقے سے مل جاتی ہیں،

(۲) قرآن کریم کے اندازِ بیان کی شوکت و عظمت کو پوری تفصیل سے بیان فرماتے ہیں،

(۳) آیت سے متعلق جو فقہی احکام ہوتے ہیں انہیں تفصیلی دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں،

(۴) آیت میں جن باطل فرقوں اور عقل پرستوں نے کوئی تحریف کی ہوتی ہے اسے بتمامِ دیکمال ذکر کر کے اس کی مدلل اور مفصل تردید کرتے ہیں، اس طرح اس میں جہمیہ، معتزلہ، مجتہد، اباحیہ اور ان کے زمانہ کے تمام باطل فرقوں کی تردید موجود ہے،

۱۵ الاتقان ص ۲ و تحجیب المسلمین بکلام رب العالمین،

لیکن ہماری ناچیز رائے میں اگر یہ فقرہ کسی کتاب پر راست آسکتا ہے تو وہ ہمارے ددہ کی تفسیر الجواب للطنطاویؒ ہے،

(۵) تفسیر کبیر کی ایک خصوصیت، جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہو اس کا بیان کیا ہوا ربط آیات ہے، واقعہ یہ ہے کہ آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت کی وجہ وہ بیان فرماتے ہیں وہ عموماً اتنی بے تکلف، نشین اور معقول ہوتی ہے، کہ اس پر دل نہ صرف مطمئن ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے قرآن کریم کی عظمت کا غیر معمولی تاثر پیدا ہوتا ہے،

(۶) قرآنی آیات اور اسلامی احکام کے اسرار و حکم پر بھی اُن کا کلام خوب ہوتا ہے،

خلاصہ یہ کہ تفسیر کبیر انتہائی جامع تفسیر ہے، اور احقر کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ حلِ قرآن کے سلسلہ میں جب بھی کوئی دشواری پیش آئی ہے، تفسیر کبیر نے اس معاملے میں غیر معمولی رہنمائی کی ہے، عموماً لوگ اس کا طولِ بیان دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، (حدیث یہ کہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر اس کے ۵۰ صفحات میں آئی ہے) لیکن یہ تطویل شروع میں زیادہ ہے، بعد میں اتنی نہیں رہی، اور اس سے استفادہ کیا جائے تو علم و معرفت کے گہر نایاب ہاتھ آتے ہیں، البتہ اس تفسیر کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں:-

(۱) امام رازیؒ نے یہ تفسیر سورۃ فتح تک لکھی تھی، کہ وفات ہو گئی، چنانچہ سورۃ فتح کے بعد ایک دوسرے عالم قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی (متوفی ۷۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین حسد بن محمد القموی (متوفی ۷۷۷ھ) نے مکمل فرمایا، لیکن کمال یہ ہے کہ امام رازیؒ کے اندازِ نگارش کو اس طرح برقرار رکھ لے کہ اگر کسی کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو تو وہ کبھی شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ امام رازیؒ کے سوا کسی اور کی تحریر ہے،

(۲) تفسیر کبیر کی روایات دوسری تفاسیر کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ ہیں،

(۳) معدودے چند مقامات پر امام رازیؒ نے جمہورِ مفسرین سے الگ راہ اختیار کی ہے، (مثلاً لم یکن ب ابراہیم الا ثلاث کذبات کی حدیث صحیح کو رد کر دیا ہے)

بہذا جہاں انھوں نے تفرّد اختیار کیا ہے وہاں عمل جمہوری کے مسلک پر ہونا چاہیے،
 (۳) **تفسیر الی السعور** | اس تفسیر کا پورا نام ”ارشاد لعقل سلیم الی مزایا القرآن الکریم“
 ہے، یہ قاضی ابوالسعور محمد بن محمد الحادی الجفی (متوفی ۱۵۹۴ھ)
 کی تصنیف ہے، اور بلاشبہ ان کی علمی گہرائی، دقت نظر اور تندرستی قرآنی کا شاہکار ہے،
 یہ کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، اور اس میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم کی بڑی دشین
 تفسیر کی گئی ہے، اس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم قرآن، تناسب
 آیات اور بلاغت کے بڑے نفیس نکات ملتے ہیں، جن سے قرآن کریم کی مراد سمجھنے میں بہت
 آسانی بھی ہو جاتی ہے، اور قرآن کریم کے معجزانہ انداز بیان کی عظمت بھی سمجھ میں آنے
 لگتی ہے،

(۴) **تفسیر القسری** | اس کا پورا نام ”الجامع لاحکام القرآن“ ہے، یہ اندلس کے
 مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن
 ابی بکر بن فرح القسری (متوفی ۱۰۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالکؒ کے
 مسلک کے پیرو تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی
 احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیات کی تشریح،
 مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب
 جمع کیا ہے، خاص طور پر روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کریم سے جو ہدایات ملتی ہیں
 ان کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے، اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت مفصل اور علوم قرآن
 کے اہم مباحث پر مشتمل ہے، یہ تفسیر بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے،
 (۵) **روح المعانی** | اس کا پورا نام ”روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع
 المثانی“ ہے، اور یہ بغداد کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی جفی
 رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۲ھ) کی تصنیف ہے، اور تین جلدوں پر مشتمل ہے، یہ چونکہ
 بالکل آخری دور کی تصنیف ہے، اس لئے انھوں نے کوشش کی ہے کہ سابقہ تفاسیر کے
 اہم مباحث اس میں جمع کر دیں، چنانچہ اس میں لغت، نحو، ادب، بلاغت، فقہ،

عقائد، کلام، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ فرماتی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایات حدیث کے معاملہ میں بھی علامہ آلوسیؒ دو سکر مفسرین کے مقابلہ میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کو سابقہ تفاسیر کا خلاصہ کہنا چاہیے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا،

یہ پانچ تفاسیر احقر کے ناچیز ذوق کے مطابق ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی پر اکتفاء کر لے تو انشاء اللہ مجموعی حیثیت سے اُسے دوسری تفاسیر سے بے نیاز کر دینگی، یہ احقر کی ذاتی رائے تھی، بعد میں اپنے مخدوم بزرگ حضرت مولانا سید محمد ریوسف بنوری صاحب مدظلہم العالی کے ایک مقالے سے اس کی تقریباً حرف بہ حرف تائید ہو گئی، فللہ الحمد موصوف اپنے گرانقدر مقالے ”یتمۃ البیان“ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”چونکہ عمر عزیز کم ہے، آفاتِ زمانہ زیادہ، اور ہمارے دَور میں ہمیتیں پست، اور عوام کمزور ہو گئے ہیں،..... اس لئے میں اپنے طالب علم بھائیوں کو چار ایسی تفاسیر کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اُن پر قناعت کرنا چاہے تو وہ انشاء اللہ کافی ہوں گی،

ایک تفسیر ابن کثیرؒ..... جس کے بارے میں ہمارے استاذِ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ”اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کر سکتی ہو تو وہ تفسیر ابن کثیرؒ ہے جو تفسیر ابن جریرؒ سے بے نیاز کر دیتی ہو“ دوسری تفسیر کبیر امام رازیؒ جس کے بارے میں ہمارے استاذ فرماتے تھے کہ ”قرآنِ کیم کے مشکلات میں مجھے کوئی مشکل ایسی نہیں ملی جس سے امام رازیؒ نے تعرض نہ کیا ہو، یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات مشکلات کا حل ایسا پیش نہیں کر سچے جس پر دل مطمئن ہو جائیں، اور اس کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ فیہ کلّ شئی آلاء التفسیر، تو یہ خواہ مخواہ اس کی جلالتِ قدر کو کم کر کے دکھانا ہے، اور شاید کیسی ایسے شخص کا ذیل ہے جس پر روایات کا غلبہ تھا، اور قرآنِ کریم کے لطائف و علو

کی طرف توجہ نہ تھی، تیسری تفسیر روح المعانی جو میرے نزدیک قرآن کریم کی ایسی تفسیر ہے جیسے صحیح بخاریؒ کی شرح فتح الباری، الآیہ کہ فتح الباری ایک کلام مخلوق کی شرح ہے، اس لئے اس نے شرح بخاریؒ کا جو ترجمہ اُمت پر تھا اُسے چکا دیا ہے، اور اللہ کا کلام اس سے بلند و برتر ہے، کہ کوئی بشر اس کا حق ادا کر سکے، چوتھی تفسیر ابی السعود ہے، جس میں نظم و تراخی کو بہترین عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے، اور وہ بسا اوقات زعمشہری کی کشفات سے بے نیاز کر دیتی ہے ۱۱

اس عبارت میں تفسیر شرطیؒ کو چھوڑ کر انہی چار کتابوں کا تذکرہ انہی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے، جو ناچیز کی سمجھ میں آئی تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے تلمیذ رشید حضرت بنوری مدظلہم کے ساتھ اس توافق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں

یہ بحث تو عربی تفاسیر کے بارے میں تھی، اردو زبان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ”بیان القرآن“ اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر تفسیر ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان تفسیر کی ضخیم کتابیں کھنگالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے، البتہ اس کی زبان چونکہ علمی اور اصطلاحی انداز کی ہے، اس لئے عام اردو دان حضرات کو اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے ”معارف القرآن“ کے نام سے آٹھ جلدوں میں مفصل تفسیر تحریر فرمائی ہے، جس میں بیان القرآن کی شرح اور تسہیل بھی ہے، اور عصر حاضر کی ضروریات زندگی پر قرآن کریم کی ہدایات کی بہترین وضاحت بھی، اور تہذیب جدید کے مسائل پر قرآنی فکر کے تحت بھرپور تبصرہ بھی، اب تک اردو زبان میں جتنی تفاسیر منظر عام پر آئی ہیں ان میں یہ ایک منفرد تفسیر ہے جس میں سلف صالحین کے مسلک و مشرک پروری حفا

کے ساتھ عصرِ حاضر کی ضروریات کو بطریقِ احسن پورا کیا گیا ہے، بجز اللہ یہ تفسیرِ عوام و خواص میں سیدِ مقبول ہو رہی ہے، اور اس سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے،
آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنِ کریم کی رفعت و عظمت پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے، اس کی صحیح فہم کی دولت سے نوازے، اور اس کی تلاوت، اس پر عمل اور اس کی نشر و اشاعت کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین،

اَللّٰهُمَّ اِنِّسْ وَ مُحَسِّنِيْ فِيْ قَبْرِىْ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ يَا اَكْبَرُ الْعَظِيْمِ
وَ اجْعَلْ لِيْ اِمَامًا وَّ ثَوْرًا وَّ هُدًى وَ رَحْمَةً، اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِيْ
مِنْهُ مَا يَنْفَعُنِيْ وَ ذَكِّرْنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيتُ
وَ اَرْزُقْنِيْ تِلْكَ وَ تِلْكَ اِنَاءَ الدَّلِيْلِ وَ
اِنَاءَ التَّهَارِ وَ اجْعَلْهُ لِيْ
حُجَّةً يَّارَبَّ الْعَالَمِيْنَ،

وَللهُ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا، وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا
مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِهِ وَ اَصْحَابِهِ وَ اَزْوَاجِهِ وَ اتْبَاعِهِ اَجْمَعِيْنَ؛

لحق
محمّد تقی عثمانی

دارالعلوم کورنگی
کراچی نمبر ۱۲

لیلۃ الجمعۃ ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۹۶ھ

اصلاح معاشرہ

انرجسٹرس محمد تقی عثمانی

اصلاح معاشرہ سے متعلق اہم مضامین
کا مفید مجموعہ

جسمیں معاشرہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے
متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں اصلاح کے موثر طریقے
تجویز کئے گئے ہیں۔

حقوق نسواں، بے پردگی، تبلیغ بذریعہ فلم
اور ان جیسے دیگر موضوعات پر کئے جانے والے شبہات
کے دلنشین اور موثر جوابات بھی شامل کتاب ہیں۔

ہر لائبریری کی زینت
آج ہی خریدیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم کراچی

فرد کی اصلاح

تالیف: جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ

فرد کی اصلاح و تربیت کے بغیر اچھے معاشرہ کا تصور ناممکن ہے، یہ کتاب اسی موضوع پر آپ کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے چند عنوانات درج ذیل ہیں :-

- اسلامی زندگی گزارنے کے اصول ● قرآن حکیم اور ہماری زندگی ● مسلمان اور ایذا رسانی ● دعوت دین کی ضرورت ● ہزار و ستر کا تصور ● اپنے گھروں کو بچائیے ● بے دینی کے سیلاب میں ہم کیا کریں ؟ ● مایوسی کیوں ؟

نیز اس کے علاوہ :

نماز، روزہ، فطران اور دیگر عبادات سے متعلق نکلائیں مضامین کا ایسا مجموعہ جو ہر گھر میں رکھنے اور بار بار مطالعہ کئے جانے کے قابل ہے۔

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی

اسلام اور جدت پسندی

مولانا محمد تقی عثمانی کے ہمارے قلم سے

- اپنے موضوع پر کم از کم اُر د میں اچھوتی کتاب،
- جدت پسندی کا مفہوم اور اس کی حدود۔
- اسلام اور صنعتی انقلاب۔
- اسلام اور تسخیر کائنات۔
- علماء اور پائیت۔
- اجتہاد کا مطلب اور مفہوم
- تحقیق اور تحریف میں فرق جیسے مسائل پر حاصل مضامین کا
- نادر مجموعہ۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ دارالعلوم کراچی

ہمارا معاشی نظام

دور جدید کے نازک ترین مسائل پر اسلام کے
انقلابی اور ہمہ گیر احکام کا بھرپور خاکہ
ان: جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

● اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات

● علماء کا متفقہ معاشی خاکہ

● ہمارے معاشی مسائل اور اُن کا حل

● سوشلزم اور غریب عوام

● زرعی اصلاحات

● غیر سودی بینکاری

سود اور بینکنگ جیسے اہم عنوانات پر جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی
یڈلہم کے قلم سے نکلے ہوئے ”البلاغ“ کے اداریوں کا مجموعہ۔

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی